مومن خاں مومن کی غزل گوئی

(3166)

تحقیقی مقالہ

برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اُردو)

ایل۔این۔متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ

سنہ ۲۰۲۰ء

مقالہ نگار :

محمد حنظلہ

ریسرچ اسکالر

ایل۔این۔متھلا یونیورسیٹی

دربھنگہ (بہار)

نگراں :

ڈاکٹر برکت علی

سابق صدر، شعبۂ اُردو

ایم۔ایل۔ایس۔ایم۔کالج

دربھنگہ (بہار)

Momin Khan Momin Ki Ghazalgoi

Md. Hanzalah

Ph.D.Thesis

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

فہرست مضامین

پیش لفظ

حکیم مومن خان مومنؔ (۱۸۰۰ء-۱۸۵۲ء) کا شمار اردو غزل کے اساطین امراء اور شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ شاہ نصیر دہلوی (۱۷۵۶ء-۱۸۳۸ء) کے شاگرد، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (۱۷۹۰ء-۱۸۵۴ء) اور مرزا غالبؔ (۱۸۶۹ء-۱۷۹۷ء) کے ہم عصر، ایک اہل دل، آزاد مزاج، قانع، وطن پرست اور باذوق قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا خاندان اصلاً کشمیری تھا۔ مغلیہ سلطنت کے درباروں اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۸۲۳ء-۱۷۴۶ء) کے حلقہ ادارت سے وابستہ تھے۔ اس لئے ان کی شخصیت میں عاشقانہ جمال اور زاہدانہ جلال دونوں کا پرتو نظر آتا ہے۔ مومنؔ بچپن ہی سے ذہین طبع تھے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ عربی، فارسی، طب، نجوم، شطرنج اور موسیقی میں کمال رکھتے تھے اور قصیدہ، رباعی واسوخت، غزل، ترکیب بند اور مثنوی وغیرہ اصناف میں شاعری کرتے تھے۔ البتہ غزل گوئی ان کا طرۂ امتیاز تھا جو ان کو دیگر ہم عصروں سے منفرد و یگانہ بناتا ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن وعشق کا ایک نگار خانہ آباد ہے۔ جس میں روایت و مفروضات کم اور ذاتی تجربات زیادہ ہیں۔ انہوں نے غزل میں حسن نگاری کو فحش، ابتذال اور ہوسناکی سے نکال کر صحت مند حدود، سماجی اقدار اور تہذیبی معیار سے آشنا کرایا۔ ان کی اکثر غزلیں ابہام والجھاؤ سے پاک ہیں۔ لیکن فلسفیانہ ساخت، معنیٰ خیزی، پیچیدگی حسن، جدت ادا اور ندرت خیال سے بھی خالی نہیں ہیں۔ ان میں عاشق ومعشوق کے دلوں کی واردات اور عاشق ومعشوق کے دلوں کی باتیں نہایت بانکپن، لطافت اور سدابہار رنگینی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں جو سادگی و پرکاری اور سہل ممتنع کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ رنگ تغزل اور نازک خیالی میں تو وہ غالبؔ کو بھی پیچھے چھوڑے گئے ہیں۔ غالبؔ مندرجہ ذیل مومنؔ کے شعر۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کو تیار تھے۔

بلاشبہ مومنؔ کی شاعرانہ عظمت اور معنویت ہر دور کے لئے مسلم ہے اور ان کی شاعری اپنے معجز بیان و اسلوب، اندازفکر اور نئے نئے فنی و جمالیاتی تجربات اور خصوصیات کی وجہ سے آج تک ہر نسل کے محققین و ناقدین کی توجہات کا مرکز بنی ہوی ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا مختلف زاویہ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے۔ مومنؔ نے نئی غزل کی جو شمع فروزاں کی تھی اس سے نئی نسل کے شعور فکر وفن کو منور کیا جائے اور غزل کی اس پاکیزہ روایت کو آگے بڑھایا جائے۔ میں مومنؔ کی شاعری خصوصاً غزل گوئی سے شروع سے ہی متاثر رہا ہوں اور مختلف مراحل تعلیم میں مطالعۂ مومنؔ میری خصوصی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں 'مومنؔ کی غزل گوئی' اپنی اعلیٰ تحقیق کا موضوع بناؤں اور مقام شکر ومسرت ہے کہ میری کوشش رنگ لائی اور مخلص اساتذہ کرام کی نوازش سے میری پی ایچ۔ڈی کے مقالہ کا عنوان ''مومن خان مومنؔ کی غزل گوئی'' .D.R.C میں پاس ہو گیا۔

یہ مقالہ پیش لفظ اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں کلاسیکی غزل گوئی کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم میں مومنؔ کی غزلوں کی عصری معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب سوم میں مومنؔ کی غزلوں میں تشبیہ، استعارے، نجوم، شطرنج، ریاضیات کے اصول اور علم موسیقی کی ترجمانی کو درشایا گیا ہے۔ باب چہارم میں مومنؔ کی مثنویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور باب پنجم میں مومنؔ کی غزلوں کا محاکمہ میں پوری تحقیق کا خلاصہ اور لب ولباب پیش کیا گیا ہے۔ اخیر میں کتابیات کے ذیل میں مراجع ومصادر کا انڈیکس درج کیا گیا ہے۔

مقالہ کی تیاری میں اس بات کا از حد خیال رکھا گیا ہے کہ مطالعہ غیر جانبدارارانہ اور اسلوب معروضی ہو۔ حتیٰ الامکان ماخذ سے استفادہ کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل کی عدم موجودگی میں ثانوی مراجع پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اسی طرح حواشی عام طور پر ایسے مقامات پر لگائے گئے ہیں۔ جہاں پر کسی طرح کے احتمال کا شک وشبہ یا امکان تھا۔

اخیر میں اللہ رب العزت کے شکر وسپاس کے بعد مادر علمی ہندوستان کی معروف دانشگاہ للت نارائن متھلا یونیورسیٹی، خصوصاً شعبۂ اُردو کا حد درجہ مشکور ہوں کہ اس کے علمی ماحول میں مجھے اکتساب فیض کا موقع ملا، اس نے پی ایچ۔ڈی کے لئے اس اہم ترین موضوع پر مقالہ لکھنے کی منظوری عنایت کی اور میں اپنے پسندیدہ موضوع پر مقالہ لکھنے کی سعادت حاصل کر سکا۔ اسی طرح میں سنٹرل لائبریری متھلا یونیورسیٹی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ،

زاہدہ میموریل لائبریری، کرہٹیا، دربھنگہ بہار کے ذمہ داران کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنے گراں قدر علمی ذخیرے سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے نگراں جناب ڈاکٹر پروفیسر برکت علی صاحب، سابق استاذ شعبہ اردو، ایم۔ایل۔ایس۔ایم۔کالج، دربھنگہ (بہار) کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے مجھے اپنی نگرانی میں کام کرنے کا شرف بخشا۔ خاکہ (Synopsis) کی تیاری سے لے کر مقالہ کے آخری مرحلہ تک علمی وفنی رہنمائی کی، مصادر ومراجع کی نشاندہی فرمائی اور ہر طرح کی رہنمائی کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھا اور پورے تحقیقی عمل کے دوران بڑی فکرمندی اور بے پایاں خلوص کا مظاہرہ فرمایا۔ اسی طرح میں اپنے تمام مخلص اساتذہ کرام خصوصاً صدر شعبہ اردو جناب پروفیسر آفتاب اشرف صاحب کا بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی قیمتی آراء سے نوازا اور بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر میری معاونت کی۔

اسی طرح اس موقع پر اگر میں والد بزرگوار جناب محمد ادریس صاحب کی عنایتوں، شفقتوں اور دعائے نیم شبی کے شکر وتذکار کے بعد اپنے برادر مکرم وعلمی وفکری سرپرست ڈاکٹر محمد شیث ادریس تیمی صاحب کا حد درجہ شکریہ ادا نہ کروں جن کی قربانیوں، شبانہ روز کوششوں اور مخلصانہ وہمدردانہ رہنمائیوں کی وجہ سے طویل علمی سفر بہ آسانی مکمل کر سکا اور نعمت قلم کی دولت سے بہرور ہوا۔

اس موقع پر مجھے وہ احباب وعزیزان گرامی بھی یاد آرہے ہیں جنہوں نے اس دوران مختلف انداز سے اپنا گراں قدر تعاون پیش کیا۔ ان میں برادران گرامی مولانا عبدالعلام مظاہری، حافظ محمد ابوشحمہ برادر عزیز انجینئر جنید عالم (چمن) اور احباب پروفیسر شاہد صاحب، پروفیسر ارشد صاحب وغیرہ سرفہرست ہیں۔

شکر وسپاس کا گلدستہ اس وقت تک بے رنگ و بو رہے گا جب تک اپنی رفیقہ حیات عشرت فاطمہ (انجم) اور بیٹے عرباض سلمہ، کا تذکرہ نہ کروں، اس لئے کہ ان کی محبت ایثار، قربانی اور اخلاقی تعاون کے بغیر میرے لئے یہ کاوش پیش کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء

محمد حنظلہ

باب اوّل

کلاسیکی غزل گوئی : خصوصی مطالعہ

Special Features of Classical Ghazals

کلاسیکی غزل گوئی : خصوصی مطالعہ

پیش نظر موضوع میں لفظ کلاسیکی وضاحت طلب معلوم ہوتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں Classique سے درسی جماعتوں کا تصور کام میں لایا جاتا ہے۔ لاطینی میں Classicus سے اعلیٰ طبقہ اور بلند مرتبے پر فائز افراد یا گروہ مراد لیا جاتا ہے۔ اسی زبان میں Classic کے معنیٰ ہجوم کے بھی ہیں۔ فرانسیسی نقاد سانٹ بیو نے اپنے مشہور مضمون ''کلاسیک کیا ہے؟'' میں اس کی یہ وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''عام طور پر ''کلاسیک'' کا لفظ اس قدیم مصنف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کی حد درجہ تعریف و توصیف ہو چکی ہو۔ جس کی جامعیت اور انفرادیت مسلم ہو۔ اور جس کی تعریف سے ہر کس و ناکس واقف ہو۔ کلاسیک ایک ایسے قدیم صنف کو کہا جاتا ہے جو اپنے مخصوص اسلوب میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔ اور اس کی حیثیت مستند اور مسلم ہو۔''

اُردو زبان میں یہ لفظ انگریزی لفظ Classic سے لیا گیا ہے جس میں ''ی'' کا لاحقہ لگا کر کلاسیکی بنایا گیا ہے۔ جو اردو میں بطور صفت استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے ''اصول اخلاقیات'' میں کیا گیا تھا۔ فیروز الغات میں اس کا معنیٰ قدیم، اعلیٰ درجہ کا، مستند، مسلم الثبوت، خصوصاً ادبیات سے متعلق بتایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کلاسیکی غزل گوئی سے مراد ایسی غزل ہے جو معیار اور اقدار کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہو اور متعلقہ ادب والے اس پر نازاں اور مفتخر ہوں تمام زبانوں میں کلاسیکی ادب کے بے شمار نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اردو کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو کلاسیکی غزل گوئی سے مراد وہ غزلیں ہیں

جو قدیم اساتذۂ سخن کے ذریعے وجود میں آئی ہیں جو قدیم الاستعمال الفاظ اور زبان میں لکھے گئے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں بلا تکلف امیر خسروؔ، قلی قطب شاہ، ولیؔ دکنی، ملا وجہیؔ، نظامیؔ، افضل پانی پتی، عبدالرحیم خانخاناں، کبیر برہان الدین جانم، ابن نشاطی، مظہر جان جاناں، سراج اورنگ آبادی، سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، میر دردؔ، میر حسنؔ، میر اثرؔ، نظیر اکبر آبادی، انشاء اللہ خاں انشاءؔ، راسخ عظیم آبادی، ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، آتشؔ، دیا شنکر نسیمؔ، اسمٰعیل میرٹھی، امیر مینائیؔ، محسن کاکویؔ، داغؔ دہلوی، شادؔ عظیم آبادی، اکبرالہ آبادی، نظم طباطبائی، شوقؔ نیموی، میر مستحسن خلیق، میر انیسؔ، سلامت علی دبیرؔ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان اساتذہ کرام نے صنف سخن کی جس قدر خدمات کی ہیں اور جو شاہکار تخلیقات ادب کو دئے ہیں وہ قابل قدر ہیں اور اردو ادب کے لئے گراں سرمایہ بھی تصور کئے جاتے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے ان اساتذۂ سخن کی غزلوں کا ایک جائزہ پیش کر دیا جائے جس سے کلاسیکی غزل گوئی کی ایک خصوصی تصویر ابھر کر سامنے آجائے۔ ان میں سب سے پہلے ہم امیر خسروؔ (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کی غزلوں کا جائزہ لیں گے۔ اس سلسلے میں سب سے ضروری وضاحت یہ ہے کہ امیر خسروؔ کو اردو غزل کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ امیر خسروؔ کے بڑے بھائی امیر حسنؔ دہلوی نے بھی امیر خسروؔ کے انداز میں غزلیں کہی ہیں۔ اس بات کا ذکر ڈاکٹر ممتاز الحق نے اپنی کتاب ''اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل'' میں کیا ہے۔ بہر کیف امیر خسروؔ نے تقریباً ڈھائی لاکھ اشعار کہے ہیں اور ان کی ننانوے تصانیف بھی بتائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے اشعار کی تعداد اور تصانیف کی تعداد سے قطع نظر ان کی غزلوں کے چند اشعار نموتاً ملاحظہ فرمائیں ۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نینا بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبان ہجراں دراز جوں زلف زمان وصلت چو عمر کو تہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکا یک از دل دو چشم جادو بعد فریبم برد تسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈالے کیس
چل خسرؔو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

ہر لحظ آید دلم دیکھوں اوسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آن صنم جیولائے کر
آن سیم تن گوید مرا در کوئے ما آئی چرا
ماہی صفت ترپھوں جو ٹک نہ دیکھوں جائے کر

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے واضح ہے کہ امیر خسرؔو کی غزل گوئی کلاسیکی غزلوں میں اپنا رنگ و رتبہ رکھتی ہے۔امیر خسرؔو کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''امیر خسرؔو جنھوں نے گیارہ بادشاہوں کی بادشاہی دیکھی ، فارسی کے ایسے باکمال شاعر تھے کہ خود اہلِ زبان ان کا لوہا مانتے تھے۔موسیقی کے ایسے استاد بے بدل کہ ان کی ایجادات و اختراعات آج علم موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔اُردو زبان وادب کے وہ شاعر اول جن کی مٹھاس آج بھی زبان میں شہد گھول رہی ہے۔امیر خسرؔو دو تہذیبوں کے امتزاج کے وہ گلِ نورس ہیں جو ابھرتی پھیلتی تہذیبوں کے ایسے ہی موڑ پر ظہور آتے ہیں اور خود تہذیب کی علامت بن جاتے ہیں۔امیر خسرؔو ''ہندو مسلم ثقافت'' کی وہ زندہ علامت ہیں کہ رہتی دنیا تک وہ اس تہذیب کے اوّلین نمائندہ کی حیثیت سے یادگار رہیں

گے۔انہوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے بلکہ آئندہ دور کے تہذیبی دھاروں کو بھی متاثر کیا۔ان کا اردو کلام ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ امر کہ بعد میں بہت سا کلام ان کے نام سے منسوب ہوگیا،خود اس بات کا اشارہ ہے کہ امیر خسرؔو ہمارے کلچر اور ہمارے طرزِ احساس کے ایسے نمائندہ ہیں جو تہذیبوں کے خون میں شامل ہوکر خود کلچر بن جاتے ہیں۔''

(تاریخ زبان وادب، مصنفہ جمیل جالبی، جلد اول، ص ۳۴)

امیر خسرؔو کی اردو غزل گوئی اپنے ابتدائی دور کے مطابق بہت ترقی یافتہ کہی جاتی ہے۔انہوں نے جس زبان کا استعمال کیا ہے۔وہ اس قدر صاف ہے کہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ امیر خسرؔو کی زبان ہے۔کیونکہ ایسی زبان دیگر شعراء اور ادیبوں کی اس دور میں قطعی نہ تھی امیر خسرؔو کی غزلوں کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں تقریباً تین سو سال تک غزل کے چند اِکادُکا نمونے ہی ملتے ہیں۔باقاعدہ اس طرز کی شاعری کہیں نہیں ملتی۔قائم چاند پوری نے اپنی کتاب ''مخزن نکات'' میں شیخ جمالی، بہرام سقہ بخاری اور ملانوری وغیرہ کا ایک ایک شعر نقل کیا ہے جو ریختہ کی شکل میں ہے۔اُردو اپنے ابتدائی دور میں غزل کے جو نمونے رکھتی ہے۔اس کے سلسلے میں محمود شیرانی نے بھی اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں بھی نشاندہی کی ہے اور چندر بھان برہمن، منشی ولی رام ولی، شیخ ناصر عالی سرہندی وغیرہ کا نام لیا ہے اور ان کی غزلوں سے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔جمیل جالبی نے بھی گجری اردو کے غزل گو شاعر میں اسحاق سرمست کا ذکر کیا ہے اور ان کی ایک غزل بطور نمونہ پیش کی ہے۔

اُردو کی نشو ونمائی کا سفر شمالی ہند سے دکن کی طرف ہوا ہے۔اس بات کا ذکر تمام محقق و ناقد نے کیا ہے۔سیاسی، سماجی اور مذہبی تمام اسباب سے قطع نظر اس خطۂ ارض میں تمام شعری اور نثری اصناف کی آبیاری واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔خصوصاً غزل گوئی میں بھی دکن کے شاعروں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔اس سلسلے میں بہاؤالدین باجن، فخر الدین نظامی، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، لطفی، برہان الدین جانم، عبدل، حسن شوقیؔ، صنعتی، مقیمی، محمد قلی قطب شاہ، ملاوجہی، غواصی، ابن نشاطی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

غزل کے ابتدائی دور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غزل کے ابتدائی دور میں اس کی نشو ونما اردو مثنویوں میں ہو رہی تھی۔ حالانکہ غزل کی پیدائش قصیدہ کے بطن سے ہوئی ہے۔ لیکن مثنویوں میں بھی اس کے عکس اور نقوش نشان زد کئے جا سکتے ہیں۔ جمیل جالبی نے مثنویوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک مکمل اقتباس سے اس بات کی طرف واضح روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''ایک اور خصوصیت جو ''فتح نامہ'' میں بھی نظر آتی ہے۔ میز بانی نامہ میں ایک انفرادیت بن کر ابھرتی ہے۔ یہ خصوصیت خیال واحساس کو لفظوں کی نئی جھنکار اور یکساں حروف والے الفاظ کی تکرار سے ابھارنے کا شعور وسلیقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''میز بانی نامہ'' میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جن میں مثنوی کی فضا بننے میں بڑی مدد ملتی ہے، مثلاً چھپا چھپ، لبالب، شباشب، نگاراں نگار، ہزاراں ہزار، قطاراں قطار، طبلے طبیلے، جھکجھکاٹ، لکاکاٹ، روارو دوادو، بٹ تٹ، کھٹ پٹ وغیرہ الفاظ سے ان رنگارنگ آوازوں کو ابھاڑتا ہے، یہی احساس موسیقی مثنوی کی فضا میں پھوار کی سی نرمی پیدا کر دیتا ہے۔ طبل کی آواز سنئے ع

طبل ڈھول جم جم کری دھمدھماٹ

رقاصاؤں کی تیزی اور سرعت رفتاری دیکھئے ع

بھمیریاں بھمیں یوں نہ پھر کیاں پھرنی

(یا)

الاپیں و ناچیں سو بیدنگ میں

سونا دنگ بردنگ بیدگ میں

نوجوان لڑکیوں کو دیکھئے :

سلونیاں سلکھن سگند باس کیاں

کنور کال کیاں بھنور چال کیاں

اگران اشعار کی شعریت کو، شاعرانہ تشبیہ اور حسن بیان کو، تخیل کی کرشمہ سازی کو قدیم زبان کی اجنبیت کے پردے ہٹا کر دیکھا جائے تو ایک حقیقی شاعر اپنی قادرالکلامی کے ساتھ شعر کے ساز چھیڑتا نظر آتا ہے۔ جو اپنے زبان و بیان اور اسلوب سے اس دور کو ایک نیا رنگ روپ دے رہا ہے یہی شعریت حسن شوقی کی غزلوں میں اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔''

(تاریخ ادب اُردو، مصنفہ جمیل جالبی، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۹۔۲۹۰)

کلاسیکی غزل گوئی میں اس طرح ایک اہم نام حسن شوقی (۱۵۴۰ء تا ۱۶۳۲ء) کا بھی ہے جس کی غزلیں غزل گوئی کی نشو ونما میں قابلِ قدر بھی ہیں اور اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ بھی ہیں۔ اس لئے حسن شوقی کی غزلوں کو نظر انداز کر کے کلاسیکی غزل کا جائزہ ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کا ایک حصہ ہیں جس کے فراز پر ولی دکنی کی غزل کھڑی ہے۔ یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ روپ کا حصہ ہیں۔ حسن شوقی کے ذہن میں غزل کا واضح تصور ہے۔ وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی باتیں کرنے کا ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ اس کی غزلوں کا بنیادی طور یہی ہے۔ وہ غزل میں جذبات عشق کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اور عشقیہ جذبات کے مختلف رنگوں اور کیفیات کو غزل کے مزاج میں گھلاتا ملاتا نظر آتا ہے۔ اس کی غزل خیال، اسلوب لہجے اور طرز ادا میں فارسی غزل کی

پیروی کرتی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، مصنفہ جمیل جالبی، جلد اوّل، ص ۲۹۰)

حسن شوقی ایک اچھے غزل گوشاعر ہیں۔ان کی غزلیں فارسی زبان کے شاعروں سے اثر قبول کرتی ہیں۔ان کی غزلوں میں اس بات کا اعتراف بھی ملتا ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

جب عاشقاں کی صف میں شوق غزل پڑے تو
کوئی خسروی بلالی کوئی انوری کتے ہیں
ہمارا حسن ہے شوقی معلّم ذہن کو تیرے
سبق کچھ عنصری کا یا درس کچھ انوری کا ہے

غزل کے ابتدائی دور میں زبان کی ناہمواری، الفاظ کی خامیوں کے باوجود حسن شوقی کی غزلیں ایک الگ شیرینی رکھتی ہیں۔موصوف کی غزلوں کے اشعار میں زبان و بیان، اسلوب و بیان، فکروتصور کے حسین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔قدیم زبان اور متروک الفاظ کے باوجود جوان کی غزلیں بے کیف و بے اثر نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ فکری اعتبار ے ان کی غزلوں میں ''سجم'' کا احساس وصال کی خوشبو، محبوب کی ادائیں، حسن و جمال، دلربائیاں، آنکھوں کا تیکھاپن، خدوخال کا بانکپن، موتی سے دانت، کلیوں سے ہونٹ غرض حسن سے متعلق تمام افکاروتصورات ان کی غزلوں میں موجود ہیں۔جن کے لئے نمونتاً اشعار نقل کئے جاسکتے ہیں صرف تین اشعار اور ملاحظہ فرمائیں ۔

جوبن سوں قدسہادے لٹکے جو دھن اگن میں
دو پھول پریاں سوں ڈالتی دستی ہے چیو چمن میں
جب دھن انکن کھڑی ہے تن ابرہن پری ہے
تخت حسن کا جڑی ہے دل مل رہبارین میں
خوش مانگ اا سنوارے موتی دسیں ہوتارے
جیون چاند سوں ستارے اوگے ہیں سیام گھن میں

حسن شوقی نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اردو ادب میں گراں مایہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ جسے کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دوسری اصناف کی طرح ان کی غزلیں بھی اپنی پہچان رکھتی ہیں۔فکری اور فنی اعتبار سے ان کی غزلیں قابلِ قدر ہیں اور قابلِ توجہ بھی ہیں ان کی غزل گوئی کے سلسلے میں مشہور ناقد پروفیسر وہاب اشرفی یوں رقم طراز ہیں :

''اس (حسن شوقی) کی غزلوں میں ایک طرح کی شیرینی ہے۔اور یہ شیرینی ہی اس کلام پر حاوی نظر آتی ہے۔ حالانکہ غزلوں میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔وہ آج کے معیار کے لحاظ سے دوراز کار معلوم ہوں گے۔لیکن پھر بھی اثرات میں کمی نہیں، یہ اس کے بیان کا جادو ہے۔اس کی غزلیں عشق مجازی کی کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ان میں تصور وصال اپنی تمام ترکیفیت کے ساتھ موجود ہے۔اس کی غزلوں میں واضح طور پر محبوب عورت ہے اور عاشق مرد یہی روایت غزل میں پروان چڑھتی رہتی ہے۔''

(تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل، مصنفہ وہاب اشرفی، ص ۱۰۰)

حسن شوقی کلاسیکی غزل گوئی میں غزل گوئی کے فن کو فروغ دینے والوں میں اہم تصور کئے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے اردو غزل کو جو رنگ و مزاج عطا کیا ہے وہی رنگ آج کی غزلوں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔مجازی عشق کا تصور دور حاضر میں بھی پھل پھول رہا ہے۔ان کی غزلیں عشق حقیقی کے رنگ میں یا تصوفانہ رنگ میں نہیں نظر آتی ہیں۔اس سلسلے میں تبسم کاشمیری کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''شوقی نے غزل کا جو پیکر بنایا اس میں ابتداء ہی سے فارسی غزل کی دیو مالا کا وجود نظر آنے لگتا ہے۔لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، عشق بازی، زلف، رخسار، قامت، ناز و ادا، شمع، شراب، پیالہ، مومن، کافر، زاہد، ناصح اور زنجیر وغیرہ کو تلازمات اور تصورات اس کی غزل میں مسلسل ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے

یہاں غزل کا مذہب عشق بھی ہے۔ مذہب عشق کی رسمیں روایات اور قواعد اس کی غزل میں موجود ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو: تبسم کاشمیری ص ۱۳)

حسن شوقی کے دور میں ایک اہم شاعر قلی قطب شاہ (۱۵۶۶ء۔ ۱۶۱۲ء) بھی نظر آتا ہے۔ اس نے بھی شاعری کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قلی قطب شاہ نے غزل کی زلفیں بھی سنواری ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز الحق کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''غرض محمد قلی قطب شاہ نے غزل کے موضوعات کے لحاظ سے وسعت بخشی اور ساتھ ہی اِسے ایک نیا رنگ و آہنگ بھی عطا کیا۔ اس کی غزلوں میں فکر کی کمی ضرور ہے مگر اس میں جو شگفتگی شیرینی اور رعنائی ہے۔ وہ اردو غزل کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اس نے ابتدا ہی میں اردو غزل پر وہ اعتراضات نہ ہوتے جو بعد کے دور میں اس پر کیئے گئے۔ اس کی نظم نما غزلوں کو ہم ایک موڈ کے تحت لکھی گئی مسلسل غزلوں کا اچھا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔''

(اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل : ڈاکٹر ممتاز الحق ص ۹۳)

محمد قلی قطب شاہ غزل گوئی کی روایت یا کلاسیکی غزل میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں خاص ہندوستانی رنگ میں رنگی نظر آتی ہیں۔ ان کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بسنت کھیلیں عشق کا آپیا را
تمہیں ہے چاند، میں ہوں جو ستارا

منجھل کندن کے تاراں انک چھوتا
بندی ہوں چھند بند سوں کر سنگارا

پیا پک پر ملا کر لیائی پیاری
بنست کھیلی ہوا انگ انگ سنگارا

بھیگی چولی میں بھٹنیں نس نشانی
عجب سورج میں ہے کیوں نس کوں ٹھارا

بسنت دنت جھد سو کندن گال اوپر
بھولا یا آگ کیسر کی بہارا

قلی قطب شاہ ایک بڑا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اولوالعزم بادشاہ بھی تھا۔ اس نے حکومت صرف تینتس (۳۳) برس کی، اس نے گولکنڈہ کو جدید شہر میں تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ اس نے اس شہر میں عمارات، دولت خانہ، شاہی دروازہ عالی، دارالشفا اور باغات، کارخانے، مسافرخانے، اسلحہ خانہ، مسجد جامع، عاشورہ خانہ، سب تعمیر کروائے۔ ادب کے تعلق سے بھی اس کی خدمات گراں قدر ہیں۔ اس کے دربار میں علماء وفضلاء شعراء و مصنفین کی ایک بڑی تعداد کا اجمع تھا۔ وہ صرف شاعری ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ علمی خدمات میں دوسروں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی تخلیقات کے علاوہ فارسی اور دکھنی زبان میں متعدد کتابیں لکھوائیں۔ موصوف کے سلسلے میں مشہور ناقد و محقق پروفیسر وہاب اشرفی کے چند جملے بے ترتیب ملاحظہ فرمائیں :

> ''قلی قطب شاہ نے بڑی تہدار شخصیت پائی تھی۔ اس لئے اس کا کلام بے حد رنگارنگ اور متنوع ہے۔ اس نے مختلف اور کثیر عنوانات پر شعر کہے ہیں۔ اس لئے اس کے کلام کا سب سے بڑا وصف، خیالات کی وسعت ہے۔ جہاں اس نے غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیے لکھے وہیں کتنی ہی مذہبی نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی تعداد کافی ہے اور ایسی نظمیں بھی مضامین کے اعتبار سے بہت بلند

ہیں۔

قلی قطب شاہ کی نظمیں اور غزلیں اپنے مزاج اور تیور کے اعتبار سے خالص ہندوستانی ہیں۔ ان میں ایرانی عنصر خال خال ہے۔ اس نے ہندو اور مسلمانوں کے تہوار.........عید، سالگرہ، شادی، بیاہ، ملک کے مروجہ رسم و رواج، شاہی محل کی زندگی حتیٰ کہ پھولوں، پھلوں اور ترکاریوں پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اس لحاظ سے سوداؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی دراصل قلی قطب شاہ کی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کا مکمل کلیات مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد ولیؔ دکنی کے بارے میں رائے بدلنی پڑتی ہے اور بابائے ریختہ کا لقب قلی قطب شاہ کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کلام ولیؔ سے زیادہ رنگارنگ اور دلچسپ ہے۔ پھر اس کی غزلوں کی تعداد بھی ولیؔ کی غزلوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے کلام میں جدید طرز شاعری کے مطابق نظموں کے اتنے کثیر نمونے موجود ہیں کہ شاید اقبالؔ سے قبل کسی شاعر کے کلیات یا دیوان میں نظر آئیں۔ ان نظموں میں قلی قطب شاہ نے اپنے عہد کی زندگی کو منعکس کر دیا ہے۔"

(تاریخ ادب اردو، مصنفہ وہاب اشرفی، ص ۱۱۲۔۱۱۳)

قلی قطب شاہ کی حالات زندگی ادبی وسماجی خدمات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ اس نے تعمیرات اور فلاح و بہبود انسانی کے لئے نہایت کارآمد اقدامات اٹھائے ہیں۔ اور اپنے تعمیراتی ذہن کا عوام الناس کو احساس دلایا ہے۔ ساتھ ہی کئی اصناف شاعری میں اپنی جولان طبع کا مظاہرہ کر کے اپنی شناخت ادب میں مستحکم بنائی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر عاشقان ادب کو بھی اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قلی

قطب شاہ کی دیگر خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی غزل گوئی اردو کے ابتدائی دور میں ہونے کے باوجود کلاسیکی اردو شاعری میں بلند مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ موصوف کی زندگی اور ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے مشہور و معروف ناقد و محقق جمیل جالبی بھی یوں رقم طراز ہیں :

> ''قلی قطب شاہ کا تینتس ۳۳ رسالہ دور اپنی ادبی سرگرمیوں، علمی کاوشوں، اور فنی تخلیقی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ قطب شاہی سلطنت کا یہ زرّیں دور ہے۔ جس پر اردو و تلنگی شاعری کی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ اسی کے دور سلطنت میں شہر حیدر آباد بسا، نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئی، باغوں کے نئے نئے طرز وجود میں آئے، فوارے اور نہریں نئے تیور سے زمیں کے سینے پر رواں ہوئیں۔ دریاؤں کے کنارے پر سیر گاہیں بنیں، عبادت خانے، کتب خانے اور مدرسے قائم ہوئے۔ فن مصوری اور رقص و موسیقی کو ترقی ہوئی۔ علماء وفضلا نے معاشرے میں اہم مقام پایا۔ علم کی بنا پر میر محمد مومن استر آبادی وکیل سلطنت مقرر ہوئے۔ فارسی کے نامی شاعر میرزا محمد امین میر جملہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ نامور وجہی اسی کے دربار کا شاعر ہے اور احمد گجراتی نے اسی کے دربار میں اپنی دو طویل مثنویاں ''یوسف زلیخا'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' پیش کیں۔ خود بادشاہ نہ صرف اپنے زمانے کا بڑا شاعر تھا بلکہ آج بھی ایک اہم اور پہلے صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔''
>
> (تاریخ ادب اردو جلد اوّل، مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ۳۸۳۔۳۸۴)

واضح ہے کہ اس خطۂ ارض میں شاعروں ادیبوں اور مصنفین کی ایک باوقار جماعت موجود ہے۔ جو اردو کلاسیکی غزل کی روایت میں اہم اور قابلِ قدر ہے۔ اس ضمن میں قلی قطب شاہ کا ایک اہم اور قابل قدر حصہ ہے۔ موصوف کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مرے مذہب کی باتاں کھول کر اب کیا پوچھیں گے کو
ہمیں جانے و مذہب اے رقیباں کیا غرض تم کو

پھولاں کی شاخ پر بیٹھا ہے، بھنورا نیہہ سے جھلتا
بھرے گا شہد سوں اب تو ہمن اللہ جیوکا جو

کئے بنیاد مستی کا تمن دکھ زاہد و جاہل
کروں کعبہ میں سجدہ ہر کد ہر کوئی کہیں گے مو

ازل تھی ہم تمن میں یاری ہے اے پیر میخانہ
عجب کیا ہے چھپا کر دیومئے مجکوں پیالی دو

کروں تعریف میں کس دھات سوں میویاں کہ رنگاں کا
پون جو بن کے ملکیاں کوں لگیا ہے میوہ رنگین ہو

قلی قطب شاہ کی غزلوں کے مطالعے سے واضح ہے کہ ان کی غزلیں ایک جذبے، ایک موڈ کی ترجمانی پیش کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایسا اثر ہے جو قاری کو آج بھی متاثر کرتا ہے۔ ان کی شاعری ایک سچے جذبات کی عکاس نظر آتی ہے۔ اس میں فطری رجحانات ومیلانات واضح نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری حسن پرستی کا نمونہ ہے، انہوں نے قدرتی مناظر کا حسن، عورتوں کا حسن و جمال اور مختلف رسومات کے حسین پہلو کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ جس سے ان کی جمالیاتی فکر بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جسے بعد کے شاعروں نے اپنی شاعری کے اوصاف میں داخل کرلیا ہے۔ اور اردو غزل میں جمالیاتی شاعری کھل کر سامنے آتی ہے۔ اور کئی شاعروں کا یہ انفرادو

امتیاز بھی قرار پایا ہے۔ اسی دور کے ایک اور شاعر غواصی کا بھی نام لیا جاتا ہے کہ اس نے بھی محمد قلی قطب شاہ کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ غواصی کو دراصل ادب میں ان کی مثنویوں ''مینا ستونتی''، ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' کے لئے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ کئی صنف شاعری کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ لیکن غزل کے سلسلے میں ان کا کوئی واضح مقام و مرتبہ نہیں ہے لیکن ناقد و محقق پروفیسر وہاب اشرفی انہیں ایک ممتاز غزل گو شاعر تسلیم کرنے پر بضد ہیں۔ وہاب اشرفی کے جملے ملاحظہ فرمائیں :

> ''غواصی کے دیوان میں نظم و غزل اور ریختیاں ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ غواصی غزلوں میں اتنا اہم شاعر نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے کلیات میں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جو اس کے تخیل اور فکر کا بخوبی احساس دلاتے ہیں۔ ان میں گہرائی بھی ہے۔ لہٰذا اسے غزل کا بھی ایک ممتاز شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس کے عہد کے دوسرے شعرا لازماً اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ غزلیں دکنی تیور رکھتی ہیں۔
>
> تخاطب کا انداز بھی عام دکنی تیور سے الگ نہیں۔ یہ اپنے معشوق کو سہیلی، سکی، سجانا، موہنی، دھن، سندری جیسے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کے غزلوں کی عورتیں خد و خال اور دوسرے رنگ روپ سے بھی ہندوستانی ہی ہیں۔ لہٰذا فارسی اثرات کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔''
>
> (تاریخ ادب اردو، جلد اول، مصنفہ وہاب اشرفی ص ۱۲۳)

غواصی ایک ہنرمند اور قادر الکلام شاعر ہے۔ اس کی مثنویاں نہایت مؤثر اور کارآمد ہیں۔ ان کا فطری میلان مثنوی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ بلکہ مثنوی کی طرح ان کی غزلیں بھی فکری اور فنی اعتبار سے قابلِ قدر بھی ہیں اور لائق تحسین بھی ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

کالی پٹیاں ہیں پھول بھر جب سوں گندی سویوں دی
تاریاں کی مہمانی کرتے تھے تارے تار رات

لال دو گال رنگ بھرے تیرے
عین جیون تارنگیاں ہیں بنگالی

کھول ادھر بنج سوں بول بارے توں
کس چمن کی ہے پھول کی ڈالی

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

کھلے سر تھے گلزار الحمد اللہ
اٹھیا، جگ میں مہکار الحمد اللہ
جہاں کا تہاں آج دیتے ہیں جلوہ
سعادت کے آثار الحمد اللہ
سوئے بخت میرے جو تھے آج لگ سو
دئے جاگ یکبار الحمد اللہ
بہت دن پچھیں لال کا آج روزی
ہوا منجکو دیدار الحمد اللہ
مرے ذوق شوق ہور آنند کیرا
ہوا گرم بازار الحمد اللہ

نظر منج غواصی ابھر کر کرم کی

نوازیا وہ غفار الحمد اللہ

بہر کیف غواصی کی غزلیں کلاسیکی اعتبار سے نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہیں۔اس کی غزلیں فکری اور فنی اعتبار سے لائق ستائش ہیں اور ادب کا ایک سرمایہ ہیں۔ان کی غزل گوئی کے سلسلے میں ناقد و محقق جمیل جالبی کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں :

""غواصی کی غزلوں میں عشق کا تصور مجازی بھی ہے اور حقیقی بھی۔وصل کا لطف بھی ہے اور ہجر کا اضطراب بھی۔باطن کے رموز بھی ہیں اور عالم مستی کی کیفیت بھی۔لیکن زبان و بیان ،رنگ و آہنگ کے اعتبار سے ان کی وہ اہمیت نہیں ہے جو محمود، حسن شوقی اور ایک حد تک محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں کی ہے۔""

(تاریخ ادب اردو جلد اول ،مصنفہ جمیل جالبی ،۴۸۴)

غواصی بنیادی طور پر ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے ادب میں پہچان رکھتے ہیں۔انہوں نے نظمیں اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔تمام اصناف میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔لیکن غزل میں ان کے افکار و نظریات زیادہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کی غزلیں غزل مسلسل کا درجہ رکھتی ہیں۔جن کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ایک قسم کا تاثر اور موسیقیت بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

دکنی ادب کا ایک اور اہم کلاسیکی غزل گو شاعر علی عادل شاہ ثانی (۱۶۳۸ء ۔۱۶۷۲ء) بھی گذرا ہے جو اپنا تخلص شاہی کرتا تھا اس نے بھی مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔اس نے مثنوی، قصیدے، گیت اور غزلیں بھی کہے ہیں۔زبان و بیان کے اعتبار سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔وہ ایک قادر الکلام شاعر تھا۔اس نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن اس کا طبعی میلان دکنی زبان کی طرف واضح نظر آتا ہے۔اس کی کلیات میں چھ قصیدے، ایک رباعی، تین مختصر مثنویاں ،بیس غزلیں، ایک مخمس، ایک مثمن، ایک قطعہ، ایک پہیلی، تین فردیات اور مراثی کے علاوہ چند مختلف نظمیں بھی ہیں۔تمام کلام کے مجموعی احاطے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

شاہی شراب اور عورت دونوں کا رسیا ہے۔ وہ حسن پرست ہے۔ رند مشرب بھی ہے، موسیقی کا دلدادہ بھی اور زیبائش و آرائش کا پرستار بھی ہے۔ اس کی تمام شاعری حمدیہ ہو یا نعتیہ، منقبت ہو، قصیدہ ہو یا مثنوی ہر جگہ یہی افکار و نظریات واضح نظر آتے ہیں۔ یہی کیفیت اس کے قصیدہ در منقبت ''حضرت امیر المومنین'' کا بھی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے اس کی غزلوں کے اشعار اور گیتوں کے اشعار میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حضرت علیؓ کو بھی ''پیا'' کہہ کر خطاب کرتا ہے اور خود شراب کے نشے میں ان کے ساتھ مل کر شراب پینے کی خواہش رکھتا ہے۔ شاہی کے لئے اس کا محبوب ہر جگہ ایک ہی نظر آتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی غزلوں کے چند اشعار پیش کر دئے جائیں تا کہ اس کی طرز شاعری کا اندازہ ہو جائے۔

پریت کی ریت سوں موہن کہے ہنس ہنس سنو شاہی
عجب شہرت ہوئی جگ میں ہماری عشق بازی کی

بھرے چشمے ادھر مد کے لبوں میں لب ملانے تھیں
نین سودھن چھک ہو رہے نظارے کے پئے پیالے

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو
یا روپ کی توں کھان ہے یا حسن کا سدور ہے

تج بال کالے دیک کر بادل پھریں حیراں ہو
تج بھال اور تلک کنے کیا چاند ہور کیا مور ہے

علیؑ کی شان میں قصیدہ کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آرے گلال مج کوں پیالا پلا میا کا
تا مست ہو کے دیکھوں مکڑا علی پیا کا

جوبن پھڑک کہتے ہیں پیوست ہو ملیں گے
آلنگ بدل رہوں اب بند کھول انگیا کا

مج دیکھ پیو چھتیاں، سنی مست مد کی بتیاں
جاوے سدا جیا چھج، حسرت سوں دوتیاں کا

شاہی کا یہی رنگ ان کی غزلوں، قصیدوں، مثنویوں اور گیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ غرض موضوع کوئی بھی ہو وہ پیا، پیالا، مے، مستی، انگیا، چھتیاں، جوبن، نین وغیرہ الفاظ کا استعمال ایک ہی انداز میں کرتے ہیں۔ یہی مخصوص طرز شاعری ان کی پہچان ہے اور دکنی غزل کے مزاج سے بالکل مناسبت رکھتا ہے۔ اسی لئے ان کی دکنی ادب میں ایک منفرد پہچان بنتی ہے۔ جو اُردو کی کلاسیکی غزل گوئی میں ایک مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔

دکنی ادب کے کئی شعراء ہیں جنہوں نے کلاسیکی اردو غزل کی روایت کو مستحکم اور باوقار بنانے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ جن کا نام میں نے مضمون کے پچھلے صفحات میں لیا ہے۔ لیکن مقالہ کی طوالت پیش نظر ہے اس لئے ان میں سے صرف چند مخصوص کا ذکر ہی پیش آیا چاہتا ہے۔ اس لئے بقیہ تمام شعراء سے صرف نظر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں اب ایک نام ملک الشعراء نصرتی کا بھی ہے۔ اس نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شاہی دربار سے بھی منسلک تھے۔ ان کی شہرۂ آفاق مثنوی ''گلشن عشق'' ہے۔ ان کی علمی صلاحیت کی وجہ کر لوگ انہیں ملا نصرتی کہہ کر پکارتے تھے۔ انہوں نے بیجاپور کے تین بادشاہوں محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی، تخلص شاہی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں بادشاہ علی عادل شاہ شاہی دربار نے انہیں ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ انہوں نے علی عادل شاہ کی مدح میں قصیدے بھی

لکھے ہیں۔اس لئے مثنوی کے علاوہ قصیدہ گوئی بھی ذوقؔ وسوداؔ کی طرح ان کے کلام کی بھی شان معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مثنویوں کے نام ''علی نامہ'' تاریخ اسکندری ''گلشن عشق'' وغیرہ ہیں۔مثنوی ''علی نامہ'' میں کل سات قصیدے ہیں۔انہوں نے رباعیات اور غزلیں بھی کہیں ہیں اوران صنفوں میں بھی اپنا رنگ منفرد قائم رکھا ہے۔مثنوی ''علی نامہ'' میں مدحیہ اشعار اس قدر پرشکوہ اور زوردار ہیں کہ ان کا شمار قصیدہ میں ہو جاتا ہے۔اس دور میں بھی غزلوں کی ایک باقاعدہ روایت ملتی ہے۔نصرتیؔ کی غزلیں بھی دکن کی روایت کا حصہ ہیں۔اس کی غزلوں پر بھی دکنی ادب و تہذیب اور ثقافت کا رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ملا نصرتیؔ کی غزل گوئی کے سلسلے میں جمیل جالبیؔ کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

> ''دکنی غزل کے مزاج کے عین مطابق نصرتیؔ کی غزل کا موضوع بھی عورت ہے۔جس سے وہ غزل کے اشعار میں اپنے عشق و محبت کے جذبات و خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔چند غزلیں، ہندوی شاعری کی روایت میں ایسی بھی ہیں، جن میں عورت اپنے عشق کی کیفیات کا اظہار کرتی ہے۔نصرتیؔ نے اپنی غزلوں میں ان عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔جو عام طور پر عشق میں پیش آتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اُردو (جلداول) مصنفہ،جمیل جالبیؔ،ص ۳۴۷)

نصرتیؔ کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ علی عادل شاہیؔ بادشاہ کا قریبی تھا۔ اوراس کی محفل آرائش میں اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔اس کی غزلیں فارسی غزل گوئی کے بنیادی رجحانات سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔اس نے اپنی غزلوں میں فارسی تراکیب واضافت کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔زبان و بیان کے اعتبار سے بھی وہ ایک قادرالکلام شاعر ہے۔نصرتی کی غزلیں الفاظ کی بندش، معنویت کی تہہ داری اور کلام کی برجستگی اور بے ساختگی کے زیور سے آراستہ نظر آتی ہیں۔نصرتیؔ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دیکھو سلسکیاں میرا پیا کس سیج داتا ساد سے
مجھ چھوڑ کر اپنا وقت بھی کہیں کماتا ساد سے

پیو چھوڑ کر جن نصرتیؔ دنیا سے غافل ہوا
اس عمر کوں ناچیز کر ناحق گنواتا ساد سے

ہے نصرتیؔ جگت میں جنم حسن کا بھوکا
نعمت تجھ ایسی پائے یہ رہے دل صبور کیا

فارغ بکٹ ہیں مہر جو کرنا سوبیگ کر
اجنوں تو دیکھتی ہے عبث گھور گھور کیا

جا کھیا ہوں جب آدھرتے تیرے شہد ناب میں
سٹتا نہیں ہوں تب تے زمیں پر جلاب میں
عالم کی تب تے نصرتیؔ پروا سٹیا مدام
جب تجھ شرابِ حسن کی مستی اسے چڑی

نصرتیؔ کی غزلوں میں شراب، شباب، عشق، محبت، عورت غرض صرف رنگ رلیاں منانے کا احساس ملتا ہے۔ اس کے تمام اشعار میں جنسی تشنگی اور دور سے حسن کو تکتے رہنے کی بات ملتی ہے۔ نصرتیؔ بنیادی طور پر مثنوی کا شاعر ہے۔ اس کا طبعی میلان نظم گوئی کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن اس کی غزلیں کلاسیکی غزل گوئی میں ایک مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی احمد گجراتی بھی ہے۔ اس نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ اردو میں غزل گوئی بھی

کی ہے۔ یہ بنیادی طور پر مثنوی نگار شاعر ہے۔ اس کی مشہور مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''یوسف زلیخا'' ہے۔ اردو مثنوی میں اس کے خدمات لائق تحسین ہیں۔ لیکن احمد گجراتی نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کی غزلیں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اس کی غزلوں کا اسلوب دکنی اور فارسی کے امتزاج سے پروان چڑھا ہے۔ جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں اس کی دو غزلیں نقل کی ہیں۔ دونوں غزلوں سے چار چار اشعار ملاحظہ فرمائیں

گھونگھٹ جب زر زری مکھ پر تے موہن ڈال کر نکلے
مقابل ہوئے نا ہرگز اگر سور ہجر نکلے

عجب کل رات دھن سوں نو ایک معجزہ دیکھا
کہ سارے چاند دو نزل سویک چولی بھتر نکلے

چنچل کی جب صفت لکھنے قلم میں ہاتھ نیں لیتا
ایکا یک ہاتھ میں میرے قلم ہو نیشکر نکلے

موہن کے غم سوں گل گل کرنین سوں رات دن میرے
کہ پانی ہو کے مجھ سارا کلیجہ اور جگر نکلے

دوسری غزل کے چار اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میٹھے بچن ترے سن نا بات کر کے سمجھیا
شیریں لباں یو تیرے جوں شات کر کے سمجھیا

بستاں میں ہے مکلس سر پر ہے زر کا آنچل
جھلکاٹ دیکھ کر مکھ کا شب برات کر کے سمجھیا

دشمن کے بولنے کا نی اعتبار مجھ کن
یک بات میں دوتن کے کے گھات کر کے سمجھیا

احمد دکن کے خوباں ہوتیاں ہے پر ملاحت
توں توں دکن کو اپنا گجرات کر کے سمجھیا

احمد گجراتی کا فطری میلان غزل گوئی نہیں مثنوی نگاری کی طرف زیادہ نظر آتا ہے۔ غزل گوئی کے ارتقائی نشو ونما میں اس کے خدمات کی وجہ سے اِسے یاد کیا جاسکتا ہے۔ بیجاپور کے ابتدائی دور میں غزل گوئی کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت ملتی ہے۔ اس روایت میں ایک نام برہان الدین جانم (۱۵۵۴ء۔۱۵۹۹ء) کا بھی ہے۔ ان کی نظموں کے متعلق مباحث ملتے ہیں لیکن غزلوں کے کوئی نمونے دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ دکن میں غزلوں کی روایت کے سلسلے میں جمیل جالبی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''تاریخ اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مشاعروں کا عام رواج تھا اور ظاہر ہے مشاعروں میں فتح نامے، قصیدے اور مثنویاں نہیں پڑھی جاتی ہوں گی۔ اس مقصد کے لئے ہر شاعر غزلیں اور رباعیاں کہتا ہوگا۔ اگر ترتیب زمانی کے ساتھ بہمنی دور سے لے کر عادل شاہی وقطب شاہی دور تک غزلوں کی روایت کا سراغ لگایا جائے تو ہمیں غزل کی ایک باقاعدہ روایت بنتی، سنورتی اور پھیلتی دکھائی دیگی۔ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے غزل نہ کہی ہو۔''

(تاریخ ادب اردو جلد اول، مصنفہ جمیل جالبی، ص ۳۴۷)

اقتباس بالا سے یہ واضح ہے کہ جتنے بھی شاعر گزرے ہیں۔ سبھی نے غزل کی زلفیں ضرور سنواری ہیں۔ لیکن چند ہی شاعر ہیں جن کا ذکر تذکروں میں ہوا ہے۔ کئی اچھے شاعر ذاتی تعلقات اور چپقلش کی وجہ سے صرف نظر ہو گئے ہیں۔ یا کچھ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی سید میراں خاں ہاشمی کا بھی نام ہے۔ انہوں نے مثنوی، قصیدہ، نظم اور غزل وغیرہ بیشتر اصناف شعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں آنکھوں سے اندھے تھے۔ اس کے باوجود ایک قادر الکلام اور پر گو شاعر تھے۔ ان کے قصیدے اور مثنویاں غیر مطبوعہ ہیں صرف ''دیوان غزلیات'' ہی مطبوعہ ہے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''ایک اندھے کا اتنی طویل مثنوی لکھنا۔ نہ صرف یہ مثنوی لکھنا بلکہ غزلیات کا دیوان، قصائد اور عشقیہ مثنوی وغیرہ یادگار چھوڑنا۔ اردو ادب کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے۔ ہاشمی کے تخیل نے وہ کر دکھایا جو آنکھ والے بھی نہ کر سکے۔ ہاشمی بیجاپور کا آخری بڑا شاعر ہے۔ جس نے دکنی زبان کو اظہار کی نئی سطح دے کر اپنی شاعری میں محفوظ اور ساتھ ساتھ اسے جدید اسلوب سے قریب تر بھی کر دیا۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد اول) مصنفہ جمیل جالبی، ص ۳۶۳)

جمیل جالبی کے بیان سے واضح ہے کہ ہاشمی ایک باکمال شاعر تھا۔ جس نے بیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی ہی نہیں کی بلکہ اپنے دور میں ایک منفرد فکر اور اسلوب کو راہ دی ہے۔ وہ بنیادی طور پر مثنوی اور قصیدے کا شاعر ہے۔ اس کا طبعی میلان نظم نگاری کی طرف زیادہ ہے۔ اس لئے وہ اپنی غزلوں کے اشعار میں اور اپنی مثنویوں اور قصیدوں پر اظہار فخر کرتا ہے۔

غزلاں قصیدے مثنویاں ہے جیو میں تجھ بولنا
دھرپت خیالاں تجھ اپر آتا مجھے گانے ہوس

غزلاں قصیدے مثنویاں تعریف میں دھن کے لیچ ہیں

سچ نہیں جے لگتا سو وو دیکھو یو ہر ہر کا بیاض

ہاشمی کے دور تک آتے آتے غزل ایک صنف سخن کا رتبہ حاصل کر چکی تھی۔اب با قاعدہ شاعر اس صنف کی زلفیں سنوارنے میں منہمک ہو گئے تھے۔اب غزلوں میں عشق ومحبت کے جذبات با قاعدگی سے قلم بند کئے جارہے تھے۔فنی اعتبار سے بھی اردو کلاسیکی غزل فارسی کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔اس لئے ہاشمی کے دور میں آتے آتے تمام شاعروں کے دیوان میں غزلوں کی ایک اچھی خاصی تعداد دیکھی جا سکتی ہے۔ہاشمی کے پہلے کے شاعروں کے یہاں غزلیں بہت مشکل سے نہایت ہی قلیل تعداد میں ملتی ہیں۔چند شاعروں کو چھوڑ کر (قلی قطب شاہ اور حسن شوقی وغیرہ) غزلیں کہنے والا شاعر کم نظر آتا ہے۔یا جس نے غزل کہی وہ صرف رسماً ایک دو تین غزلیں کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے اور دیگر اصناف سخن میں خوب طبع آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔بلکہ اس دور کے شاعروں نے اپنے دیوان میں غزلوں کو جگہ بھی نہیں دی۔اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہاشمی کے پہلے تک جن شاعروں نے غزلیں کہی ہیں۔وہ صرف ایک رسم کے تحت کہی اور انہیں کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے اسے دیوان میں بھی شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ان رویوں کے الگ ہاشمی نے غزلیں کہی ہیں۔ہاشمی کی غزل گوئی اس دور میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ہاشمی کی غزل گوئی کے سلسلے میں جمیل جالبی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''ہاشمی کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک ہی بات یا جذبے کے مختلف پہلوؤں کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔زیادہ تر غزلیں اسی مزاج کی حامل ہیں۔جو غزل مسلسل کے ذیل میں لائی جا سکتی ہیں۔دوسری خصوصیت یہ کہ غزلوں میں اشعار کی تعداد دس پندرہ سے لیکر بیالیس تک ملتی ہے۔جہاں طویل غزلوں سے ہاشمی کی پر گوئی کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ابھی غزل کے مزاج میں مثنوی یا طویل نظم کا مزاج جاری وساری ہے۔اس میں سمٹاؤ کے پھیلاؤ اور ارتکاز کے بجائے توضیح کا

عمل کام کر رہا ہے۔ تجربے کو سمیٹ کر غزل کے دو مصرعوں میں بیان کر دینے
کا تخلیقی عمل ابھی غزل میں نہیں آیا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ہاشمی غزل
شاہی اور نصرتی کی غزل کے مخصوص مزاج کو آگے بڑھا رہی ہے۔ اور یہاں
بھی رنگ رلیاں منانے، کھیل کھیلنے اور دادِ عشق دینے کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہاشمی
کا تصورِ عشق یہاں بوالہوسی کی سطح پر رہتا ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ہاشمی
نے زیادہ تر اپنی غزلوں میں عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان اور
محاورے میں بیان کیا ہے اور یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے ریختی کی
صنف سے بے حد قریب ہیں۔ ریختی کا یہ انداز ہمیں شاہی، نصرتی اور کہیں
کہیں حسن شوقی کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ لیکن ہاشمی کے ہاں یہ موضوع غالب
ہے۔ اس طرح ان کی غزلوں میں دکنی عورتوں کا ماحول، سامانِ آرائش،
لباس، طور طریقے، زیورات، کھانے پینے کی چیزیں موسیقی کے مخصوص و مقبول
راگ، تفریح و چہل اور زبان و محاورہ محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہ غزلیں دکن کی
ضعیف اور زوال پذیر تہذیب کی پوری طرح آئینہ دار ہیں۔"

(تاریخ ادب اردو جلد اول، مصنفہ جمیل جالبی، ص ۳۶۴)

ہاشمی کے دور تک غزل کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی غزل کو ارتقاء کی کئی منزلوں کو پار کرنا تھا۔ آج غزل جس مقام پر کھڑی ہے اس راہ پر گامزن ہونے کی طرف یہ غزل کا پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہاشمی کی غزل گوئی نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی حامل ہو جاتی ہے۔ جو اپنے دور میں بھی مقبول و مشہور رہی ہے۔ اور آج بھی قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے ہاشمی کی غزل گوئی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہاشمی کے یہاں غزل اپنی پوری شناخت قائم کرتی نظر آتی ہے۔ ہاشمی نے اپنی غزلوں میں محبوبہ کے مختلف ناز و انداز کا نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کی محبوبہ کوئی بڑی یا رانی نہیں ہے بلکہ ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والی

جوان عورت ہے۔ جس کے اندر جوانی کی امنگیں ہیں، تمنائیں ہیں، جنسی جذبات ہچکولے مار رہے ہیں۔ جس کا بدن جوانی کی امنگوں سے بھرا ہے۔ ہاشمی کی غزلوں میں الگ الگ خواہشات کا اظہار دیکھا جا سکتا ہے۔ ہاشمی نے اپنی محبوبہ کی شوخی اور چینچل اداؤں کا بیان یوں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جہاں بیٹھی وہاں گاتی ذرا شکتی نیں مرداں موں
بڑا ہے ناؤں دو جگ میں چینچل گاون ملالی کا

نہ ٹھیرے اوڑھنی سر پر، جنم شاوار پیروں پر
ٹکیاں سو میں تو دیکھی نیں ذرا داون ملالی کا

ہجر و جدائی کے تعلق سے یہ شعر۔

پیا ایسے میں آئے تو گلے لگ کر گرم ہوں گی
کرم میں اب ہوؤنگی دو دانا دان ٹھنڈا کالا

اپنی محبوبہ سے ملنے کی خواہش کے سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہو۔

تیرے سنگار کے بن میں تما شا میں نول دیکھا
سُرو کے جھاڑ کوں نزل اناراں سے دو پھل دیکھا

ترا قد نیشکر جانو مکیاں جوبن چینے کیاں دو
ترے سینے کے جل میانے کچن کے دو کنول دیکھا

سہاوے نا رنجی چولی ہرے ڈالیاں منے تیرے
چھپنے پاتاں میں جیوں نا رنج یوں کچ پر انچل دیکھا

ہاشمی کی غزلوں کے موضوعات میں اس قدر سطحی بیانات ہیں کہ آبرو کی غزلوں کی یاد دلاتے ہیں۔اس طرح کی شاعری تہذیب کے دور زوال میں اکثر و بیشتر دیکھنے کو ملتی ہے۔لکھنو میں بھی ریختہ کا رواج اسی تہذیبی زوال کا مظہر ہے۔رنگین، انشا اور شاہ نصیر کی شاعری کے جھوٹے موتی بھی اسی بات کی علامت ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاشمی کی غزلیں بھی اس کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتی ہیں۔ ہاشمی اپنی شاعری میں ان حالات سے نبرد آزما ہونے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنے کے بجائے خود انہیں زوال آمادہ تہذیب کا نمائندہ شاعر بن جاتا ہے۔ہاشمی نے اپنی شاعری میں وہی خیالات وتصورات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔جو اس وقت کے لوگ سننا پسند کرتے تھے۔یہی اس کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی۔اس کی شاعری اپنے دور کا آئینہ ضرور بنتی نظر آتی ہے۔ان تمام باتوں کے باوجود اس کی غزلیں کئی اعتبار سے کلاسیکی غزلوں میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔اس سلسلے میں جمیل جالبی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

> ”فنی اعتبار سے اس دور کا صف اوّل کا شاعر ہے۔اور اس کا نام نصرتی کے بعد لیا جانا چاہئے۔زبان و بیان کی سطح پر وہ بیجاپوری اسلوب کے نئے عبوری دور کا شاعر ہے۔جس کا رشتہ ناتا ایک طرف اسلوب بیان کی پرانی روایت سے قائم ہے۔اور ساتھ ساتھ جدید اسلوب کے امکانات بھی اس کے ہاں اپنا زور دکھا رہے ہیں۔“

(تاریخ ادب اردو جلد اول، مصنفہ جمیل جالبی، ص ۳۶۷)

ہاشمی دور اوّل کا شاعر ہے فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اس کا اپنا امتیاز ہے۔اسلوب بھی نہایت سلیس اور سادہ ہے۔اس لئے پر اثر معلوم ہوتا ہے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہاشمی اندھا تھا۔اس کے باوجود اس کے اشعار میں رنگوں کا احساس گہرا ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

ہری چولی کی کیا تعریف کروں اودے ڈنڈا رس کا
تو گوری خوب لگتا ہے تہبند تو لال اطلس کا

کالی تری دھڑی نے جا سن کا رنگ کی رد
لب لال اج اڑایا لالے کی ہر مڑی کا

گوری کا رنگ گورا چولی بنفشی زر کی
لگی ہے لال چولی کیا خوب ہری تہبند پر

دکھلا کے سب زرینہ کیا جانے کرے گی
دیکھت اڑا ہے ہلنا نتھ کی تری لڑی کا

مندرجہ بالا اشعار میں ہاشمی نے جو تجربات ومشاہدات قلم بند کئے ہیں۔ وہ قابلِ تعریف ہیں۔ایک اندھے شاعر کا اس قدر جسمانی خطوط کے تیکھے پن کا اظہار اور شعور کسی صورت حیرت انگیز ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاشمی کی غزلیں کلاسیکی غزلوں میں اپنا مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز الحق کے دو تین جملے ملاحظہ فرمائیں :

> ''ہاشمی کے دیوان میں ۳۲۸ رغزلیں ہیں۔ اس کی طویل مسلسل غزلوں میں ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے پیش کیا گیا ہے۔ عورتوں کی زبان اور محاورے پر اسے عبور حاصل ہے۔ اس کے یہاں دکنی ماحول اور طرز معاشرت کی بڑی اچھی عکاسی ملتی ہے۔ ہاشمی نے ردیف کے ساتھ قافیے کا بھی اہتمام کیا ہے۔''

(اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، مصنفہ ڈاکٹر ممتاز الحق، ص ۹۶)

ہاشمی، شاہی اور نصرتی کے عہد میں آتے آتے غزل فارسی اثرات قبول کر چکی تھی۔ غزل میں فکری اور

فنی دونوں اعتبار سے تغیر واضح ہو رہے تھے۔ حالانکہ غزل کو ابھی مثنوی کے رنگ سے آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لیکن موضوعات میں تنوع بھی نظر آنے لگا تھا۔ حسن وعشق کی کیفیات کے علاوہ تصوف کے مسائل، اخلاقیات، زاہدو ناصح وغیرہ موضوعات پر غزلوں میں اشعار لکھے جانے لگے تھے۔ ریختی میں اردگرد کے ماحول اور معاشرت کی عکاسی بھی کہیں کہیں وجود پانے لگی تھی۔

ملا خیالؔی، فیروزؔ و محمودؔ نے بھی اس روایت غزل کو خوب ترقی دی۔ کلاسیکی غزل گوئی میں محمودؔ کو اس کی روایت کا معمار اول قرار دیا جاتا ہے۔ محمود نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل پر اس کے گہرے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ محمودؔ ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ اس نے جس زبان میں شاعری کی ہے وہ اردو زبان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ابتدائی دور میں جو اُردو زبان استعمال ہورہی تھی محمو دتک آتے آتے اس میں کافی تبدیلی رونما ہوتی نظر آتی ہے۔ اس نے غزل کی ہیئت وخصوصیت کو ایک مستحکم شکل و صورت عطا کی۔ اس کے اشعار میں قدامت کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات نئے اسلوب اور نئے طرز کا احساس وجود پاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فرد بازی عشق کے دایم لکھا ہے کھیل نے
محمودؔ عاجز کوں اپنا حیرت منے ششدر کئے

جو کوئی تمارے عشق کی حالت سنی ماہر ہوا
چھوڑیا سگل اسلام کوں تجھ زلف میں کافر ہوا

ظاہر گنگا کے جل سیتی نہانا سو کچھ نیں اے بہمن
خون جگر کے نیر سوں نہایا سو او ظاہر ہوا

دو جگ سیتی فارغ ہوا اچھے رند و نظر باز
محمؔود دیوانہ ہو پھرے تیرے درس کا

دئی ہوں روشنی دلکوں مدد امداد رونے سوں
چراغِ بے بہا روشن کئے پانی ستی یاراں

پر کہ محمؔود دنیا میں توں رسم آمیز عالم کوں
اپتا مکھ موڑ کر بیٹھے جو تھے تج جیو کے یاراں

گر کان ہیں تجھ کوں ارے اس باغ میں غنچے سگل
کرتے ہیں سو جیباں ستی تلقینِ خاموشی تجھے

ایک غزل کے چار اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

ناکفر پچھانے دل حیراں ونہ دیں کوں
از نقش چپ و راست خبر نیں ہے نگیں کوں

آسودہ رہے عشق زہے تابِ عشاق
نین زلزلہ خاک سوں غم چرخِ بریں کوں

ہر چند ہوس ہے تجھے اس جگ میں خوشالی
زنہار نکو کھول اپس چینِ جبیں کوں

گرکان ہیں تجھ کوں ارے اس باغ میں غنچے سگل

کرتے ہیں سو جیاں ستی تلقینِ خاموشی تجھے

محمود کے غزلیہ اشعار کے مطالعے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جوموضوعات اور اسلوب اس کی غزلوں میں عیاں ہوئے ہیں۔اس قبیل کے موضوعات اور اسلوب دوسرے ہم عصر شاعروں کے یہاں نہیں پائے جاتے ہیں۔لیکن یہی رنگ سخن روانی وسلاست اور شیرنی قلی قطب شاہ اور حسن شوقی کے کلام میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔محمود کی غزلوں میں رنگ تغزل کا عکس بھی واضح نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں جمیل جالبی کا ایک اقتباس نہایت وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالتا ہوا نظر آتا ہے۔جو قابلِ توجہ ہے :

> ''وہ (محمود) بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور غزل کی ہیئت کو پورے طور پر استعمال میں لا رہا ہے۔اس کے یہاں پر غزل میں مطلع اور مقطع ملتا ہے۔ ہر غزل میں کم از کم پانچ اشعار ضرور ہوتے ہیں۔ جہاں اشعار کی تعداد ایک ہی بحر،ردیف وقافیہ میں زیادہ ہے وہاں پانچ اشعار کے بعد نیا مطلع کہہ کر اسے فارسی روایت کے مطابق دوغزلہ بنا دیتا ہے۔..........اس کے ہاں فارسی تراکیب اور بندشوں سے شعر میں ایک خوبصورت آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔اور اس میں روانی،شیرنی،اور برجستگی بڑھ جاتی ہے۔''
>
> (تاریخ ادب اردو،جلد اوّل مصنفہ جمیل جالبی،۴۰۵)

محمود کی غزل گوئی اردو غزل گوئی کی روایت میں نہایت اہم ہے اس نے فارسی غزل گوئی کو اردو میں روشناس کرایا ہے۔اور اس میں اپنا رنگ امتیاز بھی قائم کیا ہے۔اس کی غزل گوئی دیگر ہم عصر شعراء کی غزل گوئی سے کہیں بلند مقام ومرتبہ رکھتی ہے۔اس کی غزلوں میں موضوعات کا محدود دائرہ بھی وسیع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔وہ غزلوں میں صرف عورتوں سے باتیں کرنے یا عشقیہ جذبات کو اظہار کا وسیلہ نہیں بناتا ہے۔ بلکہ اس میں دیگر

موضوعات کو بھی شامل کرتا ہے۔ یہی اس کے اختراعی ذہن کا انمول کارنامہ ہے۔ جو کلاسیکی غزل کی روایت کو مایہ دار اور وقار عطا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جو قدم راکھے سبک ساری کی رہ میں جیوں حباب
نیں ہے لغزش پانو کوں اس کے اگر چلنا بر آب

آج ہو رکل پر اپس کی زندہ کی ناکھال توں
جوتوں کرتا ہے سو کر لے حق کا ماں کوں شتاب

کب تلک بھٹکے گا توں بے بود کا ماں کے پیچھے
دیکھ توں ''دنیا'' دنی کوں جگ میں مانندِ سراب

سرد مہری بس کہ لوگاں کی دلاں میں جاگئی
مکھ کرم کس کا دِسیانیں مجھ کوں غیر از آفتاب

حسن لیلیٰ کا تماشا دیکھ مجنوں مکھ منے
کیوں گزرتا سر بسر از آفتابِ عاشقاں

کے کھجاتا سر کوں بیٹھا جگ منے افسوس سوں
کر طلب محمود دلسوں از جنابِ عاشقاں

محمود کی غزلوں میں غزل کے معنیٰ ومفہوم سے باہر نکلنے کی واضح کوشش نظر آتی ہے۔اس کی غزلیں زندگی کے مختلف تجربات ومشاہدات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہیں۔اردو غزل گوئی کو محمود نے ایک نئی راہ دکھائی ہے۔جو بعد کے شعراء کے لئے مشعلِ راہ بنی ہے اوران موضوعات پر بعد کے شاعروں نے اپنی غزلوں میں اشعار کہے ہیں۔اوران موضوعات پر بعد کے شاعروں نے اپنی غزلوں میں اشعار کہے ہیں۔

ملا خیال کی صرف ایک غزل دستیاب ہوئی ہے۔جس کی بنیاد پر کوئی حتمی فیصلہ مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی محمود کی طرح ایک غزل گو شاعر ہے۔اوراس کی فکری سطح اور اسلوب غزل بھی یکسانیت رکھتی ہے۔اس لئے ملا خیالی کی غزل سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بالی سروپ سو دھن جوں پوتلی نین میں
صاحب جمال ایسے سکھی نہ کوئی لنگھن میں

سنسار کے جتارے لکھنے میں ہیں سارے
مکھ دیکھ ، سر بسارے گم ہو رہے اپن میں

لہاریاں بھواں اٹل ہے کالا سمند کچل ہے
جل میں نین کمل ہے پتلیاں بھنور نین میں

نا رنج پھول جانی تس پھول آسمانی
دو پھول زعفرانی اُپجے ہیں سیم تن میں

ملا خیالی کی طرح فیروز کی غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لاکے پلک دکھ تاب میں یوں رات دیکھیا خواب میں

تجھ مکھ بھنواں محراب میں دو نین دیوے لائیا

جھلک جبیں ناہید ہے تجھ مکھ منے کا بھید ہے

روشن نہ تیوں خورشید ہے آنکھ بھرنکس دیکھلا ئیا

ملا خیالی، فیروز اور محمود، نصرتی، قلی قطب شاہ، حسن شوقی تمام شعراء نے دکن کے غزل کی روایت کو فروغ دیا ہے۔ اور اسی بنیاد پر غزل کی عمارت ولی اور سراج نے کھڑی کی ہے۔

ولی دکنی کا نام اردو کلاسیکی ادب میں نہایت معتبر درجہ رکھتا ہے۔ اس بات کا اعتراف پہلے بھی ناقد و محقق حضرات نے کیا ہے۔ آج بھی جب کوئی ناقد و محقق ولی پر قلم اٹھائے گا تو اس بات کا اعتراف بہر طور اسے کرنا ہوگا۔ ولی سے پہلے کے شعراء نے صنف غزل میں جس قدر طبع آزمائی کی اس کا ایک خصوصی جائزہ پچھلے صفات پر آچکا ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو سے لیکر حسن شوقی، نصرتی، ہاشمی اور محمود نے اس صنف کو ایک حد تک معیار دلانے کی بھر پور کوشش کی جو قابلِ تعریف ہے۔ ولی تک غزل کی روایت بہت حد تک فارسی آمیز ہو چکی تھی۔ اس روایت کو معیار و اعتبار کا درجہ ولی نے اپنی کاوشوں سے دلایا۔ اردو غزل گوئی کو ولی نے اس قدر وسعت بخشی کہ بعد کی نسلیں لمبے عرصے تک اسی حدود میں اپنا سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں وضاحت خاص بقول جمیل جالبی ملاحظہ فرمائیں :

> "ولی تک جب یہ روایت پہنچی تو اس وقت سارے دکن میں فارسی اصنافِ سخن، فارسی بحور، صنعتیات و رمزیات اور علامات و اسالیب کا رجحان پورے طور پر جڑ پکڑ چکا تھا۔ دکنی ادب میں مثنویات، غزلیات اور قصائد وغیرہ کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود تھا۔ اور سینکڑوں چھوٹے بڑے شاعروں نے اپنے خون جگر سے اس روایت کے پودے کو سینچا تھا........ ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس

نے شمال کی زبان کو دکھنی ادب کی طویل روایت سے ملا کر ایک کر دیا۔ اور
ساتھ ساتھ فارسی ادب کی رچاوٹ سے اس میں اتنی رنگارنگ آوازیں شامل
کر دیں۔ اور امکانات کے اِتنے سرے بھی ابھاڑ دئے کہ آئندہ دو سو سال
تک اردو شاعری انہیں امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی۔
اسی لئے ولی آئندہ دو سو سال کی شاعری کے نظام شمسی کا وہ سورج ہے جس
کے دائرہ کشش میں اُردو شاعری کے مختلف سیارے گردش کرتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اُردو جلد اوّل، مصنفہ، جمیل جالبی، ص ۵۲۹)

واقعہ یہ تھا کہ جب ولی سترہ سو عیسوی میں سید ابوالمعالی کے ہمراہ دلی آئے اور روایت کے مطابق ان کی ملاقات سعد اللہ گلشن سے ہوئی۔ ولی کے کلام سن کر انہوں مشورہ دیا ''ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اندر ریختہ'' اور ولی نے ان کے مشوروں پر عمل کیا جس کے نتیجے میں ولی نے دکنی زبان میں فارسی زبان کی پیوند کاری شروع کر دی اور ایک ایسا ادب تخلیق کیا جو نئی شاعری کا نکتہ آغاز قرار دیا گیا۔ اس روایت سے قطع نظر یہ سچ ہے کہ ولی نے ایسی شاعری کے نمونے پیش کئے جو اس دور سے بالکل مختلف تھے اور ان کی خصوصیات ایک اضافی صورت میں ادب میں داخل ہو گئیں۔ اس طرح کلاسیکل غزل گوئی کا باقاعدہ پہلا شاعر ولی دکنی قرار پایا۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''ولی پہلا شخص ہے جس کے شاعرانہ مزاج کو ''کلاسیکل'' کہا جا سکتا ہے۔ اس
کی تخلیقی قوت اور ذہنی فطرت بھی داد کے قابل ہے۔ اس نے جو کچھ کہا وہ اس
طرح قبول کر لیا گیا۔ جیسے سب لوگ اسی کی تلاش میں تھے۔ محمد قلی قطب شاہ
اپنے فطری زور میں جنگل کی ایک چڑیا کی طرح یکساں راک الاپتا چلا جاتا
ہے۔ لیکن ولی کے ہاں راک کے تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ نصرتی بحیثیت
شاعر ولی سے بڑا ہے لیکن اس کے زبان و بیان، فارسی عربی الفاظ کی آمیزش

کے باوجود مخصوص بیجاپوری رنگ کی وجہ سے اس سطح پر نہیں آتے جہاں ولی پہنچ

کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ ولی اپنی متوازن طبیعت سے فارسی، دکنی

اور شمال کی زبان کو اس طرح ملا کر ایک کر دیتا ہے کہ وہ علاقائی سطح سے بلند

ہو کر ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ اس کی فطرت میں جہاں جینئس اور فن کا امتزاج

نظر آتا ہے۔ وہاں وہ قوت محرکہ بھی نظر آتی ہے جو رہبر اوّل میں ہوتی ہے۔

انہیں اسباب کی بنا پر ولی ہمیشہ اردو شاعری کا "بابا آدم" کہلایا جاتا رہے گا۔"

(تاریخ ادب اردو جلد اوّل، مصنفہ جمیل جالبی، ص ۵۳۲)

اردو غزل گوئی کے کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ولی بابا آدم کہلاتے ہیں۔ انہوں نے دو تہذیبوں دو ادبوں کے امتزاج سے جو نیا آباد کی اس کی بنیاد بہت پہلے محمود، فیروز، حسن شوقی، ہاشمی اور شاہی وغیرہ کے ذریعہ پر چکی تھی۔ جس نے ولی کو اردو کلاسیکی غزل کی بلند عمارت تعمیر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح ولی کو اردو کلاسیکی غزل کی بلند عمارت تعمیر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح ولی نے فارسی اصناف و بحور اور اوزان کو اردو غزل میں ڈھال کر شاعری کی ایک نئی بنا تیار کی اور اپنے اختراعی ذہن سے نئی ترکیبیں تراشیں اور ایک معیاری کلاسیکل ادب وجود میں لانے کی کوشش کی جس کا پوری اردو دنیا میں استقبال کیا گیا۔ اور انہیں نقوش پر بعد کی شاعری پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز الحق کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

"ولی کے دور غزل کے موضوعات محدود تھے۔ تھوڑا بہت تنوع کا احساس محمود،

فیروز اور حسن شوقی کی غزلوں سے ضرور ہوتا ہے۔ ولی نے غزل کے دائرہ کو

کافی وسیع کر دیا اور اس میں زندگی کے مختلف تجربات واحساسات کو شامل کر

کے اسے رنگارنگی عطا کی۔ خاص بات یہ ہوئی کہ غزل داخلیت کی صفت سے

آشنا ہو گئی۔ ولی نے دکنی روایت سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور اس کے

بہترین اجزاء کو اپنی غزل میں شامل کیا، ساتھ ہی نئے امکانات بھی ان میں

پیدا کئے۔ ولی نے اپنے سے پہلے کے شاعروں کی زمینوں میں غزلیں کہیں
اور ساتھ ہی فارسی کی ان زمینوں کو بھی اپنایا جو اردو کے مزاج کے مطابق
تھیں۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی دیکھیں تو ہمیں ولی کے یہاں وہ تمام
موضوعات مل جائیں گے جو بعد میں اردو غزل کے مستقل موضوعات بنے۔''

(اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل مصنفہ ڈاکٹر ممتاز الحق، ص ۹۸)

ولی سے پہلے غزل گوئی میں سطحی بیانات، خیالات اور تصورات رقم کرنے کا رواج عام تھا۔ جس کے متعلق میں نے پچھلے صفحات میں عرض کیا تھا کہ اس طرح کی شاعری زوال آمادہ تہذیب و معاشرت کے زیر اثر وجود میں آتی ہے۔ اسی خیال و تصور کو لوگ پسند بھی کرتے ہیں۔ لیکن ولی نے اس انحطاط پذیر معاشرہ کی عیش پسندی کی آواز سے آواز نہیں ملائی بلکہ اس کے خلاف عام سطح سے اوپر اٹھ کر سوچا اور اپنی شاعری میں پاکیزہ خیالات و تصورات کو جگہ دی جو واقعی بڑے دل اور جگر کی بات ہے۔ ولی نے عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی سے بھی اپنا رشتہ جوڑا۔ اس طرح ان کے کلام میں تصوف کے خیالات بھی رقم ہوئے۔

ولی کے دیوان کی آمد سے دلی کا ماحول بالکل بیدار ہوگیا۔ چاروں طرف ولی کی شاعری اور دیگر شاعروں کے ذریعے ولی کی پیروی میں کوششوں کے چرچے عام ہوگئے۔ یہاں تک کہ اس زبان کی بادشاہ دربار میں بھی جگہ بنی شروع ہوگئی اس طرح عوام کی زبان کا درباری زبان میں شامل ہونا ایک مثبت اشارے کی صورت میں دیکھا جانے لگا۔ دربار کی سرپرستی جس زبان کو مل جاتی ہے اس کی ترقی میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس زمانے میں خاص و عام کی توجہ فارسی زبان سے ہٹ کر اردو کی طرف منتقل ہوگئی۔ ولی کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

ہے ترا حسن ہمیشہ یکساں
جنت سوں بہار کیوں کہ جاوے

گل و بلبل کا گرم ہے بازار
اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

دل کوں گر مرتبہ ہو درپن کا
مفت ہے دیکھنا سری جن کا

دیکھ تجھ میں جمال حق کا ظہور
ہیں دعا گو فلک پہ سارے ملک

عشق کر اے دل سدا تجرید کی
عاشقی ہے ابتدا توحید کی

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فن عاشقی عجب فن ہے

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کا جل
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کو لگاتی جا

ولی کی غزلیں کلاسیکی ادب کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ان کے کلام میں فکروفن کے حسین سے حسین پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کی غزلوں میں تشبیہوں کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ان کے اشعار میں احساسات کا ایک حسن جھلکتا ہے۔ان کے کلام میں ارضیت کے ساتھ ساتھ آفاقیت کا پہلو بھی واضح نظر آتا ہے۔ان کی غزلوں میں عربی اور فارسی کے حسین امتزاج ذہن ودل پر گرانی کا احساس پیدانہیں کرتے ہیں۔وؔلی کے دور تک غزل میں عشق ومحبت کے علاوہ دیگر موضوعات بھی جگہ پا چکے تھے۔اس لئے ان کی غزلوں میں عصر حاضر کے بھی موضوعات نظر آتا ہیں۔وؔلی کے بعد اردو غزل گوئی کے موضوعات میں وسعت وتنوع پیدا ہوا ہے۔جس کی بنیاد وؔلی کی غزلوں میں پڑی ہے۔اس طرح وؔلی نے ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔

وؔلی کی روایت کو سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۵ء۔۱۷۷۷ء) نے آگے بڑھایا۔چونکہ ولی ایک بڑے شاعر تھے۔اس لئے ان کا کارنامہ عہد آفریں کا درجہ رکھتا ہے۔اس کی آواز پوری اردو دنیا میں گونج رہی تھی۔اس کی شاعری کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا تھا۔اس نے اردو زبان وادب کو ایک نیا معیار دیا۔غزل کو تمام اصناف سخن میں برتری دلائی تھی۔اس لئے تمام معاصرین اس کی طرز شاعری کی پیروی پر آمادہ ہو گئے اس طرح وؔلی کی شاعرانہ استادی کی مہر واضح طور پر معاصرین پر ثبت ہوگئی۔اس سلسلے میں بیشتر ناموں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف

سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کا مخصوص جائزہ پیش کیا جائے گا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈاکٹر ممتاز الحق کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''سراؔج نے ولؔی کی روایت کو بڑی خوبی سے برتا اور اس میں اپنا مزاج شامل کر کے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔سراج کا عشق ایک صوفی کا عشق ہے۔جس میں بے پناہ سرشاری اور شدت ہے اس میں عشق مجازی کی رنگا رنگی اور وسعت تو نہیں مگر جو کچھ ہے وہ اتنا بھرپور اور جذبہ و کیف میں ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ایک ایسے دور میں جب زبان اکھڑی اکھڑی سی محسوس ہوتی تھی اور بیان میں صفائی کی کمی تھی۔سراؔج کے یہاں روانی اور برجستگی اور زبان کی سادگی اور شیرینی واقعی قابلِ حیرت ہے۔''
>
> (اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل مصنفہ،ڈاکٹر ممتاز الحق،ص ۱۰۰)

ڈاکٹر ممتاز الحق کے بیان کے مکمل حصے کو قبول کرنا مشکل ہے کیونکہ سراؔج کی غزلوں کا بیشتر حصہ جو انہوں نے چوبیس سال کی عمر تک لکھے تھے۔چونکہ انہیں بارہ سال کی عمر میں کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا اور اس کے عشق میں وہ مجنوں کی طرح صحرانوردی کرتے رہے۔پھر شاعری ترک بھی کر دی یعنی کل پانچ چھ سال کے عرصے میں انہوں نے ایک ضخیم کلیات لکھ ڈالی۔اس کلیات میں صرف دو سو اشعار ایسے ہیں جو ان کے متصوفانہ خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔بقیہ تمام غزلیہ اشعار خالصاً عشق مجازی کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں جمیل جالبؔی کے بیانات ملاحظہ فرمائیں :

> ''سراج کا ضخیم کلیات جس میں غزلیں،مثنویاں،قصیدے ترجیع بند،مخمسات اور رباعیات شامل ہیں۔صرف پانچ چھ سال کے عرصے میں لکھا گیا۔ ۱۱۵۲ھ/۳۹-۱۷ء میں یہ دیوان مرتب ہوا۔اس وقت سراؔج کی عمر چوبیس سال تھی اور اپنی عمر طبعی کا نصف سفر طے کر چکے تھے۔اس کے بعد انہوں نے

شاعری ترک کردی اور دریائے تصوف میں ڈوب کر ایسے برگزیدہ صوفی بن گئے کہ اولیائے کرام کے تذکرے سراج کے صاحب کمال ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔"

(تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) مصنفہ جمیل جالبی، ۵۶۸)

بہر کیف سراؔج کی شاعری اور غزل گوئی کے متعلق کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ انہیں پورا اردو ادب ایک عہد آفریں شاعر اور غزل گو تصور کرتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اردو کلاسیکی غزل گوئی کے میدان میں ایسا جھنڈا گاڑا ہے کہ اس کے سایہ تلے تمام اردو ادب لمبے عرصے تک ان کی سحر انگیزی کا شکار رہی ہے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

"پوری اردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، مومنؔ، غالبؔ، اقبالؔ، کی روایت کے راستے صاف نظر آئے ہیں۔ سراج نے اردو شاعری کے بنیادی راگ کو جگایا ہے۔ اس لئے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز، لے اور لہجے میں موجود ہے۔ سراج ولیؔ کی روایت کو بھی اپنے جذبہ عشق سے اتنا آگے لے جاتے ہیں کہ ان کی شاعری کو پڑھتے وقت ہمیں خیال بھی نہیں آتا کہ ہم ولیؔ کے فوراً بعد کی نسل کے شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ سراؔج کے کلام میں ولیؔ سے زیادہ اچھے عشقیہ اشعار کی تعداد ملے گی اور اگر اس تعداد کا مقابلہ دوسرے بڑے شاعروں کے اچھے اشعار کی تعداد سے کیا جائے تو سراج یہاں بھی ہمیں مایوس نہیں کرتے۔"

(تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) مصنفہ جمیل جالبی، ص ۵۷۴)

مندرجہ بالا مباحث سے واضح ہے کہ سراؔج کی غزل گوئی اردو ادب میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے چہار جانب تمام بعد کے شعراء اپنی شاعری کرتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے فکر وفن کی پیروی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ جو قابلِ قدر اور باعث افتخار بات ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سراؔج کے کچھ اشعار پیش کر دئے جائیں۔ جس سے کلام کے حسن و جمالیات کے ساتھ ساتھ فکری اور فنی پہلو بھی آشکار ہو جائیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شعلہ رو جام بکف بزم میں آتا ہے سراؔج
گردن شمع کوں کیا باک ہے ڈھل جانے کا

میرے جگر کے درد کا چارہ کب آئے گا
یک بار ہو گیا ہے دو بارہ کب آئے گا

ہر صفحہ اس کے حسن کی تعریف کے طفیل
گلشن مرا بہار ہوا بوستاں ہوا

مجھ میں دم دست و گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
چاک سینے کا نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا

یار کی وضع بے حجابی ہے
شوخ ہے، مست ہے شرابی ہے

عجب وو موکمر خورشید رو ہے
نزاکت جس کے قد میں موبمو ہے

تیری آنکھوں میں کیا بلا لے ہے
ہوش کھونے کوں نشہ مے ہے

خودی ہے کفر اگر ہم اٹھیں تو یہ جاوے
ہمارے بعد خودی جانے یا خدا جانے

محبت کے نشے ہیں خاص انساں واسطے ورنہ
فرشتے یہ شرابیں پی کے مستانے ہوئے ہوتے

دل مرا بے قرار ہوتا ہے
بسمل انتظار ہوتا ہے

آہ میری ہے صور اسرافیل
جل گئے جس سبب پر جبریل

جو ہوا ہے شہید خنجر یار
کعبۂ عشق کا ہے اسماعیل

سراج یوں مجھے استاد مہرباں نے کہا
کہ علم عشق سیں بہتر نہیں ہے اور علوم

اگر خواہش ہے تجکو اے سراؔج آزاد ہونے کی
کمند عقل کوں ہرگز گلے کا ہار مت کیجو

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سراج ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ان کے کلام میں بلا کی روانی ہے۔ان اشعار کو پڑھتے وقت ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ ہم ولؔی کے فوراً بعد کی شاعری کا مطالعہ کرر ہے ہیں۔اسلوب بیان اس قدر سلیس اور سادہ ہے کہ لگتا ہے کہ ہم آج کے شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ فکری اور فنی دونوں اعتبار سے سراؔج کی غزلوں کے اشعار بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔سراؔج صرف ولؔی کی روایت کے امین ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی اپنی ایک شناخت بھی ہے۔اس اعتبار سے سراج بڑے شاعروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔انہوں نے میرؔ، دردؔ، سوداؔو غیرہ کو بھی متاثر کیا ہے۔اس لئے سراج اردو کلاسیکی غزل میں اہم ہیں۔

سراج کے بعد بھی شاعروں کی ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے جنہوں نے زلف غزل کو سنوارنے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔بعض اب تک کی کلاسیکی غزل گوئی کی روایت میں صف اوّل کے شعراء ہیں کچھ دوئم درجہ رکھتے ہیں بعض کی حیثیت صرف روایتی ہے۔ان میں میر تقی میرؔ، میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر حسنؔ، مرزا مظہر جان جاناں، میر عبدالحئی تاباں، نواب انعام اللہ خاں یقیںؔ، میر اثرؔ، میر سوزؔ، آنند مخلصؔ، قائمؔ چاند پوری، مرزا جعفر علی حسرتؔ، نظیؔر اکبر آبادی، غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشاءاللہ خاں انشاؔء، راسخؔ عظیم آبادی، مرزا غالبؔ، ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، حکیم مومن خان مومنؔ، مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، پنڈت دیاشنکر نسیمؔ، داغؔ دہلوی، اکبرؔ الہ آبادی، اور انیسؔ و دبیرؔ وغیرہم کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ان شعراء کرام کی لمبی فہرست سے اب صرف چند شعراء کا جائزہ لینا ممکن ہے تمام شعراء کا جائزہ مقالہ کی طوالت کا باعث ہوگا اس لئے بیشتر سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ عرض کرنا

چاہتاہوں کہ ولی دکنی کی شاعری اورغزل گوئی کی پیروی میں بیشتر شعراء ایہام گوئی کی طرف راغب ہو گئے جو اس دور کی ضرورت اور حالات کے موافق تھا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز الحق کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''دیوان ولی سے متاثر ہو کر جن لوگوں نے اپنی شاعری کی بنیاد ایہام گوئی پر رکھی ان میں آبرو، مضمون، ناجی، حاتم، یک رنگ وغیرہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ ایہام گوئی ولی کی بنیادی خصوصیت نہیں جب کہ ان حضرات نے ولی کو اپنا آدرش مانا ہے اور انہیں کے تتبع میں ایہام گوئی کو اپنایا ہے۔دراصل ولی ایک بڑا شاعر تھا اور ہر بڑے شاعر کی طرح ولی کے کلام میں بھی مختلف رنگ ابھرتے ہیں۔قاری اپنی طبیعت کے مطابق ان تمام رنگوں میں سے کوئی ایک رنگ اپنا لیتا ہے۔ایہام گو شعراء نے یہی کیا۔رفتہ رفتہ ایہام گوئی نے اتنی ترقی کی اور اس درجہ مقبولیت حاصل کی کہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ایہام گوئی کی ترقی کا صرف یہی ایک سبب نہیں بلکہ سماجی عوامل نے بھی اس طرز کو مقبول بنانے میں بڑی مدد دی۔''

(اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، مصنفہ ڈاکٹر ممتاز الحق، ص۱۰۲)

اس طرح کلاسیکی غزل گوئی میں ایہام گو شعراء نے دو معنی والے اشعار کہے اور ظاہر داری پر توجہ دی۔اس روایت کے نمائندہ شاعر شاہ محمد مبارک آبرو (۱۶۸۴ء - ۱۷۳۳ء) ہیں۔لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ان کے کلام میں سچے اور پرخلوص جذبات وتصورات رقم نہیں ہوئے ہیں۔ان کی شاعری میں صنعت گری ایک خصوصیت کی طرح نظر آتی ہے اور یہ صنعت گری دل کو متاثر بھی کرتی ہے۔انہوں نے غزلوں میں ہندی الفاظ، ہندی آداب ورسوم اردو کے ساتھ برتتے ہیں۔ان کے کلام میں جمالیاتی پہلو نہایت واضح نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''اور انہیں (آبرو) خوبصورت چیزوں سے محبت ہے۔خوبرویوں کے

قدرتی حسن و جمال کے علاوہ وہ اس میں خوش پوشی اور بناؤ سنگار شامل ہے۔ جس میں آبرو نے ایک مثنوی لکھ کر اس زمانے کی پوشاک، سج دھج اور بانکپن کی تصویر کشی کی ہے۔"

(تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان، ساتویں جلد مصنفہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۷۲)

نمونتاً چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

غزالاں، آبرو کر چاک دل مدت سوں نکلا ہے
کہو کیا حال ہے دشت جنوں میں اس دوانے کا

ملنے کے شوق میں ہم گھر بار سب گنوایا
مدت میں گھر ہمارے آیا تو گھر نہ پایا

جو دکھ پڑے گا سہا کروں گی، جیسے کہو گے رہا کروں گی
تمن کونس دن دعا کروں گی، سکھی سلامت رہو خدایا

رکھے نہ دل میں کہی کی چنتا، گلے میں ڈالے برہ کی کنٹھا
درس کی خاطر تمہارے سننا بھکارن اپنا برن بنایا

رقیباں کے ستم دل میں کیے برداشت تب جانا
کہ دیوانہ بھی اپنے کام میں ہشیار ہوتا ہے

آبرو کی طرح شاکر ناجی بھی اس روایت میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی اخلاقی مضامین

ملتے ہیں۔ان کے یہاں عصری حیثیت نمایاں ہے۔ ان کے یہاں رکاکت اور ابتذال بھی ہے، ان کے کلام میں روانی اور بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔مگر خلوص کی کمی صاف نظر آتی ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

دیکھ بلبل پہ گردشِ افلاک
گل نے اپنا کیا گریباں چاک

لگے سے گل کے چونکے کب ہو مدوش
قیامت اس بجمن کو گد گدی ہے

جب دہن اور وہ کمر یاد آوتی ہے یار کی
عقل گم ہووے ہے کیفیت ہے اس کی گومگو

اس روایت کے علم بردار شیخ شرف الدین مضمونؔ بھی ہیں۔ یہ کم گو شاعر ہیں لیکن خوش فکر ہیں ایہام گوئی کے باوجود ان کے کلام میں روانی اور بے ساختگی کا رنگ جھلکتا ہے۔انہیں اپنی ایہام گوئی پرناز ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

ہوا ہے جگ میں مضمون تیرا شہرہ
طرح ایہام کی جب سے نکالی

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

اس دور میں تمام شعراء ایہام گوئی کی روایت کے علم بردار نہیں تھے کچھ شعراء اس تحریک سے الگ اپنے مزاج کے اعتبار سے شاعری کو الگ ڈگر پر لے جا رہے تھے۔ ایسے شعرا پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سراج اورنگ آبادی، قاسم، داؤد شاہ تراب، اشرف گجراتی، عزلت سورتی، فائز دہلوی، مبتلا، محمود صابر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں ایک طرف ایہام گوئی کی روایت پروان چڑھ رہی تھی تو اس روایت یا تحریک کے ردِعمل میں نیا رنگ اور نئے مزاج کی شاعری وجود میں آنے کی طرف کوشاں تھی۔ اس ردعمل میں سب سے نمایاں نام حاتم کا ہے۔ حاتم نے اپنی طرز شاعری سے زمانے کو متاثر کیا اور ان کے ساتھ ان کے شاگردوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی، مرزا حاتم کے شاگردوں میں یقین و تاباں، دردمند اور خزیں اس میں پیش پیش رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز الحق کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''اس تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں بڑی وسعت آگئی۔ فارسی شاعری کے مختلف اصناف موضوعات اور اسالیب اردو میں تیزی سے برتے جانے لگے۔ عشقیہ موضوعات، تصوف کے مسائل، اخلاقی مضامین، خمریات غرض کہ فارسی شاعری کی بدولت اردو کو ایک بڑا وسیع میدان بیک وقت ہاتھ آ گیا۔ ساتھ ہی ان موضوعات و مسائل کے اظہار کے لئے بنے بنائے سانچے، زبان، تراکیب، تشبیہات، استعارات، علامات بھی مل گئے جس کی وجہ سے اردو شاعری نے بڑی تیزی سے ترقی کے مدارج طے کر لئے۔ اس تحریک نے بیک وقت دو سطح پر کام کیا ایک تو اصلی اور سچی شاعری پر زور دیا اور دوسری طرف زبان کی اصلاح کی۔ زبان کی اصلاح کے سلسلے میں انتہا پسند رویے کی وجہ سے اردو زبان و شاعری کو کچھ نقصانات بھی ہوئے۔''
>
> (اردو میں غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، مصنفہ ڈاکٹر ممتاز الحق، ص ۱۰۸)

ایہام گوئی کے ردعمل میں جو تحریک پروان چڑھی اس تحریک کے نمایاں شاعر مظہر جان جاناں (۱۶۹۸ء۔

۱۷۸۱ء) ہیں۔ انہوں نے اس دور کی شاعری کو کئی صورتوں میں متاثر کیا۔ ابتدائی دنوں میں آبرو کی پیروی کی لیکن بعد میں الگ راہ اختیار کی۔ انہوں نے سچی اور حقیقی شاعری کی ۔ انہوں نے ایہام گوئی کے خلاف آواز بلند کی۔انہوں نے شاعروں کو ایہام گوئی کے اثرات سے نجات دلانے کی کوشش کی ۔خود بھی نئی راہ کی طرف پیش رفت کی اور دوسروں کو بھی نئی راہ دکھائی ۔ زبان کی صفائی پر دوسروں کو مجبور کیا۔خود ان کی زبان بھی صاف اور سادہ ہے۔ یہ تکرار الفاظ سے شعر میں لطف واثر پیدا کرتے ہیں۔اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے

کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

مظہر جان جاناں کی غزل گوئی عشق حقیقی کے جذبات سے بھری پڑی ہے۔دو اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے

اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

سجن کس کس مزہ سے آج دیکھا مجھ طرف یارو

اشارت کر کے دیکھا ہنس کے دیکھا مسکرا دیکھا

میر تقی میرؔ اس دور کے صدر نمائندہ غزل گو شاعر ہیں۔ان کی غزل گوئی تمام غزل گو شعراء میں اعلیٰ وارفع مقام ومرتبہ رکھتی ہے۔انہیں شہنشاہ غزل بھی کہا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں رنج والم کی ایک دنیا آباد ہے۔ان کی غزلوں میں تغزل ہے۔انہوں نے غم جاناں کو غم دوراں بنا دیا ہے۔ان کی شاعری کا محور بھی عشق ہی ہے۔میرؔ نے اردو غزل گوئی کو اس درجہ اعلیٰ کر دیا کہ آج تک اس سے آگے کوئی شاعر نہ جا سکا۔تمام شاعروں نے عشق کو ہی اپنا موضوع سخن بنایا لیکن میرؔ کا عشق زمانے کا عشق، میرؔ کا درد زمانے کا درد ہو گیا۔میرؔ نے اپنے کلام میں رنج والم کی وہ

چاشنی بھر دی کہ اس کا ذائقہ تمام عام لوگوں کی زبان عشق کا ذائقہ بن گیا۔ انہوں نے کلاسیکی غزل گوئی کو مستحکم بنایا ہے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں :

''تاریخ ادبیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری کسی کلاسیکی زبان وادب کی بنیاد پر کھڑی ہو کر فروغ پاتی ہے۔ اردو شاعری کے لئے کلاسیکی شاعری فارسی زبان کی شاعری تھی۔ میرؔ نے فارسی شاعری کی روایت کو اپنایا لیکن اردو زبان کو فارسی زبان کا تابع نہیں بنایا۔ میرؔ کے ہاں اس سطح پر ایک ایسا توازن ملتا ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع ہم اپنی زبان کی شاعری پڑھ رہے ہیں۔ جسے ہم بولتے اور سنتے ہیں۔ شاعری میں بول چال کی زبان کے استعمال سے ہی طرز میرؔ پیدا ہوا جو ایک ایسا طرز ہے۔ جس میں گہرا اثر بھی ہے اور محبوبیت کی وہ خصوصیت بھی ہے۔ جس نے میرؔ کی شاعری کو خاص و عام دونوں میں مقبول بنادیا............ یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنے ابتدائی دور ہی میں بہ طور میسّر آگیا۔ یہ ایک ایسا طرز ہے۔ جو بظاہر آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شاعری کرنا آسان نہیں۔''

(تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول: جمیل جالبی ص ۵۹۴)

میرؔ نے اردو کلاسیکی غزل گوئی کو ایک وقار و معیار عطا کیا ہے ان کی غزل گوئی تمام عالم ادبیات اردو میں افضلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے غزل کے صنف کو معتبر اور مقبول عام کیا ہے۔ ان کی غزلوں کے ایک ایک لفظ کرب وغم کی ایک داستان بیان کرتے ہیں۔ خصوصاً ان کی غزل گوئی لاجواب اور بے مثال نظر آتی ہے۔ دوسو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے مدمقابل کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا یا ان کے قریب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر دور میں ان کی اہمیت اور مقبولیت رہی ہے۔ اس سلسلے میں وہاب اشرفی کے دو جملے ملاحظہ فرمائیں :

''میر تقی میرؔ کی شاعرانہ عظمت و سربلندی کی کبھی کسی زمانہ یا کسی عہد میں حرف گیری نہیں کی گئی۔ ہر عہد میں انہیں مسلم الثبوت استاد مانا گیا۔ ان کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کی جاتی رہی۔''

(تاریخ ادب اردو جلد اول: وہاب اشرفی، ص ۲۲۴)

اب مناسب ہے کہ میر تقی میرؔ کے چند اشعار نموناً پیش کر دیے جائیں جس سے ان کی غزل گوئی کے جملہ اوصاف بروئے کار آجائیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

آتش تیز جدائی میں یکایک اس بن
دل جلایوں کہ تنک جی جلایا نہ گیا

آگ سی اک دل میں سلگے ہے کہ جو بھڑکی میرؔ
دیگی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

دور بیٹھا غبار میراں سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میرؔ نے غزل کے علاوہ بیشتر شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن ان کا فطری میلان غزل گوئی کی طرف ہے۔تمام اصناف سخن میں انہوں نے اپنا منفرد رنگ امتیاز برقرار رکھا ہے۔ان کی شاعری کلاسیکی ادب کی گراں مایہ دولت تصور کی جاتی ہے۔

اس دور کے ایک معتبر قصیدہ گو شاعر مرزا محمد رفیع سودا(۱۷۰۶ء - ۱۷۸۱ء) ہیں۔قصیدہ گوئی میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں ہے لیکن انہوں نے غزل گوئی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی غزل گوئی کے ذریعہ اردو کلاسیکی غزل کی روایت کو اعلیٰ معیار و وقار عطا کیا ہے۔ان کی شخصیت پہلو دار رہی ہے۔انہوں نے کسی بھی صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہو لیکن کلاسیکی ادب کا معیار ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔اسی لئے بیشتر ناقدوں نے ان کی غزل گوئی کو میرؔ کی غزل گوئی سے موازنہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔لیکن میری اپنی رائے یہ ہے کہ دونوں کا موازنہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔غزل میں میرؔ کا کوئی ثانی نہیں ہے اور قصیدہ میں سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔اس سلسلے میں جمیل جالبی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''غزل میں بھی سوداؔ کا اپنا مخصوص دائرہ ہے۔جس میں وہ ایک بڑے غزل گو

نظر آتے ہیں۔ میرؔ نے غزل کا جو مخصوص مزاج بنایا تھا وہی غزل کا مزاج بن گیا تھا۔ سوداؔ نے غزل میں باہر کی دنیا سے تعلق پیدا کر کے اسے قصیدے کی طرح ایک نئی وسعت اور تنوع دیا جس سے غزل میں ہمہ گیری پیدا ہوگئی اور صنف سخن پر ان کے مزاج قصیدہ کی چھاپ نمایاں ہے۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم)، مصنفہ جمیل جالبی، ص ۶۷۴)

سوداؔ کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی کہ سوداؔ نے قصیدہ کی طرح غزلوں میں بھی فارسی غزل گو شاعر کے کلام کو سامنے میں رکھ کر ان اشعار کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ سوداؔ اپنی شاعری میں کلام کی صفائی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہاں وہ اس عمل میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اسی لئے وہ خود کو سخن تراش بھی کہتے ہیں۔ سوداؔ کی غزلوں میں مضامین، علامت، تصور حسن وعشق، تشبیہ واستعارات، صنائع بدائع اور معیار شاعری پوری طرح وہی ہے۔ جو فارسی شاعری کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے اپنی قادر الکلامی سے تمام فارسی مضامین کو اردو کے اشعار میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ وہ ان کے اپنے ہو گئے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوداؔ کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کر دئے جائیں تا کہ ان کی غزل گوئی میں فکری اور فنی دونوں پہلو آشکار ہو جائیں۔

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سوداؔ بیاں
شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

رازِ دیر و حرم افشانہ کریں ہم ہر گز
ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر

عمامے کو اُتار کر پڑھیو نماز شیخ
سجدے میں ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا

طبیعت سے فرومایہ کی شعر تر نہیں ہوتا
جو آبِ چاہ کا قطرہ ہے وہ گوہر نہیں ہوتا

سوؔدا شراب عشق نہ کہتے تھے ہم نہ پی
پایا مزہ نہ تونے اب اس کے خمار کا

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو اِک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

اسی دور کے ایک اور بڑے شاعر خواجہ میر دردؔ (۱۷۲۰ء - ۱۷۸۵ء) ہیں۔انہوں نے اردو کلاسیکی غزل کو ایک بلند معیار و وقار عطا کیا ہے۔ دردؔ نے دیگر اصناف شعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل گوئی ان کا مخصوص پیرایۂ اظہار ہے۔ وہ بنیادی طور پر سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک صوفی شاعر ہیں۔ وہ شاعری دل بستگی کے لئے نہیں کرتے ہیں بلکہ شاعری کو ایک قسم کی عبادت تصور کرتے ہیں۔اس سلسلے میں جمیل جالبی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''دردؔ کی شاعری ایسے پُر اثر انداز میں صوفیانہ تصورات کا اظہار کرتی ہے کہ درد اور تصوف ایک ہوجاتے ہیں اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ان اشعار میں اگر ہمیں اثر وتاثیر کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ناواقفیت کی بنا پر، تصوف کے اشارے ہم سے ابلاغ نہیں کرتے ورنہ یہ وہ اشعار ہیں

جن پر اہلِ تصوف اپنے جذبات وواردات کی ترجمانی دیکھ کر سر دھنتے ہیں۔

ان اشعار کا مقابلہ ولی، مظہر، اور میر وسودا کے اس نوع کے اشعار سے کیجئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک ایسی شاعری ہے جو اس سے پہلے اردو میں نہیں ہوئی اور اس سطح پر کوئی دوسرا شاعر میر درد کو نہیں پہنچا۔

اسی صوفیانہ انداز نظر سے درد کے ہاں عظمت انساں کا تصور پیدا ہوتا ہے جو طرح طرح سے ان کی شاعری میں ابھرتا ہے۔ عظمت انساں درد کی فکر کا بنیادی تصور ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو آگے چل کر غالب اور اقبال کی شاعری میں جلوہ گر ہوا۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم) مصنفہ جمیل جالبی، ص ۷۴۹)

درد کی غزل گوئی عشق حقیقی کی داستان ہے۔ ان کا عشق خالق کائنات سے منسوب ہے۔ لیکن ان کی غزلوں میں کچھ اشعار عشق مجازی کی طرف بھی منسوب نظر آتے ہیں لیکن ان کی حالات زندگی سے اس بات کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا اظہار ہے لیکن میر کی طرح نہیں ہے۔ اس طرح میر درد کی شاعری میں دو، رُخ نظر آتے ہیں ایک عشق حقیقی اور دوسرا عشق مجازی۔ بہر طور ہمیں یہاں ان کی غزل گوئی کا جائزہ مقصود ہے۔ جو صرف کلاسیکی غزل کے دائرے تک محدود ہے۔ اس میں موضوعات سے بحث بے جا ہوگی۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں سے عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں طرح کے اشعار نموتاً نقل کردوں تا کہ ان کی غزل گوئی کلاسیکی ادب میں کس درجہ کی ہے یہ بروئے کار آجائے۔

متفق آپس میں ہیں اہلِ شہود
درد آنکھیں دیکھ باہم ایک ہیں

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں
دردؔ اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

باوجود یکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

عشق مجازی سے نسبت رکھنے والے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دل تجھے کیوں ہے بے کلی ایسی
کون دیکھی ہے اچپلی ایسی

خون ہوتا ہے دل کا یاں آؤ
مہدی پاؤں میں ملی ایسی

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

قصہ زلف یار کیا کہیے
ہے دراز اور عمر ہے کوتاہ

دشمنی میں سنا نہ ہووے گا
جو ہمیں دوستی نے دکھلائی

ہم نہ کہتے تھے منھ نہ چڑھ اس کے
درؔد کچھ عشق کا مزا پایا

میر درؔد نے اردو میں بھی بہت کم کلام چھوڑے ہیں۔ جو بھی کلام دیوان دردؔ میں دستیاب ہیں ان میں بیشتر غزلیں ہیں۔ غزلوں کے بعد سب سے زیادہ رباعیوں کی تعداد ۲۷ رہے۔ ان کی رباعیاں غزلوں سے زیادہ واضح ہیں۔ اس لئے کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ وہ غزلوں کی طرح رباعی کے بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے بھی اردو کلاسیک غزل گوئی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دردؔ غزل گوئی کے ایک لاسیکل شاعر ہیں۔

قائم چاند پوری، میر سوزؔ، میر اثرؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ وغیرہ بھی اس قبیل کے شاعر ہیں تمام شعراء نے کلاسیکل غزل گوئی کی روایت کو پروان چڑھایا ہے۔ مقالہ کی طوالت کے مدِ نظر تمام شعراء کا خصوصی جائزہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے آخر میں متفرق شعراء کی غزلوں سے دو دو اشعار نقل کر رہا ہوں تا کہ کلاسیکی غزل گوئی کی روایت کا ایک خاکہ مرتب ہو سکے اور مقالے کے ساتھ انصاف ہو۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

گہہ کوئی صبح ، گاہ شام ہوئی
عمر انہیں قصوں میں تمام ہوئی
(قائم چاند پوری)

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

رسوا ہوا، خراب ہوا، مبتلا ہوا
وہ کون سی گھڑی تھی کہ تجھ سے جدا ہوا
(میر سوز)

تیرے آنے کا احتمال رہا
مرتے مرتے یہی خیال رہا

صاف کہہ دیجئے مختصر اتنا
آیئے گا کہ بس نہ آیئے گا
(میر اثر)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی

رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بُری سنائی

(ابراہیم ذوقؔ)

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(غالبؔ)

باب دوم

مومنؔ کی غزلوں کی عصری معنویت

Momin's Ghazals as analysed until now

مومنؔ کی غزلوں کی عصری معنویت

مومنؔ خصوصاً غزلوں کے حوالے سے اردو کلاسیکی ادب میں اہم مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔انہیں جوشہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ سب ان کی غزل گوئی کی بدولت ہے، عصر حاضر میں بھی ان کے اشعار اپنی اہمیت اور معنویت برقرار رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کے تخلیق ہوئے تقریباً دوسوسال ہو گئے لیکن یہ آج بھی قارئین و ناقدین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ان کے کلام کی اہمیت و افادیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔مومنؔ نے غزلوں کے علاوہ نظمیں، قصیدے، مرثیے، واسوخت رباعیاں، معمے اور دیگر اصناف شاعری میں اپنی جولان طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔جن سے ان کی قادرالکلامی اور زود گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔لیکن اس باب میں صرف مومنؔ کی غزلوں کا جائزہ عصری تناظر میں لیا جائے گا جس سے ان کی شاعرانہ عظمت خصوصاً غزل گوئی میں مقام ومرتبہ اور عصری معنویت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مومنؔ نے جب آنکھیں کھولیں اس وقت برصغیر کا سیاسی صورت حال ناگفتہ بہہ تھا۔حکومت کے لئے خون ریزی عام تھی۔امراءورؤساء اپنی اپنی حکمت علمی میں مصروف تھے۔غریبوں کا کوئی یارومددگار نہ تھا۔انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنا قدم جمانے کے لئے اپنی پیش رفت تیز کردی تھی۔اس سلسلے میں صلاح الدین ندیم کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ’’مومنؔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۲ء میں فوت ہوگیا۔اس کی زندگی کے یہ باون سال ایک ایسے ماضی کے پیدا کردہ تھے جو برصغیر میں بہت بڑی تبدیلی لا رہا تھا۔مثلاً مومنؔ کی پیدائش تک دہلی کے تحت پر ایک دوسرے کے

بعد کوئی نو بادشاہ بیٹھے۔ ان بادشاہوں کا یہ حال تھا کہ ان میں سے کسی کی آنکھیں پھوڑ دی گئی تھیں اور کسی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ مرہٹوں اور جاٹوں نے سارے ملک کو تاخت و تاراج کر دیا۔ نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے حکموں نے تباہی و بربادی پھیلا دی۔ کسی شخص کا جان و مال اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ امراء تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ غرباء کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ اس افرا تفری کا فائدہ سکھوں اور انگریزوں نے اٹھایا۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ انگریزوں نے بنگال اور اڑیسہ پر قبضہ کر لیا اور سرنگا پٹنم میں سلطان ٹیپو کو شہید کر کے میسور پر اپنی حاکمیت قائم کر لی اور پھر دہلی سے مرہٹوں کو نکال کر مغلیہ حکمرانوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ گویا برصغیر پاک و ہند پر غیر ملکی قوم کے بڑھتے ہوئے تسلط اور ملکی حالات کی اس ابتری سے مومؔن کے زمانے نے جنم لیا تھا اور خود مومؔن کی زندگی کے باون سالوں میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا اور رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح سارے برصغیر پر انگریزوں کی حاکمیت قائم ہوگئی اور یہ واقعہ کسی بھی قوم کے لئے ایک بہت بڑے سانحہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کا اثر مومؔن پر اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ اس نے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ معاشقوں میں اپنا وقت صرف کیا اور اسی کو اپنا شعری موضوع بھی بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اعتبار سے اس کا فن اس کے ذاتی شعری تجربے کا سچا اظہار ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا معنوی کینوس بہت محدود ہے۔

مومؔن کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کے علاوہ جب ہم اس

کے عہد کی تہذیبی اور ثقافتی فضا کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اتنے بڑے ملکی انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کے پیدا کردہ مصائب کو ساری دنیا کے ساتھ اپنی جان پر جھیلنے والے ان فنکاروں میں بیشتر کا حال یہ تھا کہ عاشق، معشوق اور رقیب کے چکّر میں پڑے ہوتے تھے اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ ایسے فنکار تھے کہ زمانے کی پھیلتی ہوئی آگ نے انہیں اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ اپنی ذات سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہ کر سکے یا کیا وہ اس قدر بے حس تھے کہ اس دہکتے ہوئے جہنم کی آگ کو محسوس نہ کر سکے۔''

(مطالعہ مومن: مضمون نگار صلاح الدین ندیم، مرتبہ: ساحل احمد، ص ۱۰۱۔۱۰۰)

مومنؔ کے اس مطالعہ کو اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔لیکن میری نظر میں مومنؔ اپنے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی وثقافتی تبدیلیوں سے بے بہرہ نہیں تھے۔ان کے شخصیت کی آبیاری اسی ماحول میں ہوئی تھی لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان حالات کا مومنؔ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تبدیلیوں سے مومنؔ بھی متاثر ہوئے اور ان کے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ زندگی کے معیار واقدار بدل رہے ہیں اور ادب کے اقدار و معیار میں بھی تبدیلی اشد ضروری ہے۔اسی حالات کی پیداوار مومنؔ کی شاعری ہے جو شاعری کو حقیقت کے رنگ سے رنگین کرنے کی کوشش ہے اور یہی حقیقت کا رنگ ان کی شاعری کا امتیاز وانفراد قائم کرتا ہے۔ورنہ جو شاعری کی روش عام تھی اس سے ہٹ کر مومنؔ شاعری کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔اس سلسلے میں داکٹر عبادت بریلوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔جس سے میرے ان خیالوں کی تائید ہوگی :

''مومنؔ اپنے زمانے کے مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔ماحول نے ان کی شخصیت اور فن کی آبیاری میں بڑا حصہ لیا ہے۔انیسویں صدی کی دلّی جو بقول حالؔی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی یاد دلاتی تھی۔مومنؔ نے اسی کی آغوش میں آنکھ کھولی۔اس لئے اس ماحول کی تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں

سمٹ کر یکجا ہو گئیں۔ ہر چند کہ اس زمانے میں مغلوں کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا۔ اور سیاسی اعتبار سے اس زمانے کی زندگی ایک ایسے سیاسی انحطاط و زوال اور سماجی انتشار و افراتفری سے دوچار تھی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ اس کا سلسلہ یوں تو اورنگ زیب، عالم گیر کی وفات ہی کے وقت شروع ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک آتے آتے ان حالات نے بدترین صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں زندگی کے مختلف شعبے ایک نئی زندگی سے دوچار ہو رہے تھے۔ سیاسی اعتبار سے طاقت ختم ہو چکی تھی لیکن اس زمانے میں سیاسی شعور ضرور پیدا ہونے لگا تھا۔ بعض افراد اس کی اہمیت کو محسوس ضرور کرنے لگے تھے۔ سیاسی اعتبار سے زندگی کو بدلنے اور اس کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی تمنا جاگنے ضرور لگی تھی۔ معاشرتی بدحالی پر لوگ کُڑھنے لگے تھے۔ اور معاشرتی زندگی کو نئے شیشے میں اتارنے کا خیال پھیلنے لگا تھا۔ مذہب اور مذہبی تصورات کو نئے حالات سے مطابق کرنے اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کے خیالات نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اور یہ بدلتے ہوئے صرف جذبات اور جذباتیت ہی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان میں عقل و شعور کو بھی خاصا دخل تھا۔ اسی لئے اس زمانے میں ایک علمی فضا بھی پیدا ہو گئی تھی۔ سیاست، مذہب، تہذیب، معاشرت اور ان سے متعلق بے شمار موضوعات پر اس زمانہ میں علمی بحثوں کا سلسلہ جاری تھا۔ تہذیبی اور معاشرتی شعور کی وجہ سے ادب و شعر کی طرف بھی صحت مندانہ دلچسپی عام ہو رہی تھی۔ اب ادب محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں رہا تھا۔ شاعری صرف بیکاری کا مشغلہ نہیں رہ گئی تھی۔ اب اس کو

زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے تصورات عام ہو رہے تھے۔ غرض زمانے کی
اس تبدیلی نے زندگی کو ایک نئی منزل اور حالات کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کر
دیا تھا۔ مومن اسی زندگی کی پیداوار ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن زندگی میں اسی
منزل کا عکس اور حالات کے اسی موڑ کا پرتو نظر آتا ہے۔''

(کلیات مومن۔ مقدمہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۷/۹)

چونکہ مومن ایک انسان تھے اور شاعر بھی تھے۔ اس لئے انسان اپنے تہذیب و معاشرت، ماحول، سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر کا دل بھی رکھتے تھے۔ شاعر حساس ہوتا ہے اور اسے واقعات و حادثات کی تمام باتیں زیادہ اثر کرتی ہیں۔ اور ان تمام صورت حال کا پرتو ان کی شاعری پر بالواسطہ طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی میں عصری حسیت کا سوال ہے۔ تو اس صنف میں عصری حسیت کی نشاندہی نہایت دشوار ہوتی ہے لیکن عصری حسیت غزلوں کے حوالے سے اشارے کنائے میں درج ہوتے ہیں۔ اور تفصیل کے ساتھ اس صنف میں واقعات کا درج ہونا ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں صلاح الدین ندیم کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ''غزل'' کے ذریعہ سیاسی اور سماجی
حالات اور ان کے ساتھ فن کار کی وابستگی کا اعلان تو ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ
ایک ایسی صنف ہے جس کے مزاج میں عمومیت ہے۔ اس لئے اس میں تمام
عناصر عمومی شعری حقیقت کے روپ میں ڈھل کر شامل ہو جاتے ہیں اور ہم
اس کے واسطے سے فن کار کے زمانے تک اس طرح پہونچتے ہیں کہ اجتماعی
زندگی کے عمومی رخ کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ
تقاضا تو نہیں کیا جا سکتا کہ ''غزل'' ہمیں زمانے کی تخصیصی حالات سے آگاہ
اور ان کے ساتھ فن کار کی جو وابستگی ہے ان کا کھلا اظہار کرے۔ لیکن اس امر

سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کی غیر واضح وابستگی سے زمانے کے اعتبار فن اور فن کار خلاء میں معلق نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس نظم ایک ایسا وسیلہ اظہار ہے جس سے ہم کسی بھی عہد کے تخصیصی حالات سے روشناس ہو سکتے ہیں اور ان حالات سے نبرد آزما فن کاروں کے عصری شعور کا سراغ لگا سکتے ہیں اور یوں ان کی اپنے زمانے کے ساتھ جو وابستگی ہوتی ہے اس کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں اور پھر یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جو زمانے کے تخصیصی اور عمومی پہلوؤں کو ملا کر بڑی خوبی سے فنی تکمیل کا فریضہ ادا کر سکتی ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں مومن کے قریبی ماضی اور ہم عصر فن کاروں کے کلام کا جائزہ لیں تو ان کی بہترین شاعری ہمیں ملے گی۔ لیکن بہترین فن پارے ہونے کے باوجود ان غزلوں کے مطالعے کے دوران جو زمانے کے اعتبار سے ہمیں معلق رہنے کا احساس ذہن میں ضرور رہتا ہے اور ان کے مقابلے میں اگر ان فنکاروں کو ان کی نظموں کے ذریعے پرکھیں تو اس میں یہی نقص نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بھی ایسا فن کار نہیں ہے جو زمانے کی اہمیت کو محسوس کرتا اور تخصیصی اور عمومی زمانے کو ملا کر ایک ایسے فنی پیکر کو تراشنے کی اہمیت رکھتا ہے اس کے فنی عمل کی مکمل تصویر کشی کر سکے۔"

(مطالعہ مومن مضمون نگار صلاح الدین ندیم، مرتب ساحل احمد ص ۱۰۲۔۱۰۳)

مومن کی غزلوں کے علاوہ اگر ہم ان کے قصیدے، مثنویاں اور مرثیے کا مطالعہ کریں گے تو ان میں عصری معنویت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔

مومن نے جس دور میں شاعری کی وہ دور کلاسیکی ادب سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اردو غزل گوئی میں کلاسیکی ادب کس قدر منزل بہ منزل ترقی کی راہ ہموار کرتا ہوا مومن تک پہنچتا ہے۔ اس کا ایک خصوصی جائزہ باب اوّل میں لیا جاچکا ہے۔ اب اس باب میں مومن کی غزل گوئی کلاسیکی ادب کی آخری دور میں نظر آتی ہے۔ مومن نے اپنی غزلوں میں کلاسیکی روایت کی پاسداری رکھتے ہوئے اختراعی رجحانات کو اپنے کلام میں سمویا ہے۔ مومن سے پہلے غزل اپنے روایتی انداز میں پیش کی جاتی رہی ہے۔ لیکن مومن نے اس کی معنویت میں وسعت پیدا کی اور اس کو حقیقت سے روشناس کرایا۔ اس سلسلے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے نہایت قابلِ غور بات کہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومن نے تغزل میں سچائی کا رنگ پیدا کر کے اس کو رسمی اور روایتی قیدوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہے اور اپنی نکتہ یابی، نازک خیالی اور شوخی ادا سے اسے تیر نیم کش بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں پردہ چلمن روایت ہی نہیں حقیقت بھی ہیں۔ انہوں نے غزل کی فرسودہ روایت پر اپنی انفرادیت کا رنگ چڑھا کر پرانی قدروں کو نئی صورت دی ہے اور غالباً اردو میں پہلی دفعہ عشق پردہ نشیں کا ذکر ہنر مندانہ توازن اور تحت الشعوری کو واقعیت کے ساتھ کر کے مواد وہیئت کی دوئی مٹادی۔''

(نگار (پاکستان) خواجہ احمد فاروقی ص ؟)

ظاہر ہے مومن نے جس نئے انداز وفکر کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا وہ کسی قدر نئی نوعیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں عشق ومحبت کی تمام وارداتوں کا ذکر ہے لیکن وہ خیالی اور تصوراتی محبوب کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس عورت کے متعلق ہے جس کا وجود زمین پر ہے اور وہ گوشت پوشت والی ہے۔ یعنی عشق مجازی ہوتے ہوئے بھی حقیقت اور واقعیت کا احساس دلاتا ہے۔ اسی انداز وفکر نے مومن کی غزلوں کو انفراد وامتیاز کے رنگ سے رنگین کیا ہے۔ جو روایت کی پاسدار بھی ہے اور اختراعی نوعیت کی حامل بھی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک کتاب

''دہلی کے یادگار مشاعرے'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ جس سے مومن کی مقبولیت کا احساس ہوتا ہے :

''ریختے کے استاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انہوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا، سنبھل کر بیٹھے بالوں میں انگیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور دردانگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہے نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کریں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں کہ یہ تو باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

للہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومنؔ چلا ہے کعبے اِک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھا، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کو مزہ لے رہے تھے۔ جس شعر پر ان کو زیادہ لطف آتا تھا۔ اس کے پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں بل دیکر چلنے لگتیں تھیں بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو انگلیوں میں بل دیکر موڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر مسکرا دئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت ہلاتے تھے۔ اور ہلاتے بھی کیسے کہ بالوں سے کب فرصت تھی، ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کرتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی، سن کر مسکرائے اور کہا آپ لوگوں کی یہی عنایت ہماری محنت کا صلہ ہے میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ
تحسین سخن فہم، ہے مومنؔ صلہ اپنا

مومن کی غزلیں اپنے عہد کی ایک نئی آواز تھی ۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ مومن کے ہم عصر غالب، ذوق، مصحفی، ظفر وغیرہ بھی تھے۔لیکن مومن نے جو راہ اختیار کی اس کے وہ تنہا مسافر نظر آتے ہیں۔مومن نے اپنی شاعری میں جو تبدیلیاں کیں وہ عصری میلانات ور جحانات کا نتیجہ تھے۔ چونکہ شاعر جس دور میں جیتا ہے اس دور کے تمام سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی اثرات سے شاعر کی شخصیت مرتب ہوتی ہے۔اور شاعر کی شخصیت کا پرتو اس کے کلام میں نظر آتا ہے۔اس اس سلسلے میں الطاف حسین حالی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات ، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے ۔اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بہ خود بدلتا چلا جاتا ہے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری: الطاف حسین حالی، ص ۹۴)

مومن خان مومن کی غزل گوئی بلکہ مکمل شاعری بالواسطہ طور پر معاشرے کی خوبیوں اور خرابیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔یہی وجہ ہے کہ مومن شاہ ولی اللہ کی اٹھارہویں صدی کی تحریک جو اصلاحی ، مذہبی، سیاسی، معاشی اور ادبی نوعیت بھی رکھتی تھی سے متاثر تھے اور انہوں نے مولوی سیّد احمد بریلوی کے ہاتھ بیعت کی تھی۔ دوسری طرف وہ عاشق مزاج بھی تھے۔اور یہ عاشق مزاجی نہایت کم عمری میں شروع ہوگئی تھی اور یہ فطری طور پر عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔وہابیت کی تحریک اور اس کی مداحی کے سلسلے میں فرمان فتح پوری کا ایک مختصر بیان ملاحظہ فرمائیں:

> ''غالب و مومن دونوں اس تحریک کے مداح تھے۔ اس تحریک کے ترقی پسندانہ اثرات ان دونوں کی شاعری پر کم و بیش نظر آتے ہیں۔لیکن اس تحریک سے متاثر ہونے کا واضح سراغ مومن کی رباعیات میں ملتا ہے۔مومن پہلے

مقلد تھے۔ سید احمد بریلوی کے مرید ہو جانے کے بعد کٹر وہابی ہو گئے تھے۔"

(مطالعہ مومن: مضمون نگار فرمان فتح پوری، ص ۱۴۳)

مومنؔ بھی تمام شعرا ادبا کی طرح اپنے عہد و معاشرے کی آب و ہوا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں عصری رجحانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ مومنؔ کی شخصیت میں ان دونوں رجحانات کی وجہ سے تضادات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ان کی عاشق مزاجی گل بوٹے کھلاتی ہے۔ دوسری طرف ان کی مذہبی تربیت انہیں مہذب اور موزوں اطوار و کردار کا نمونہ بنائے رکھتی ہے۔ یہ دونوں کیفیات ان کے اشعار سے نمایاں ہیں۔ مومنؔ چونکہ ایک بڑے شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں عصری معنویت ہونا لازمی ہے۔ اس لئے مومنؔ کی غزل گوئی بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ مومنؔ کے متعلق نیازؔ فتح پوری کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

"اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میرؔ) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ "مجھے کلیات مومنؔ دے دو اور باقی سب اٹھالے جاؤ۔"

(نگار پاکستان: مضمون نگار، نیازؔ فتح پوری ص ۴)

نیازؔ فتح پوری کے اس بیان کا مقصد صرف مومنؔ کے کلام کی اہمیت و افادیت پر زور دینا ہے۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مومنؔ کی حیثیت مسلم ہے۔ مومنؔ اپنے عہد کے ایک نامور شاعر گزرے ہیں، غالبؔ جیسا نابغہ عصر بھی ان کی غزل گوئی کی مداحی میں یہ کہہ دیتا ہے کہ مومنؔ اپنا یہ شعر۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مجھے دے دو اور میرا پورا دیوان لے لو۔ اس بیان سے بھی مومنؔ کی غزلوں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب مومنؔ کا انتقال ہوا تو غالبؔ نے اپنے ایک ہم عصر نبی بخش حقیر کو خط میں مومنؔ کے جانے کا غم اور ان کی

شاعری کے متعلق جو لکھا ملاحظہ فرمائیں

سنا ہوگا تم نے مومن خان مر گئے۔ آج ان کے مرے ہوئے دسواں دن ہے۔
دیکھ بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں، ہمارے ہم عصر مرے جاتے ہیں،
قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پادر رکاب بیٹھے ہیں، مومن میرا ہم عصر تھا اور یار بھی
تھا، بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور
اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کسی طرح
کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں
پیدا ہوتا۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا
تھا۔ طبیعت اس کی معنیٰ آفرینی تھی۔"

مومن کی شاعری کی تعریف ان کی حیات میں ہی غالب و شیفتہ کے علاوہ کئی لوگوں نے بھی کی ہے۔ نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ نے تو مومن کو متعارف بھی کرایا ہے۔ مولوی کریم الدین احمد نے بھی ان کے کلام کو یکجا کیا۔ اس کے بعد پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے اس سلسلے میں پیش رفت کی۔ پھر نیاز فتح پوری نے بھی اس سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیے۔ انہیں مومن کے مداحوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے مومن کو اپنا موضوع بنا کر مقالہ لکھا اور پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی پھر ضیاء احمد بدایونی نے ان کے کلام کو اغلاط سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور ان اشعار کی تشریح کر کے منظر عام کیا جو ان کی شاعری کی زندگی کے لئے روح پھونکنے کے مترادف تھا۔ ان کی شاعری کے خصوصیات اور سپاٹ پن کی نشاندہی کی۔ اس کے علاوہ تمکین کاظمی اور کلب علی خان فائق نے ان کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ جو مومن کی شاعری پر کئی اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ تمام نکتوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ سب سے پہلے مومن کی غزل گوئی کے متعلق ضیاء احمد بدایونی کی رائے ملاحظہ فرمائیں :

"غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا۔ مانا کہ ایسا کرنے سے شاعری کا
میدان تنگ تر ہو گیا۔ لیکن یہ عیب نہیں ہنر ہے کہ اس کی دقیقہ سنج طبیعت نے

''ظرف تنگنائے غزل'' میں اس قیود کے باوجود وہ جولانیاں دکھائیں اور اس محدود موضوع میں وہ تنوع پیدا کئے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے۔''

(مقدمہ دیوان مومنؔ: ضیاء احمد بدایونی)

مومنؔ نے اپنی غزلوں میں عشق مجازی کو اپنا موضوع سخن بنایا لیکن ان کا یہ عشق مجازی واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ مومنؔ کا محبوب ایک عام انسان ہے۔ اس لئے ان کے اشعار میں حدیث دل کی ترجمانی حقیقی ہے۔ ان کی غزل گوئی کے متعلق ظہیر احمد صدیقی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی غزل کے اجزائے ترکیبی میں تغزل، داخلیت ، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ ، سادگی اور پیچیدہ انداز بیان ہیں۔ باقی تمام خصوصیات ان میں سے کسی نہ کسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ مومنؔ نے غزل کو محض تغزل تک محدود رکھا ہے۔ تصوف، اخلاق، فلسفہ اور زندگی کے دوسرے مسائل کو غزل کے قریب نہیں آنے دیا۔ دائرہ کا محدود رکھنا مومنؔ کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ کمزوری اس لئے کہ زندگی کا کینوس بہت وسیع ہے اور عشق اس کا صرف ایک شعبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی وسیع دنیا کے سامنے مومنؔ کی دنیا بہت محدود نظر آتی ہے۔ قوت اس لئے کہ روح تغزل کے جو نمونے اور تجربے مومنؔ کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ وہ دوسرے شعراء کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ مومنؔ کی غزل پر تبصرہ کرتے وقت یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مومنؔ کے اشعار میں صداقت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ان کی آپ بیتی ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ غزل کو سچ بولنا سکھایا۔ انہوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر غزل کی ایک روایت کو اپنایا ہے۔ جس میں زندگی کی سچائی پوشیدہ تھی۔ انہوں نے پہلی مرتبہ غزل میں محبوب کو نسوانی

پیکر میں پیش کیا۔ یہ محبوبہ کوئی آسمانی یا تصوراتی پیکر نہیں تھی بلکہ زندہ گوشت
پوشت کی عورت تھی ۔ یہ آواز اردو غزل کے لئے نئی تھی ۔ جس کی وجہ سے غزل
کو آئندہ کے لئے نیا راستہ مل گیا۔ یہی وہ امتیازی وصف ہے جو مومنؔ کو ان
کے ہم عصروں میں امتیاز عطا کرتا ہے۔''

مومنؔ کی غزلیں جن خوبیوں کو وجہ سے مقام و مرتبہ کی حامل نظر آتی ہیں۔وہ خوبیاں تغزل
،داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی کے ساتھ پیچیدہ انداز بیان اور اختصار وغیرہ
ہیں۔ حالانکہ ان کی غزلوں کا دائرہ محدود ہے لیکن اپنے محدود موضوعات میں مومنؔ نے جو کمالات دکھائے ہیں وہ
اردو شاعری میں بالخصوص غزل گوئی میں امتیاز وانفراد کی حامل نظر آتی ہے۔غزل کی ترقی کی نئی راہیں بھی یہیں سے
نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''اردو شاعری میں مومنؔ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل
میں ایک نیا رنگ نکالا ہے۔ان کے تغزل کی رنگین کاریوں میں جدت کی جو
آب وتاب اور سج کی جو چمک دمک ہے اس کی مثال اردو غزل کی دو ڈھائی
سو سال کی روایت میں کسی دوسری جگہ مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔انہوں نے
اس اعتبار سے ایک نئی دنیا پیدا کی ہے۔ایک نیا اُفق تلاش کیا ہے اور وہ اس
دنیا کے تنہا رہنے والے اور اس افق کے واحد پرواز کرنے والے ہیں۔فن کی
جو راہ انہوں نے نکالی ہے۔ وہ خود اس کے راہی ہیں۔ کسی دوسرے کو اس پر
چلنا نہیں آتا۔ ان سے قبل کسی نے اس کا خواب بھی نہیں دیکھا۔ البتہ ان کے
بعد بعض ایسے ضرور پیدا ہوئے جن کے لئے انہوں نے نشان راہ اور رہبر
منزل کا کام کیا۔ اور اس طرح وہ مومنؔ کی قائم کی ہوئی روایت کو پروان
چڑھانے میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ جس

کے نتیجہ میں تغزل کی اس روایت نے ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی۔ مومن اس روایت کے امام اور سربراہ ہیں۔ اس لئے ان کے فن اور اس کے مخصوص رنگ و آہنگ کو ایک تحریک اور ایک ادارہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔''

(کلیات مومن، مقدمہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۵/٦)

مومن خان مومن کی غزلیں اپنی تمام خصوصیات و امتیازات کی دلیل ہیں۔ مومن ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ ان کی زودگی اور اختراعی فکر انہیں غزل گوئی کی نئی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے خود کو الگ رکھنے کی کوشش میں اپنے پرواز تخیل سے دور کی کوڑی اچھالنے کا تجربہ کرتے ہیں۔ جو بعض وقت پیچیدگی اور معمے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ باوجود اس کے ان کے اشعار میں اسرار حکیمانہ دقیق مسائل علمیہ، فلسفیانہ تصورات، تصوف کے پیچیدہ نکات وغیرہ نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ایسے اشعار کا مفہوم سمجھنے میں نہایت عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس بات کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

اگرچہ شوق مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے ایک معنیٰ بند مضموں یاب اپنا سا

بعض ناقدین مومن کے کلام میں تضاد کو خوبی سمجھتے ہیں۔ بعض نقص تصور کرتے ہیں۔ میری نظر میں ان دونوں میں توازن قائم رکھنا بھی ایک مشکل کام ہے چونکہ مومن نے ان تضادات کو ایک ہنرمندی سے قائم رکھا ہے اور ایک دوسرے کو کسی طور توازن میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جو ایک قابل قدر بات ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومن کی سیرت اور شخصیت میں بعض متضاد باتیں سی ہیں۔ وہ رند غزل خواں اور جہاد کے علم بردار بھی۔ وہ مثنوی جہادیہ بھی لکھتے ہیں اور مثنوی قول غمیں بھی۔ یہ تضاد مومن ہی میں نہیں اس زمانے کی زندگی میں تھا۔ رندی و

مذہبیت ایک ساتھ چلتی تھیں۔ ان میں اتنا تضاد نہیں تھا۔ جتنا آج نظر آتا
ہے۔ زندگی عشق مجازی سے شروع ہوتی تھی اور بعض صورتوں میں عشق حقیقی کا
زینہ بن جاتی تھی۔ مومن نجبائے کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا گھرانا
بادشاہی طبیبوں اور شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ خوبصورت جامہ
زیب، خوش گلو، خوش وضع عاشق مزاج اور طرح دار آدمی تھے۔ ان سب باتوں
نے ان کے اسلوب کی تعمیر میں مدد دی ہے۔ ان کے یہاں دو طرز نمایاں
ہیں: ایک پیچیدہ ہے دوسرا سادہ دونوں ان کے اصلی اور حقیقی رنگ ہیں۔
دونوں میں آن بان اور طرح داری کی شان ہے۔ پیچیدگی کلام کا سبب مومن کو
بڑھتی ہوئی علمیت بتایا جاتا ہے۔ لیکن اصلی وجہ ان کی جدت طرازی اور
انفرادیت ہے، وہ روش عام سے الگ رہنا چاہتے ہیں، ممکن ہے اس کا نفسیاتی
سبب عشق کی پردہ داری بھی ہو۔ اس کے علاوہ مومن کی شاعری نے جس
ماحول میں آنکھ کھولی اس میں بھی دو ذہنیتیں ہیں۔ ایک طرف خیالات و
واردات اور معنویت پر زور دیا جارہا تھا۔ دوسری طرف زبان، رعایت لفظی،
اور خارجی پہلو پر۔ غالب اور آتش کے یہاں پہلا طرز نمایاں ہے اور نظیر اور
ناسخ کے یہاں دوسرا مومن کے یہاں یہ دونوں رجحانات پائے جائے ہیں۔
کہیں آکر مل گئے ہیں۔ اور کہیں کہیں الگ الگ ہیں لیکن ان کی استادی اور
انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔''

(مومن شخصیت اور فن مقدمہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۲۴/۲۵)

مومن کی غزل گوئی میں تغزلیت کو اوّلیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس کی نشاندہی تقریباً سبھی ناقدین نے
مومن کے کلام میں کی ہے۔ خصوصاً ضیاء احمد بدایونی، نیاز فتح پوری، ظہیر احمد صدیقی، نظیر صدیقی اور سید امتیاز احمد

وغیرہ مومن کی غزلوں میں تغزلیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ضیا احمد بدایونی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مومن نے غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا۔کسی حد تک نہیں بلکہ مجموعی طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔اور اس جملے پر کوئی انگشت نمائی مکمل طور پر نہیں کی جا سکتی ہے۔ایک اور مضمون نگار معجز سہسوانی نے یہ جملہ چسپاں کر دیا کہ ''مومن نے جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا'' اور عشق و محبت کے جذبات سے تمام دیوان کو مملو کر دیا۔اس جملے کے پہلے حصے کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔نیاز فتح پوری نے فیصلہ صادر کر دیا کہ دوسری خصوصیت جو مومن کو اپنے دیگر ہم عصر شعراء میں ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ رنگ تغزل میں اس کا کلام اس غیر متغزلانہ چیز سے پاک ہے۔جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان کی رائے بھی پوری طرح قبول کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کے مداحوں کی ایک جماعت ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے۔شیفتہ بھی مومن کے شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے جو مومن کے کلام کی خوبیاں گنوائیں ہیں۔ملاحظہ فرمائیں :

> ''روشن متین، الفاظ شستہ و دل پسند، معانی تازہ و بلند چستی تراکیب، شوکت کلام، تنومندی اندیشہ، نزاکتِ خیال، رشاقت مضمون، رعایت مقتضائے مقام، شوخیٔ اندازہ جزالت عبارت، الفاظ آشنا معنیٰ، یگانہ تہہ نشینی غور اور حسنِ ادا''

شیفتہ مومن کے کلام میں یہ تمام خوبیاں گنواتے ہیں لیکن اس کے لئے کوئی دلیل اور ثبوت فراہم نہیں کرتے ہیں۔حالانکہ شیفتہ اپنے دور کے مشہور شاعر اور ناقد گردانے جاتے ہیں۔تمام معاصرین ان کی آراء کی قدر کرتے ہیں۔اسی وجہ کر تمام بعد کے ناقدین نے ان کے اس خیال کی صرف تائید کی مگر اس کے متعلق منفی پہلوؤں کو نمایاں نہیں کیا۔جس کی وجہ سے مومن کے کلام میں ان صفات میں سے چند کی دوسرے ناقدین نے وضاحت کی اور بقیہ صفات کو نظر انداز کر دیا۔اس کے برعکس محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف میں جو صفات گنوائی ہیں۔وہ زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ہر چند کہ تمام بعد کے ناقدین نے آزاد کے خیال سے اتفاق بلا واسطہ نہیں کیا۔مگر بالواسطہ طور پر آزاد کے خیالات کے گرد ہی گھومتے رہے ہیں۔اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

"غزل میں ان (مومنؔ) کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہونچایا ہے۔ انہوں نے معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اس واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ جرأت سے ملتا ہے۔ اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار مذکورہ فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں۔ کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا جتانا لطف سے خالی نہیں وہ اکثر اشعار میں ایک شئے کوئی کسی صفت کے لحاظ سے ذات شئے کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف اور معانی پیدا ہوتے ہیں۔"

(آبِ حیات: محمد حسین آزادؔ)

نیازؔ فتح پوری بھی مومنؔ کے مداح نظر آتے ہیں جیسا کہ میں اس باب کے پچھلے صفات میں عرض کیا ہے کہ انہوں نے سوائے میرؔ کے تمام معاصرین اور متاخرین پر مومنؔ کو افضلیت دیتے ہیں۔ اس طرح نیازؔ فتح پوری ، غالبؔ، آتشؔ، ذوقؔ، سوداؔ وغیرہ تمام شعراء کو مومنؔ سے کم تر سمجھتے ہیں۔ وقار عظیم بھی غزل کو محض تغزل تک محدود کرنے کی بات کرتے ہیں جو بالکل درست نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ مومنؔ اپنی غزلوں میں محبت کی واردات کو بڑے ہی موثر اور حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان واردات عشق کی وہ ایسی خوبصورت مصوری کرتے ہیں کہ اس محدود موضوع میں ایک عجیب لذت اور تنوع پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مومنؔ کی غزلوں میں تغزلیت کے موضوع پر آثرؔ لکھنوی یوں رقم طراز ہیں :

"مومنؔ کے دیوان میں ایک شعر بھی شاید آپ کو ایسا نہ ملے گا جس کی بندش سست ہو یا انداز بیان شاعرانہ نہ ہو۔ خیال میں تازگی نہ ہو فن کے لحاظ سے بھی شاعر کی معراج کمال ہے۔"

(مطالعہ مومن، مضمون نگار: اثرلکھنوی، مرتبہ ساحل احمد، ص ۵۱، ۵۰)

مومنؔ کے متعلق یہ عام رائے ہے کہ ان کی غزلیں تغزلیت کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہیں۔ اس بات کی بحث پچھلے صفحات میں آ چکی ہے۔ تمام ناقدین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ ان کی غزلیں تغزیت کا گہرا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مومنؔ نے غزل کے موضوع کو خود پر محدود کر لیا ہے۔ لیکن اس محدود دائرے میں بھی اپنی اختراعی فکر اور اسلوب بیان سے اس فن میں ماہرانہ دسترس کا ثبوت دیا ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے بعد ایک مکمل جائزہ کے طور پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا اقتباس جو پچھلے صفحات پر پیش ہوا ہے۔ اپنے اندر تمام نکات کی وضاحت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور مومنؔ کی تغزلیت کی دلیل بھی فراہم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اب اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور زمانہ ناقد کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں مومنؔ کے متعلق جو خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ پیش کر دیا جائے۔ اس کے بعد مومنؔ کی غزل گوئی میں دیگر نکات پر تفصیلی بحث مناسب ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی دنیا بھی محدود ہے۔ غالبؔ وسوداؔ کی دنیا کی طرح وسیع وفراخ نہیں۔ اور وہ کبھی اس تنگ دنیا سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے اس لئے ان کے اشعار میں مضامین کے لحاظ سے وہ تنوع نہیں جو سوداؔ اور غالبؔ کے کلام کو میسر ہے۔ لیکن مومنؔ صاحب طرز ہیں۔ ان کا الگ اسلوب ہے اور اپنے مخصوص رنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ درست ہے وہ دردؔ اور غالبؔ کی طرح مسائل تصوف کو نظم نہیں کرتے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بلند فلسفیانہ خیالات سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا میدان شاعری تنگ تر ہوتا جاتا ہے۔ میرؔ کی طرح مومنؔ کی دنیا میں بھی عشق کی حکمرانی ہے۔ عشقیہ جذبات جو ان کے شعروں میں ملتے ہیں وہ وہی ہیں جو ان کے دل پر گزرے ہیں۔ مصنوعی جذبات سے انہیں پرہیز ہے۔ جس عشق کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ عشق حقیقی

نہیں عشق مجازی ہے۔ وہی عشق جس سے وہ باخبر تھے۔اس لئے ان کے
سارے جذبات وکوائف داخلی ہیں۔ یہ عشق وہی ہے جو عام طور سے اردو
غزلوں میں ملتا ہے۔اس کے کرشمے بھی وہی ہیں۔ وصل،ہجر،اشک،جنوں
،آہ وفغاں،انہیں کامختلف پیرایہ میں مومنؔ کی غزلوں میں بھی بیان ہے۔اور
ظاہر ہے کہ جذبات کچھ نئے نہیں۔تمام غزل گوشعراءانہیں مضامین کا سہارا
لیتے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ مومنؔ ان پر محض رسماً طبع آزمائی نہیں کرتے
۔ان کا دل ان کوائف سے آشنا تھا۔اس لئے ان کی غزلوں میں صرف قافیہ
پیمائی نہیں حقیقت وواقعیت کا جلوہ ہے۔"

(اردوشاعری پرایک نظر:کلیم الدین احمد،ص۱۴۳۔۱۴۴)

مندرجہ بالامباحث سے واضح ہے کہ مومنؔ نے اپنے محدوددائرے میں جوغزل گوئی کی ہے،اس میں روایت سے انحراف بھی ہے۔مگرروایت کویکسرمتروک کرنے کارجحان نہیں ہے بلکہ مومنؔ نے روایت کاپاس رکھتے ہوئے ایک الگ راہ نکالی ہے۔جس میں تغزلیت،نازک خیالی،داخلیت،ندرت،اسلوب مکرشاعرانہ سادگی اور پیچیدگی کے ساتھ اپنی تبحرعلمی کازوربھی پیدا کیاہے۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مومنؔ کی غزلوں سے چندمنتخب اشعارپیش کردئے جائیں۔جس سےان کی غزلوں میں تغزلیت اورحقیقت بیانی کارنگ واضح ہوجائے۔ملاحظہ فرمائیں۔

باد بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی
تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

ہے کچھ تو بات مومنؔ جو چھا گئی خموشی
کس بُت کو دے دیا دل کیوں بت سے بن گئے ہو

دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے
اے چرخ اپنے تو مہہ کامل کو تھامنا

سینہ پر ہاتھ دھرتے ہی بسمل پہ بن گئی
لوجان کا عذاب ہو دل کو تھامنا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی اے غمزۂ غماز دیکھنا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

فکرِ مآل سے مے و شاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم
فتراک میں جو سر ہے تو جاں ہے رکاب میں

اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتش دل بجھائیں گے ہم

ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے
مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے
شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

نہ میری سنے وہ نہ میں نا صحو کی
نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا

خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بد گماں نہ ہوا

وہ آئے بہر عیادت تو تھا میں شادی مرگ
کسی سے چارۂ بے داد آسماں نہ ہوا

کی مجھکو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں
غیروں کو آکے بزم میں وہ عطر مل گیا

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

عیش میں بھی تم کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

سمجھتا کیوں کر دیوانے کی باتیں
نہ پایا محرم اپنے رازداں کو

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
الجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کے ساتھ

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

دیوان مومن سے اس قبیل کے سینکڑوں اشعار نقل کئے جاسکتے ہیں۔تمام اشعار سے مومن کی غزلوں میں موجود جملہ اوصاف کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔مندرجہ بالا اشعار سے داخلیت کے اوصاف کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔مندرجہ بالا اشعار سے داخلیت کے اوصاف بھی مترشح ہوتے ہیں۔مومن کی غزلوں کے تمام اشعار حقیقی داخلی کیفیت کے رنگ کو نمایاں کرتے ہیں۔مومن کا عشق مجازی ہے۔اس لئے وہ جن کوائف دل سے دوچار ہوتے ہیں۔ان کی بالکل بولتی ہوئی تصویر اپنے اشعار میں رقم کر دیتے ہیں۔مومن کی غزلوں میں دوسری صفت معاملہ بندی ہے۔وہ اپنے محبوب سے ہر جگہ برابری کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ان کی معاملہ بندی بھی واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔اسی لئے ان کے اشعار میں فکر وفن کے کئی دائرے ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ان کے فکر وفن کی رنگارنگی قوس قزح کی طرح ہے۔اس لئے مومن کی غزلیات فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اپنے محدود دائرے میں وسعت و رفعت اور ندرت خیال بھی رکھتی ہے۔ان کے سوچنے کا انداز ایسا ہے کہ ہر ہر صورتوں میں نئی نئی راہیں نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں فکر وفن کا دائرہ اپنی روایتی حدود کو تجاوز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اسی لئے ان کے کلام میں بھی معاملہ بندی بھی روایتی ہے اور روایتی حدود کو تجاوز بھی کرتی نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''ہاں ان کے معاملہ بندی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک دائرے میں وہ عشقیہ غزل آتی ہے جسے مومن نے اپنے وارداتِ شوق کی صورت میں

نقش خیال کی مرقع سازی کے طور پر پیش کیا ہے۔ پوری غزل اپنے لب ولہجہ اپنے تاثرات اور اپنے تصور کے اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔

''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' صرف ردیف نہیں بلکہ ایک ایسا عنوان بھی ہے۔ جس کے تحت مختلف لمحات کی مختصر کہانی بیان کی گئی ہے۔ ان لمحات کی جو دلوں کو چھوتے ہوئے گزرے ہیں۔ چاہے رگوں میں قطرات خون کی طرح دوڑنے اور بجلیوں کے انداز سے چمکنے کا موقع آیا ہو یا نہ ہو جب اس غزل کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا اور اس کا تاثر ذہن پر ابر پاروں کی طرح چھا گیا تو یہ بات محسوسات کا ضرور حصہ بن گئی کہ اس غزل کا مرکز خیال ایک درمیانی طبقہ کی لڑکی ہے۔ پردہ نشیں و پردہ دار اس کے جذبات اور احساسات ابھر کر سامنے نہیں آتے لیکن اس کے دل و دماغ کی متحرک پر چھائیاں اس میں موجود ہیں۔''

(مومن خان مومن ایک مطالعہ مضمون نگار: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص ۳۲/۳۳)

مومن چونکہ حدیث دل کی کفیات کو اپنی غزلوں میں رقم کرتے ہیں۔ اس لئے مومن کے اپنے محبوب سے رشتے میں نوک چھونک، نازک خیالی، چھیر چھاڑ، ملنا نہ ملنا، وعدہ کرنا، وعدہ توڑ دینا، وفا شعاری جفاکشی وغیرہ کیفیات اشعار میں رقم ہوتے ہیں۔ عشق میں خود کو محبت کا مستحق سمجھنا اور محبت نہ ملنے پر شکوہ شکایت، طنز وطعن وغیرہ کے تیور بھی اظہار کئے گئے ہیں یا پھر دوسری صورت میں مادی احساسات ختم ہوجاتے ہیں اور بے غرض انس ولگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرح کی سادگی خیالات پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ کیفیت مومن کے یہاں نہیں ہے بلکہ اوّل الذکر کیفیات مومن کے اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مومن کی غزلوں میں معاملہ بندی کے سلسلے میں ظہیر احمد صدیقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''معاملہ بندی کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویہ کا اظہار، وصل وہجر کی داستان پر مبنی ہوتا ہے۔ عشق کے اظہار میں یہ منزل نازک اس لئے مانی گئی ہے کہ شاعر شوخیِ بیان اور جذبۂ عشق سے مغلوب ہوکر گفتنی کو ناگفتنی نہ بنادے۔ ظاہر ہے کہ معاملہ بندی کا رشتہ مجازی محبت اور اس سے آگے قدم بڑھایئے تو بوالہوسانہ جذبات سے ہوتا ہے۔ یہ وہ کوچہ تھا جس میں ''جرات بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے'' اس لئے میرؔ نے ان کی شاعری کو چوما چاٹی، کی شاعری کہا تھا۔ اس کے برعکس مومنؔ نے بڑے احتیاط سے اس میدان میں قدم رکھا..........معاملہ بندی ہی سے یادوں کا لطیف رشتہ جڑا ہوا ہے۔ ماضی کی یاد سوئے ہوئے جذبات کو جگا رہی ہے۔ بقول یوسف حسین خاں ''یادوں میں جمالیاتی خزانہ پوشیدہ رہتا ہے'' عدہ کرنا اور پھر اس کو نہ نباہنا، روٹھنا اور تمنا کرنا کہ کوئی منالے وہ عنایت جو کبھی عاشق پر تھی اور وہ چاہ جس نے عاشق کو محبوب بنادیا تھا۔ یہ سب شاعر کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔''

(مومن خاں مومنؔ: ظہیر احمد صدیقی ص ۴۳۔۴۴)

مومنؔ کی غزلوں میں معاملہ بندی ایک متوازن انداز اور دلنشیں اظہار خیال کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ حالانکہ جرأت کا نام اس سلسلے میں سرِ فہرست ہے لیکن وہ اس میں توازن برقرار نہ رکھ سکے ہیں۔ اس اعتبار سے مومنؔ کے اشعار کی معاملہ بندی لائق ستائش ہے اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیل کے چند اشعار نموتاً نقل کر دیے جائیں۔ مومنؔ کی غزل ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' مکمل غزل اسی رنگ میں ہے۔ اس کے علاوہ دیگر غزلوں سے اس قبیل کے اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو رو برو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی ، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نبھانے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو نہ کہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

محفل میں تم اغیار کو دُز دیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک
غیر ہے بے وفا یہ تم کو کہو
ہے ارادہ نباہ کا کب تک
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھتے تھے نام

تھا لطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

دیدہ حیراں نے تماشا کیا

دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

''کس پہ مرتے ہو'' آپ پوچھتے ہیں

مجھے فکرِ جواب نے مارا

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ

آخری وقت میں کیاں خاک مسلماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا

اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

درجہ ذیل غزل کے بھی اشعار معاملہ بندی کے مترشح ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جان نہ کہا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں

جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

خاک میں مل جائے یارب بے کسی کی آبرو

غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون

اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

اے حسن پہ خلوت میں جو حال کیا تم نے

کیا جانیے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا

نہ کیونکر بس مرا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر

وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے

ہنسنے کے بدلے رو دیں نہ کیوں گد گدی سے ہم

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز

باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

مومن اپنی غزلوں میں معاملہ بندی کے اشعار نہایت سلیقہ کی ساتھ لحاظ معاشرت رکھتے ہوئے رقم کرتے ہیں۔ مومن کی زندگی نہایت ناز ونعمت میں گزری ہے۔ اس لئے ان کی فکر میں نازک خیالی کا عنصر پہلے سے تربیت پا رہا تھا۔ ان کی طبیعت حساس صفت رہی ہے۔ ان کے ادراک ومحسوسات بیدار رہے ہیں۔ دوسروں کے تقدس کا خیال بھی نہایت بلند تھا ساتھ ہی اپنا تقدس بھی انہیں عزیز تھا۔ دراصل مومن کو محسوسات کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کی تمام غزلیں ہمارے حواس کو متاثر کرتی ہیں اور اسی حواس کی کارفرمائی ان کے کلاموں میں ملتی ہے۔ ان کی یہی خصوصیت ان کی انفرادیت کی ضامن بھی ہے۔ اسی روش کو آگے چل کر رگھوپت سہائے بمتخلص فراق گورکھپوری نے اختیار کی۔ جس کا ذکر جمالیات کے زیر عنوان اگلے صفحہ پر آئے گا۔ مومن کا یہی امتیاز وانفراد تغزل کی راہ بھی ہموار کرتا ہے اور نازک خیالی کا پیکر بھی عطا کرتا ہے۔ اسی لئے صاحب گل رعنا فرماتے ہیں :

''مومن نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت ولطافت پیدا کردی ہے۔ وہ ان کی ذہانت اور جوالانی طبیعت کا تماشہ گاہ ہے۔ انداز بیان کہیں کیفیت سے خالی نہیں۔''

(جلوۂ خضر: صاحب گل رعنا ص ۳۳۷)

مومن کی یہی حِس انہیں نازک خیال بناتی ہے۔ ان کی غزلوں میں موصوف کی نازک خیالی واضح اور نمایاں ہے۔ مومن کے اشعار غزل میں خیال کی نزاکت اور لطافت بھی موجود ہے۔ مومن کی زبان شیریں اور سلیس

ہے۔اس سلسلے میں چند ناقدین کی آراء ملاحظہ فرمائیں :

''یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ اُردو میں اس طرز کے موجد اور اس انداز میں منفرد ہیں۔غالبؔ یقیناً نازک خیال استاد ہیں مگر مومنؔ شریک غالبؔ ہیں۔''

(دیوان مومنؔ،مقدمہ:ضیا احمد بدایونی)

پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

مومنؔ بھی غالبؔ کی طرح اپنی انفرادیت لئے ہوئے تھے۔سنجیدہ معاملہ بندی اور تغزل ان کی غزلوں کا مخصوص جوہر ہے۔نازک خیالی کی شطرنج کے نقشوں کی طرح دقت نظر اور پیچیدگی کی حامل ہوتی ہے۔''

اور اب حالیؔ کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ خان مرحوم اس خصوصیت (نزاکت خیال) میں مرزا (مرزا غالبؔ) سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔''

(یادگار غالبؔ مطبوعہ مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ ،ص ۱۲۲)

اس سلسلے میں سند یافتہ ناقد کلیم الدین احمد نے مومنؔ کی نازک خیالی کا اعتراف کیا ہے لیکن نازک خیالی کو اعلیٰ شاعری کی دلیل نہیں بتایا ہے۔محض نازک خیالی کو اصل شاعری سمجھنے پر اعتراض بھی کیا ہے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''غالبؔ اور سوداؔ کی نازک خیالی اور معنیٰ آفرینی مومنؔ میں بھی موجود ہے۔ مومنؔ بھی بلند اور اعلیٰ خیالات کو حلقۂ شعر میں لاتے ہیں اور اکثر ان کا تخیل تو اس قدر بلند پروازی کرتا ہے کہ مضمون مثل عنقا نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ ان کی نازک خیالی مشہور و معروف ہے۔اس لئے وہ غالبؔ کے شریک ہیں بلکہ شریک غالبؔ ہیں :

کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

کہتے ہیں کہ زمین کی گردش کا سبب کوئی قانون عالم نہیں، گردش سے زنداں بھی گردش میں ہے۔ پھر اسے زنداں میں قید کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ تپش دل نے اسے آزادیٔ جاوید بخش دی ہے۔ نزاکت خیال ظاہر ہے، لیکن صرف نازک خیالی کسی شاعر کا منشہائے خیال نہیں ہو سکتی۔ مومن میں یہ نقص ہے کہ وہ نازک خیالی اور معنیٰ آفرینی کو کبھی اصل شاعری سمجھے لگتے ہیں۔ نازک خیالی اور شاعری مترادف الفاظ نہیں، مومن کی کاوش، ان کا معنیٰ آفرینی میں انہماک، ان کے تخیل کی پرواز یہ سب چیزیں تحسین کے قابل ضرور ہیں۔ لیکن ان شعروں میں اکثر تاثیر نہیں ہوتی۔ اس لئے دل ودماغ کو کچھ لطف حاصل نہیں ہوتا ہے۔

(اردو شاعری پر ایک نظر: کلیم الدین احمد ص ۱۳۹/۱۴۰)

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نازک خیالی اور معنیٰ آفرینی سے متعلق مومن کے چند اشعار نقل کر دئے جائیں۔ جس سے اس وصف کی نشاندہی ہو سکے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خار ماہی سے

کہ یا ہم عرش سے پھیلا ہے یارب پاؤں دقت کا

سر شک اعتراف عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتۂ طاقت کا

نہ یہ دست جنوں ہے اور نہ وہ جیب جنوں کیشاں
کہ ہے دست مژہ سے چاک پردہ چشم حیرت کا

نہ دے تیغ زباں کیونکر شکست رنگ کے طعنے
کہ صفہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا

نہ پوچھو گرمئ شوقِ ثنا کی آتش افروزی
بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمع فکرت کا

جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا
وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

ناکامیوں میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی
شیریں کو درد تلخی فرہاد آگیا

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

یہ عذر امتحاں جذب دل کیسا نکل آیا

ہم الزام اسکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

پامال اِک نظر میں قرار و ثبات ہے

اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری

چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

مومنؔ کی نازک خیالی یا معنیٰ آفرینی کوئی کمال نہیں لیکن مومنؔ اس کو اپنا کمال ضرور تصور کرتے تھے۔ مومنؔ کے کلام میں مخدوفات معنیٰ بھی ایک اہم خوبی تصور کی جاتی ہے۔ جب ہم مومنؔ کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں ۔تو ان کے کلام میں اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ مخدوفات معنیٰ کا بھی ایک حصہ رکھتا ہے۔ مومنؔ زمانے کی روش سے خود کو الگ رکھنے کی خواہش میں اپنے پرواز تخیل کو اس طرح شعروں میں سمیٹتے ہیں کہ اشعار عام فہم سے بالا تر ہو جاتا ہے۔ مومنؔ شناس ضیا احمد بدایونی نے مومنؔ کے کلام کی تفسیر و تشریح لکھ کر موصوف کے کلام کو سمجھنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ مومنؔ کے مطالعے کے سلسلے میں ان کا یہ کام نہایت قدر و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر ناقدین و شارحین نے ان کے کلام کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ لیکن تمام لوگوں نے جو مومنؔ کی شاعری کی جملہ خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان خصوصیات میں وہی خصوصیات شامل ہیں۔ جو عموماً غزل کی تعلق سے بیان کی جاتی ہیں۔ مومنؔ کے کلام میں مخدوفات معنیٰ کی وضاحت ضمناً ہوتی ہے۔ اس خوبی کی طرف کسی نے تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اس نکتے کی طرف انیس اشفاق نے اپنے مضمون میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اور اس وضاحت

خاص میں موصوف کے اس پہلو کے منفی اور مثبت تمام نکتوں کو نشان زد کیا ہے۔ ضیاء احمد بدایونی نے مومنؔ کے کلام میں پیچیدگی کے حوالے سے یہ وضاحت کی ہے کہ مومنؔ اپنے کلام میں مضمون کو باندھتے وقت اس کے تمام پہلوؤں کو نہیں درج کرتے ہیں۔ اور مضمون کی درمیانی کڑی کو حذف کر دیتے ہیں اور اس خلا کو قارئین کے ذمّے چھوڑ دیتے ہیں تا کہ وہ خود سے درمیانی کڑی کو پورا کریں اور شعر کا مفہوم سمجھیں اس کی وجہ سے ان کے اشعار میں پیچیدگی اور مشکل معنیٰ کی تشریح بعض لوگ نہیں کر پاتے ہیں۔ مومنؔ اپنے مضمون کو اختصار سے پیش کرنے کی کوشش میں یہ کام انجام دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شعر کی تفہیم مشکل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انیس اشفاق کا ایک اقتباس نقل کر دیا جائے تا کہ میری اس بات کی تصدیق ہو سکے :

> ''ضیاء احمد بدایونی نے مومنؔ کی شاعری کے اس پہلو کو شعر کی خوبی قرار دینے کے بجائے اُسے شعر کے چیستاں بن جانے کا سبب بتایا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اغلاق و تکلف کے ذیل میں عاید کئے جانے والے اس اعتراض میں منفی پہلو نہیں ہے۔ مضمون کی درمیانی کڑیاں حذف کر دینے سے عبارت مختصر ہو جاتی ہے اور ہم کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ جاتے ہیں۔ ہمارے سبھی شارحین کفایت الفاظ کو شاعری کا حسن مانتے ہیں بشرطیہ کہ کفایت شعر میں اشکال نہ پیدا ہونے دے۔ جہاں تک سامع کا تعلق ہے۔ تو اگر وہ ذہن رسا رکھتا ہے تو محذوف کڑیوں کا تعلق شعر کے مذکور اجزاء سے ضرور پیدا کر لے گا۔''
>
> (مومن خان مومنؔ ایک مطالعہ، مضمون نگار: انیس اشفاق، ص ۷۱-۷۲)

مومنؔ کے کلام میں محذوفات معنیٰ ایک خوبی ہے۔ کسی بھی موضوع کو مختصراً بیان کرنا ایک الگ ہنر ہے۔ جو نظم و نثر دونوں میں رائج ہے۔ ایسی حالت میں اس امر کو مشکل پسندی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے اپنی کتاب ''ہماری شاعری'' میں اس نکتے کی طرف روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''اگر خیالات کے ایک سلسلے میں سے ایک کڑی حذف کردی جائے ذہن
اسے بآسانی خود فراہم کر لیتا ہے.........شاعر کا مفہوم اس کے لفظوں
سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی خاص واقعہ یا حالت یا کیفیت دیکھتا ہے یا
اس کا تصور کرتا ہے اور اس کے چند نمایاں پہلو ایسے لفظوں میں بیان کر دیتا
ہے۔ جو سننے والے کے ذہن کو ان تمام تفصیلوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جنہیں
شاعر نے چھوڑ دیا تھا۔''

(ہماری شاعری، مصنفہ مسعود حسن رضوی)

واضح ہے کہ مومنؔ کے کلام میں محذوفاتِ معنیٰ مشکل یا پیچیدگی کا سبب قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ مومنؔ نے اپنی غزلوں میں یہ ہنرمندی اس لئے دکھلائی ہے تاکہ وہ اپنے ہم عصروں اور متاخرین میں امتیاز و انفراد قائم کر سکیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں نیازؔ فتح پوری تو مومنؔ کی اس خوبی کو غالبؔ کی شاعری میں موجود اس خوبی سے بہتر اور اعلیٰ بتا دیتے ہیں جو کسی صورت مناسب نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کا ایک مخصوص انداز بیان جو غالبؔ کے ہاں کمتر اور دوسرے شعراء
کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا کسی واقعہ کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو چھوڑ جاتا
ہے۔ وہ تمام حالات یا واقعات کو سلسلے کے ساتھ نہیں بیان کرتا بلکہ کوئی کوئی
بات لے کر انہیں منسلک کر دیتے ہیں اور درمیانی کڑیوں کو ملانے کی خدمت
ذہن سامع کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا نہایت
آسانی کے ساتھ اس خلا کو پُر کر کے مفہوم تک پہونچ جاتا ہے۔ جیسے

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

مدعا یہ ہے کہ ناصح کہتا ہے اپنی جیب و گریباں کی حالت درست کر لو لیکن اس

کی دوستی بھی عداوت ہے کیونکہ اگر اس کے کہنے پر عمل کر کے چاک جیب و داماں میں رفو کرلوں گا تو پھر محبوب کے لطف و کرم کا اہل کیونکر اپنے آپ کو ثابت کرسکوں گا۔ اس شعر میں یہ ٹکرا کہ ''ناصح ایسا کہتا ہے'' بالکل محذوف ہے۔ اسی زمیں کا دوسرا شعر ہے ؎

بے جرم پائمال عدو کو کیا گیا
مجھ کو خیال بھی تری سر کی قسم نہیں

اس شعر میں اور زیادہ محذوفات ہیں اور ایک پوری داستان بیان کی گئی ہے۔ مومن محبوب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ نیاز عشق کو پیش کرر ہے ہیں، محبوب جس نے عدو کو بے جرم پامال کر دیا ہے، مومن کی طرف مائل تو ہے لیکن اس خیال سے کہ مومن کو عدو کی بے جرم پامالی کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ کچھ رک رک کر مل رہا ہے۔ اس خیال سے کہ مومن اس واقعہ کو علم کے بعد ممکن ہے التفات کی قدر نہ کرے یا بدظن ہو جائے۔ مومن محبوب کی اس کیفیت کا اندازہ کر کے یہ خیال اس کے دل سے نکالتے ہیں۔ اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تو مجھے کوئی پروانہ ہوگی تم التفات کرو خواہ اس کا نتیجہ وہی کیوں نہ ہو جو عدو کو بے جرم پامالی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔''

واضح ہے کہ مومن کی غزلوں میں اس طرح کبھی معمولی اور کبھی بہت طویل مخدوفات کا استعمال نظر آتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ موصوف نے یہ تمام ہنرمندیاں صرف اپنی علمی صلاحیت اور پرواز تخیل و بلندیٔ خیال ظاہر کرنے کی غرض سے کی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا مطمع نظر دیگر شعراء سے خود کو مختلف، اعلیٰ اور ارفع دکھانا ہے۔ اسی لئے مومن کے کلام میں مخدوفات معنیٰ زیادہ پراثر انداز میں نظر آتے ہیں اور اسی کی وجہ سے دیگر ناقدین اور عام فہم قارئین اس خوبی کو مشکل پسندی اور کلام کی پیچیدگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ

نیاؔز فتح پوری مومنؔ کی اس خوبی کو غالبؔ پر فوقیت کا سبب قرار دیتے ہیں لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے جو نہایت تفصیل سے گفتگو کا متقاضی ہے۔

مومنؔ کی شخصیت عام نہ تھی اس لئے وہ اپنے کلام میں عمومیت کی جگہ خاصیت کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اگر دیوان مومنؔ کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی بھی بآسانی یہ سمجھ جائے گا کہ مومنؔ ایک خاص فکر وفن کا شاعر ہے۔ عام شاعروں کی طرح ان کے کلام عام نہیں ہیں بلکہ خاص ہیں۔ اس لئے ان کے اشعار غزل میں رمزیت وایمائیت پائی جاتی ہے۔ محذوفات معنی کے سلسلے میں ظہیر احمد صدیقی کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

”رمزیت کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ شعر میں کسی کڑی کو حذف کردیا جاتا ہے اور اس حذف کئے ہوئے اشارہ کو پڑھنے والا پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پردے میں بات کہنے کا یہ انداز جہاں دل چسپ ہوتا ہے وہاں نازک مقام یہ بھی ہے کہ شاعر ایسی کڑی کو حذف نہ کرے جس سے شعر مہمل ہو کر رہ جائے۔ رمزیت کی دلچسپ مثالیں مومنؔ کے یہاں قدم قدم پر ملیں گی۔ مثلاً ایک جگہ محبوب سے کہتا ہے کہ میرے چہرے کا اڑا ہوا رنگ محبوب کی جفاؤں کا نتیجہ ہے اگر محبوب میرا چہرہ دیکھے گا تو اس کو اپنے حسن کا احساس ہو جائے گا اور اس کے حسن کو خود اس کی نظر لگ جائے گی۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھے اپنی نظر نہ ہو جائے

(مومن خان مومنؔ: مصنفہ ظہیر احمد صدیقی، ص ۴۷)

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مومنؔ کی غزلوں میں اس قبیل کے چند اشعار نقل کر دئے جائیں۔ جن میں متذکرہ صفت ان کے اشعار میں موجود ہوں۔ یوں تو ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت ہے اس لئے ان میں سے صرف چند اشعار ہی نقل کئے جارہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس
سب کاوشِ رقیب بجا کوہکن سے ہے

جلتا ہوں ہجر شاہد و یادِ شراب میں
شوقِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

فکرِ مآل سے مے و شاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی، پیری شباب میں

اب تو یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپائے ہیں مجھے

کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

عدو اس اوج پر شاکی ہے شاہد غصہ آجائے
ملا دے خاک میں نہ تو بھی شکر آسماں کیجئے

کیا گلے ہوتے گر اوروں پر بھی رحم آجاتا
شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا

کب ہمارے ساتھ ہوئے ہیں کہ دیکھے گا کوئی
ان کو بے تابی ہے کیوں اس خوابِ بے تعمیر سے

وہ اضطراب کہاں ضعف سے مگر اب بھی
ہو آؤں حضرت عیسیٰ تک اتنا حال تو ہے

ہیں آرزو سے مرگ کی بے التفاتیاں
جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو

مجھے مار ڈالا ہے انکار نے پھر
نہ کہنا کہ کیا مجھ پر دعویٰ کسی کا

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال
کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگر نہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومنؔ بتوں کو کیا جانا

کیا اس بت سے مرتا ہوں تو مومنؔ
وہ مری گور پر نہ ہو جائے

لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ
میں ہوں کشتہ ترے تجاہل کا

مومن خان مومنؔ کی انفرادیت ان کے فکر سے واضح ہے۔ان کی فکری پرواز غالبؔ کی طرح بلند نظر آتی ہے۔لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی بھی صورت میں مومنؔ کو غالبؔ سے عظیم شاعر تصور کیا جائے۔بہر کیف اتنا تو واضح ہے کہ مومنؔ کی شاعری خصوصاً غزل گوئی میں موصوف کا فکر و تخیل نہایت بلند اور انفراد و امتیاز کا باعث بنا ہے۔فنی اعتبار سے بھی مومنؔ کی غزل گوئی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔مومنؔ کی غزلوں میں ایک خوبی اور نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے وہ مکر شاعرانہ ہے۔مومنؔ دراصل اپنے موضوع کو نئے انداز میں باندھنے کی نئی نئی ترکیبیں تلاش کرتے ہیں۔اسی نئی ترکیب میں یہ ایک ترکیب واضح طور پر نظر آتی ہے کہ وہ بظاہر محبوب سے مخاطب ہو کر اس کے فائدہ کی بات کہتے ہیں۔دیکھنے میں واقعی وہ بات محبوب کے فائدے کی نظر آتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کام کا فائدہ شاعر کو ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔یہی طرزِ اظہار کا طریقہ ان کے دیوان میں جا بجا نظر آتا ہے۔جسے مکر شاعرانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس بات کی نشاندہی ضیا احمد بدایونی، نیاز فتح پوری، ظہیر

احمد صدیقی، خلیل الرحمن اعظمی بلکہ تمام ناقدین نے واضح طور پر کی ہے۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمن اعظمی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''شعرائے اردو میں مومن اپنے مواد کے اعتبار سے صف دوم کے شاعر ہیں۔ لیکن اپنے طرز غزل گوئی اور انداز بیان کی ندرت و انفرادیت کے لحاظ سے ان کی آواز اردو شاعری میں ایک جاندار آواز ہے۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسا بانکپن اور ان کے لہجے میں کچھ ایسا نوکیلا پن ہے جو انہیں سے مخصوص ہے ان کے یہاں میر اور غالب کی فنادگی، شکست پیہم اور ذہنی پیچیدگی نہیں اور نہ ہی انہوں نے اپنے آئینے سے ہٹ کر کائنات کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی لئے نہ تو یہاں شدید داخلیت ملتی ہے اور نہ فکر کی تہیں۔ ان کے مزاج میں ایک طنطنہ ہے جو عرفی کی یاد دلاتا ہے۔ ان کی گفتگو میں ایک فاتحانہ انداز ہے۔ زندگی کے گونا گوں تجربات و مشاہدات کی کمی کو انہوں نے قوت متخیلہ سے پورا کرنا چاہا۔ اس لئے بعض اوقات ان کے اشعار مفہوم سے دور جا پڑتے ہیں یا ان میں کچھ ایسی کاریگری ہوتی ہے۔ جسے بعض لوگ ''مکر شاعرانہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔''

(مطالعہ مومن: مضمون نگار، خلیل الرحمن اعظمی، مرتبہ ساحل احمد ص ۸۶)

واضح ہے کہ مومن کی شاعری میں مکر شاعرانہ ایک الگ خوبی ہے جو دیگر شعراء میں ناپید ہے۔ یہی چند خصوصیات خاص مومن کی غزلوں کو انفرادو امتیاز عطا کرتے ہیں اور مومن کی غزل گوئی اپنے ہم عصروں بلکہ تمام شعرا میں انہیں اپنی شناخت دلاتی ہے۔ یہ خاص انداز ان کی اردو غزلوں میں نہایت واضح ہے لیکن ان کی فارسی غزل گوئی میں بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ظہیر احمد صدیقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومن کے کلام کی ایک اہم خصوصیت جس کی طرف مولانا ضیاء احمد بدایونی

نے اشارہ کیا تھا وہ ''مکر شاعرانہ'' ہے۔ مراد یہ ہے کہ شاعر بظاہر ایسی بات کہتا ہے جس میں معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کا فائدہ ہے مگر نتیجہ خود عاشق کے حق میں ہوتا ہے۔

دربان کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجئے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

حرم میں قتل کرنا منع ہے نیز وہاں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں ہے۔ شعر کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ تیرا کوچہ حرم مرتبت ہے۔ اس لئے میرے داخلہ کی اجازت دینے پر دربان کو سزا نہ دینا ورنہ کوچہ کا حرم ہونا مشتبہ ہو جائے گا۔ حقیقی مقصد یہ ہے کہ اس طرح عاشق بے روک ٹوک کوچہ محبوب میں آمد و رفت جاری رکھ سکے گا............۔

مومن کے یہاں مکر شاعرانہ کے وصف پر غور کیا جائے تو مومن کے ذہن کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ مومن کے مکر شاعرانہ کے فریب میں محبوب آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ مگر مومن اس کے ذریعہ اپنی ذہنی بلندی کا اظہار ضرور کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی مومن کی زندگی کوچہ محبوب میں گزری اور یہ محبوبائیں شاہدانِ بازاری ہیں۔ جہاں گاہک اور دکان داروں کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کے ساتھ کم سے کم سودا دینا پڑے۔ اس لئے اس قسم کا اظہار کچھ عیب نہیں ہے۔ خود شاعر کی بازی گری کا مطالبہ ہے کہ نظر فریب کرشمے دکھائے جائیں۔ صرف اردو ہی نہیں مومن کے فارسی کلام میں بھی اس قسم کے اشعار بکثرت مل جائیں گے۔''

(مومن خان مومن، مصنفہ ظہیر احمد صدیقی، ص ۴۷۔۴۸)

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مومنؔ کی غزلوں سے چند اشعار جو مکر شاعرانہ کے مترشح ہیں نموناً پیش کر دیئے جائیں تاکہ میری بات بے دلیل نہ رہ جائے۔

گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے
گو قتل کا وعدہ ہوا تقاضا نہ کریں گے

تاب کم ظرف کو کہاں تم نے
دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

بے جرم پائمال عدو کو کیا گیا
مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوں گے

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات میں

اے حشر جلاکر تہہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

نہ جانے کیوں دل مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

اہلِ بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے
عشرت عمر ابد قیمت غم دیتے ہیں

صبر بعد آسائش اس قلق یہ مشکل تھا
عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا

مومنؔ نے اردو غزل کی روایت میں اپنا مقام اعلیٰ، اپنی علمی بصیرت اور اختراعی فکر کی وجہ سے بنایا ہے۔ فکری اور فنی دونوں اعتبار سے مومنؔ کے کلام اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ مومنؔ کی زبان نہایت شستہ، سلیس اور سادہ ہے۔ انہوں نے زبان میں روز مرّہ کے الفاظ کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ صنائع بدائع کی بیشتر صنعتوں کو بروئے کار لا کر انہوں نے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ ان کے زبان و بیان کے برمحل استعمال سے شعر کا وقار اور بڑھ جاتا ہے۔ جہاں اشعار میں سادگی اپنا تاثر قائم کرتی ہے۔ وہیں بیان نفسیاتی رنگ ابھارتا ہے اور شعر میں جادو کا سا اثر دکھائی دینے لگتا ہے۔ مومنؔ کی زبان میں دونوں تہذیبوں (لکھنو اور دہلوی) کا رنگ ایسا خلط ملط ہو گیا ہے کہ ایک نئے اسلوب کا گمان نظر آنے لگتا ہے۔ اسی لئے مومنؔ کی غزلوں میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی ہے۔ ان کی زبان میں فارسی تراکیب اور فارسی مذاق سے بھی خود کو زیادہ پر اعتبار و پر وقار بنانے کا رجحان ملتا ہے۔ جس سے موصوف کے زبان و بیان اور فنی پہلو نہایت معتبر و معظم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مفصل اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''اس مخصوص انداز اور منفرد آہنگ نے مومنؔ کی غزلوں کو فنی اعتبار سے ایک ایسے سانچے میں ڈھالا ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کے یہاں نہ تو میرؔ کی سی سادگی اور آہستہ روی ہے، نہ غالبؔ کی سی تندی اور پرکاری۔ انہوں نے تو ان دونوں کے مزاج سے ایک تیسرا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس اسلوب میں ایک چاشنی ہے جس نے مومنؔ کی غزلوں کو فنی اعتبار سے زیادہ دلنشیں بنایا ہے۔ مومنؔ کی غزلوں میں نہ تو نری داخلیت ہے نہ نری خارجیت۔ ان دونوں کو بھی انہوں نے ہم آہنگ کیا ہے اور ان دونوں کے امتزاج سے بھی

اپنے لئے ایک تیسری جولان گاہ پیدا کی ہے۔ مومنؔ کے مزاج میں انتہا پسندی نہیں ہے۔ اس لئے وہ کسی ایک طرف نہیں جھکتے۔ بیچ کا راستہ نکالنا انہیں خوب آتا ہے۔ توازن ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اسی لئے وہ نئے اسلوب کو پیدا کرنے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک نئے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔ مومنؔ ہر خیال کو جدت ادا کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی یہ جدت ادا ان کے یہاں نئے اشاروں اور کنایوں کے سہارے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی الفاظ کی نئی معنویت کے سہارے اس کا وجود ہوتا ہے۔ کبھی ایک پُر پیچ انداز کے سہارے اس کی تخلیق ہوتی ہے۔ کبھی ایک مخصوص لہجہ اس کو ابھارتا ہے۔ غرض یہ کہ مومنؔ نے مختلف طریقوں سے اپنے لئے اظہار و بیان کے نئے راستے نکالے ہیں۔ مومنؔ کی غزلوں میں فنی اعتبار سے الگ شگفتگی، ایک جولانی، ایک شیرنی، ایک نرمی، اور ایک کھلاوٹ کا احساس بھی ہوتا ہے.......... مومنؔ کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ اس لئے وہ اس سے جس طرح چاہتے ہیں کام لیتے ہیں۔ فارسی کے رچے ہوئے مذاق نے بھی اس سلسلے میں انہیں بڑا سہارا دیا ہے۔ فارسی کے سہارے انہوں نے نئی نئی ترکیبوں سے اپنی غزل کی دنیا میں رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔ مومنؔ کا تخیل بھی بلا کا رنگین اور پرکار ہے۔ اس رنگین اور پرکار تخیل نے بھی ان کی غزلوں میں فنی اعتبار سے بڑا رچاؤ پیدا کیا ہے۔ اور یہ رچاؤ ان کے فن کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ مومنؔ کا لہجہ بھی خاصے کی چیز ہے اس لہجے نے ان کے اسلوب اور طرز ادا میں بڑی ہی ندرت پیدا کر دی ہے۔''

(کلیات مومنؔ، مقدمہ عبادت بریلوی ص ۵۰/۵۱)

مومن زبان و بیان اور اسلوب وطرز ادا کے لحاظ سے ایک الگ شان رکھتے ہیں۔ مومن نے اظہار بیان سے ہی اپنی غزلوں کو معراج کمال تک پہنچادیا ہے۔ اس طرح موضوع سے زیادہ طرز اظہار ہی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ ہر دور میں عشقیہ شاعری موضوعات کے اعتبار سے یکساں رہی ہے۔ لیکن شاعروں کی پہچان طرز ادا اور اظہار بیان کی وجہ سے اہمیت کی حامل رہی ہے، ساتھ ہی فنی خوبیاں بھی اسلوب بیان کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ مومن نے الفاظ کا موزوں استعمال، بندش کی چستی اور تشبیہ واستعارات پر فنکارانہ دسترس سے اپنی غزلوں میں انفرادو امتیاز قائم کیا ہے۔ اور ایک الگ اسلوب نگارش قائم کی ہے۔ ان تمام خوبیوں کی بدولت محدود موضوع کو وسعت وتنوع بھی عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں سید امتیاز احمد یوں رقم طراز ہیں :

> ''مومن کے علوئے تخیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اشعار میں تعقید پیدا ہوگئی۔ لیکن پھر بھی ایسے اشعار کی ان کے کلیات میں کمی نہیں ہے۔ جن کی زبان سے آج بھی ہم پوری طرح لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ شاید مومن کے ایسے اشعار دیکھ کر ایک ناقد نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کی زبان ذوق سے بہتر ہے۔ بعض اشعار میں فارسی ترکیبوں نے بندش کو اس قدر چست کر دیا ہے کہ شعر کڑی کمان کا تیر معلوم ہوتا ہے۔''
>
> (نگار (پاکستان) مومن نمبر، مضمون نگار، رسید امتیاز احمد ص ۵۲)

مومن کی غزلیں کسی بھی ہم عصر شعراء سے کم تر نہیں ہیں۔ غزلیات مومن کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زبان و بیان اور اسلوب وطرز نگارش کے اعتبار سے یہ اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی ان کی غزلیں لاجواب ہیں۔ ان کی غزلوں میں صنائع بدائع کی بیشتر صنعتوں کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ مومن کی غزلیں فکری وفنی اور زبان و بیان کے اعتبار سے قیمتی ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کہ زبان و بیان اور فنی خوبیوں سے آراستہ چند اشعار نقل کردئے جائیں جن سے مومن کی غزلوں میں زبان وبیان اور اسلوب وطرز نگارش اور فنی خوبیاں بروئے کار آجائیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل

میں کوچہ رقیب میں سر کے بل گیا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری

چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے

آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

وقت و داع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے

یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت میں

اتنا بھی غنیمت ہے مومنؔ کا سنبھل جانا

سینے پر ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی

لو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا

اللہ رہے ناتوانی جب شدتِ قلق میں

بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا

ہجر بتان میں تجھ کو ہے مومنؔ تلاش زہر

غم پر حرام خور توکّل نہ ہو سکا

آپ کی کون سی بڑی عزت

میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

رات دن بادۂ و صنم مومنؔ
کچھ تو پرہیز گار ہونا تھا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا
رات تم کس پہ تھے خفا صاحب

کیا کیا شکن دئے ہیں دن زار کو مگر
اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب
محو دودِ چراغ خانہ رہا

آتشِ آہ بے اثر سے مرے
آسماں گلشن خلیل ہوا

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن

نیند آتی ہے بآرام دگر آخر شب

واں تو ہے زرد پوش یہاں میں ہوں زرد رنگ

واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

مومن کی مکمل شاعری حسن وعشق اور حدیث دلبری کی داستان ہے۔ مومن نے عشق ومحبت میں جس قدر اپنی جان گھلائی ہے ان تمام واردات قلبی کو اپنی غزلوں میں نظم کیا ہے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں حقیقت کا رنگ موجود ہے۔ مومن کی غزل گوئی کی ایک اور خصوصیت ہے کہ موصوف کی غزلوں کے اشعار میں جمالیاتی حسن کی کارفرمائی جگہ جگہ نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ اس طرح مومن کے کلام میں عشق پرستی کے جذبات حسن پرستی کے قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں عبادت بریلوی کا وضاحت خاص ملاحظہ فرمائیں :

''غزلوں کی اس نئی اور اچھوتی فضا میں جو چیز سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ مومن کا حد درجہ بڑھا ہوا لطیف احساس جمال ہے۔ اس احساس جمال نے حسن کے انگنت روپ مومن کی غزلوں میں بے نقاب کئے ہیں۔ محور اور بنیاد تو ان سب کی ایک ہی ہے۔ یعنی انسانی حسن۔ لیکن اس انسانی حسن میں نہ جانے کیا کچھ مومن نے دیکھا اور دکھایا ہے۔ اپنے شدید احساس اور بلند تخیل کے سہارے وہ اس سلسلے میں ایسے مقامات پر بھی پہنچتے ہیں۔ جہاں ہر شخص کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لئے حسن اور اس کی تمام جلوہ سامانیاں مومن کی غزلوں میں ایک ایسی رنگینی پیدا کرتی ہیں۔ جس میں ہر صحیح ذوق جمال رکھنے والے کا کھو جانا یقینی ہے۔ مومن نے اس حسن کو جسم میں بھی دیکھا ہے۔ انگ میں بھی دیکھا ہے۔ چال ڈھال میں بھی دیکھا ہے، آواز میں بھی دیکھا ہے، لباس میں بھی دیکھا ہے۔ غرض کوئی چیز بھی ان کی نظر سے

بچی نہیں۔ وہ ان سب کے گرویدہ رہے ہیں۔اور جہاں بھی ان کی نظروں نے
اس میں کسی چیز کو دیکھا ہے وہ اس کے شیدائی ہو گئے ہیں۔اور اس طرح اس
کی تصویر کھینچی ہے کہ خود اس تصویر کے حسن کا جواب نہیں!............... اس
میں کچھ تو حسن کے اس پہلو کو دخل ہوتا ہے جس کو مومنؔ پیش کرنا چاہتے ہیں
اور کچھ مومنؔ کا رنگین اور پرکار تخیل بھی اس میں حسن میں تجلیاں بھر دیتا ہے۔
اس لئے مومنؔ کی پیش کی ہوئی یہ تصویریں منھ سے بولتی ہوئی دکھائی دیتی
ہیں۔''

(کلیات مومنؔ، مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۰)

مومنؔ اپنے اردگرد موجود کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ اپنے حدیث دل کی واردات بیان کرنے میں، حسن کا دیدار کرنے میں، غرض محبوب سے متعلق تمام جزیات میں حسن کی کارفرمائی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں اور انہیں اپنے جمالیاتی فکر کے سانچے میں ڈبو کر شعری پیکر عطا کر دیتے ہیں۔ان کی عشق پرستی حسن پرستی سے مطابقت رکھتی ہے۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیل کے چند اشعار نقل کر دئے جائیں تا کہ مومنؔ کی غزلوں میں جمالیاتی حسن نشان زد ہو جائے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

چلنا تو دیکھنا کہ قیات نے بھی قدم
طرز خرام و شوخیِ رفتار کے لئے

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھ کر
از بس کہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگ گل
پھر مجھکو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی
تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

اس حُسن پہ خلوت نے جو حال کیا کم تھا
کیا جانیئے کیا کرتا گر تو مری جاں ہوتا

دیکھے ہے چاندنی وہ میں پر نہ گر پڑے
اے چرخ ! اپنے تو مہِ کامل کو تھامنا

اب شور ہے مثال جو دی اس خرام کو
یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

ہوتے ہیں پائمال گل ہے باد نوبہار
کس سے اڑائی تونے یہ رفتار کی طرح

تھا محور رخِ یار میں کیا آئینہ دیکھوں
معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے

اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومنؔ کچھ اور فتنہ آخر زماں نہیں

یہاں ہے چاک گریباں تو واں بھی چُستی ہے
قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے
کس نے نگاہِ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

لگتی ہیں گالیاں ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا
آنکھیں جو کہہ رہی ہیں وہ لب سے بیاں نہیں

اس غیرتِ ناہید کی ہرتان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہواسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

دشنامِ یار حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس! نزاکت آواز دیکھنا

کیوں کہ نہ آدھی رات جاگتے وہ جس کا دھیان ہو
آہوئے نیم خواب میں نرگس نیم باز میں

نکہت اس زلف کی صبا میں نہ ہو
اُڑ گیا رنگ بوئے سنبل کا

مومنؔ کے کلام میں جمالیات کا حسن صرف حسن پرستی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں آگے تجاوز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی فکر عام شاعروں سے دو قدم آگے ہے۔ اسی لئے انہیں حسن کا دیدار جلوہ بالائے بام، عالم خلوت، محفل آرائی اور گل پیرہن میں نظر آتا ہے۔ اور ان کے ذوق جمال کو اثر انداز کرتا ہے۔ اسی لئے محبوب کا ایک ایک تیور انہیں حسن جمالیات کا دیدار کراتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام اشعار میں الگ الگ کیفیت و حالات میں انہیں حسنِ جمالیات کا دیدار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا احساس جمال نہایت پاکیزہ اور نازک مزاج بھی ہے اور جوان بھی ہے۔ مومنؔ کا احساس جمال داخلیت اور خارجیت دونوں رنگ لئے ہوئے ہے۔ جب وہ خارجی حسن کی تعریف و

توصیف بیان کرتے ہیں تو اس وقت انہیں اپنے تہذیب وثقافت کا ہمیشہ پاس رہتا ہے۔ان کی فکر ابتذال کی حد سے کہیں دور ہی سانسیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں سطحیت کا رنگ ابھر کر سامنے نہیں آتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''.........غرض یہ اور اسی طرح کے بے شمار پہلوؤں سے ان کے احساس جمال کو تسکین ہوتی ہے۔ مومنؔ اس حسن کی تلاش میں خدا جانے کہاں کہاں پہنچتے ہیں۔ان کی نظریں اس کی جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں جانکلتی ہیں۔ لیکن اس تلاش وجستجو میں ہر جگہ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ مومنؔ کہیں بھی حسن کے ان مظاہر کو محض خارجی زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے۔ان کی نگاہ شباب ہمیشہ اس میں شامل رہتی ہے۔اسی لئے مومنؔ کے یہاں اس سلسلے میں محسوسات کا بیان زیادہ ملتا ہے اور محسوسات کے سہارے ان کے بیان میں ایک رچی ہوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو تو حسن کے بیان میں ایک سستا پن آجاتا ہے۔ ایک سطحیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اور اکثر اوقات بڑے بڑوں کے یہاں اس کی حدیں ابتذال سے جاملتی ہیں۔ مومنؔ اس دلدل میں پھنسنے سے بچتے رہے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں حسن کے بیان میں ستھرا پن ملتا ہے۔ایک لطافت اور نفاست نظر آتی ہے۔''

(کلیاتِ مومنؔ، مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۴)

مومنؔ ایک جوان دل عاشق مزاج شاعر ہیں۔ان کی شاعری عشق کی حقیقی داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔جس کی وجہ سے ان کے اظہار خیال کا دائرہ محدود ہو گیا ہے۔لیکن اس محدود دائرہ میں ہی مومنؔ نے اپنی غزلوں میں تغزل کا رنگ بھر کے اسے لافانی بنا دیا ہے۔مومنؔ نے اپنی پرواز تخیل اور علمی گہرائی و گیرائی سے محدود دائرے میں ایسے ایسے نکات ابھاڑے ہیں کہ دیگر شاعروں کے یہاں وہ نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ان کی غزلوں

میں فکری اور فنی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جو انہیں کسی بھی بڑے شاعر کے مدِ مقابل کھڑا کرنے میں قوتِ استحکام عطا کرتا ہے۔ تمام شعراء میں امتیاز و انفراد کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ مقالہ کی طوالت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے آخر میں ڈاکٹر مسیح الزماں کا ایک تجزیہ ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومنؔ در اصل غزل کے شاعر ہیں ۔ ان کے معاصرین ذوقؔ، غالبؔ، شیفتہؔ، ظفرؔ اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے انداز نظر متنوع ہیں۔ غالبؔ اپنے کلام کی مقدار کم ہونے کے باوجود بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔ فکر و خیال کی بہت سی منزلوں سے گزرتے زندگی کی بہت سی حقیقتوں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ مومنؔ کی نگاہ محدود ہے اور ان کا تجربہ ایک تنگ دائرے میں گھومتا ہے۔ ایک پردہ نشیں سے انہوں نے پیار کیا۔ لیکن اس محبت میں ان کا دل جہاں جہاں بے خود نہیں ہوا، اور نہ اس جذبے کی شدت نے روحانیت کی شکل اختیار کی۔ ایک متوازن آدمی کی طرح وہ محبت و شیفتگی کی منزلوں سے گزرے، کشش و اجتناب، التفات و گریز، بے رخی و تلطف کی وادیوں میں لہراتے ، اندیشوں اور وسوسوں کی جھاڑیوں سے الجھے، وصال کے سبزہ زاروں اور جدائی کی گھاٹیوں میں زندگی کے دن بسر کرتے رہے۔ ان کی شاعری انہیں بیانات سے رنگین اور ان کے اشعار اسی سچائی سے موثر ہیں۔''
>
> (کلیات مومنؔ، مقدمہ مسیح الزماں ص ۷)

مومنؔ کی شاعری عشقیہ جذبات کی حقیقی کہانی پیش کرتی ہے۔ وہ ایک حسن پرست، عاشق مزاج شاعر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری ایک بلند مرتبت شاعر کی تمام خوبیاں رکھتی ہے۔ اس لئے غزل گوئی کی جب بات ہوگی تو مومنؔ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ ان کا نام غزل کے اعلیٰ اور عظیم شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آخر میں ان کی غزلوں کے صرف مقطعات کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

زمانہ مہدیٔ موعود کا پایا اگر مومنؔ

تو سب سے پہلے کہیو سلام پاک حضرت کا

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے

مومنؔ بس اب مغان کہ یاں جی بہل گیا

دل ایسے شوخ کو مومنؔ نے دے دیا کہ وہ ہے

محبّ حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومنؔ

آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے

مومنؔ ایسا بھی کوئی دشمن ایماں ہوگا

دشمن مومنؔ ہی رہے بت سدا

مجھ سے مرے نام نے کیا کیا

امید وعدۂ دیدار حشر پر مومنؔ

تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

ذکر بتاں سے پہلی سے نفرت نہیں رہی

کچھ اب تو کفر مومنؔ دیندار کم ہوا

حوریں نہیں مومنؔ کے نصیبوں میں جو ہوتیں

بت خانے ہی سے کیوں یہ بد انجام نکلتا

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں

خیر ہے مومنؔ تمہیں کیا ہو گیا

مومنؔ بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعوی ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومنؔ اس بُت کے نیم ناز سے ہیں
تم کو دعوائے اتقا نہ رہا

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومنؔ
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

ہوگئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومنؔ وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

اگر مومن ہی ہو مومنؔ ولے میں تو نہ مانوں گا
جو عہد دوستی وہ دشمنِ اسلام لیتا تھا

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومنؔ
نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخر شب

وہ دن گئے کہ لاف و گزاف جہاد تھا
مومنؔ ہلاک خنجر نازک بتاں ہے اب

نام عشق بتاں نہ لو مومنؔ
کیجئے بس خدا خدا صاحب

مومنؔ میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
اس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

دل کسی بت کو دیا اے حضرت مومنؔ کہیں
وعظ میں کیوں برہمن کو دیکھ کر رکتے ہیں آپ

مومنؔ یہ کیا کہا کہ ہے رسم ہنود اب
کا ہے کو لائیں گے وہ مری گور پر بسنت

اس گھر میں ہے عیش خلد مومنؔ
کیا جانے کہاں ہے دن کدھر رات

ہرگز نہ رام وہ صنم سنگ دل ہوا
مومنؔ ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

مومنؔ اس بت کو دیکھ آہ بھری
کیا ہوا لافِ دینداری آج

مومنؔ آکیش محبت میں کہ ہے سب جائز
حسرتِ حرمت صہباد مزا میر نہ کھینچ

دل میں ہوائے بتکدۂ ظاہر میں کیا حصول
رہنا حرم میں مومنؔ مکار کی طرح

عزیقِ گریۂ خونی رہا نہ کر مومنؔ
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے
زنّار مومنؔ آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومنؔ
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبہ کو جا مومنؔ
صنم خانہ میں کیا لیوے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

ہوتا ہے سن جحیم میں حاصل وصال حور

مومن عجب بہشت ہے دیر مغاں نہ چھوڑ

مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقول درد

دل سے نہیں گیا ہے خیالِ بتاں ہنوز

مندرجہ بالا اشعار میں مومن نے اپنا تخلص مومن استعمال کیا ہے۔ جو کئی اعتبار سے ہنر مندانہ اور فنکارانہ بھی ہے۔ واضح رہے کہ مومن نے اپنے تخلص کو صرف تخلص کے اعتبار سے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ مومن لفظ کو اس کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا ہے۔ اور اس ہنر مندی سے کے تخلص کے ساتھ اس کا معنی بھی اس شعر میں اپنا وجود رکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ہنر مندی تمام شاعروں نے اپنے تخلص کے ساتھ دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

"تخلص کی مناسبت سے اردو کے بہت سے شاعروں نے گاہ گاہ ایسے مضامین نظم کئے ہیں جن سے مقطعے ایک خاص لطف کا نمونہ ہیں کیونکہ ان کا تخلص مومن زہد و پرہیز گاری، پارسائی اور شرع کی پابندی کے ہم معنیٰ ہے اور عشق بازی شراب خواری، بت پرستی استعارے کے طور پر ہی سہی اس کی بالکل ضد ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا کر کے مومن نے اپنے مقطعوں میں ایک خصوصیت پیدا کر لی ہے۔"

(کلیات مومن: مقدمہ مسیح الزماں، ص ۱۴)

مومن اپنی غزلوں میں ایک اور حسن بروئے کار لاتے ہیں وہ دراصل مسلسل غزلوں کا حسن ہے۔ اس ہنر مندی میں ان کی داستان گوئی کا ہنر اور جذبہ کار آمد ثابت ہوا ہے اور اسی جذبے کو غزل میں شامل کر کے موصوف نے اپنی غزل مسلسل میں ایک الگ طرح کی کیفیت کی ترجمانی پیش کی ہے۔ اس غزل مسلسل میں موصوف کے حدیث دل کی ترجمانی زیادہ واضح طور پر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''داستان شوق کے بیان میں مومن کی مسلسل غزلیں قابلِ توجہ ہیں۔ان سے جہاں ایک طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی جذبے کو سلسلے سے طرح طرح بیان کرنا مقصود ہو تب بھی غزل تنگ دامن نہیں وہاں اس مبتلائے محبت کے جذبات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ جسے بیان دریا شکوۂ مہجوری کو اختصار سے ایک شعر میں کہہ دینے سے تسلی نہیں ہوتی۔اس کے پاس تو شکایتوں اور بدگمانیوں کا دفتر ہوتا ہے۔''

(کلیات مومن: ڈاکٹر مسیح الزماں ص ۱۱)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن کی غزل مسلسل اپنے تمام اضافی خصوصیات کی مرقع نظر آتی ہے۔اس میں موصوف نے زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنی باتیں بیان کی ہیں۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو تین غزل مسلسل نمونتاً نقل کر دی جائیں تا کہ ان غزلوں کے تاثرات بروئے کار آجائیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بیٹھائے لوگوں نے

کر دیئے اپنے آنے جانے کے
تذکرے جائے جائے لوگوں نے

وصل کی بات کب بن آنی تھی
دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

سن کے اڑتی سی اپنی چاہت کی
دونوں کے ہوش اڑائے لوگوں نے

بات اپنی وہاں نہ جمنے دی
اپنے نقشے جمائے لوگوں نے

اور ہی کچھ پڑھا دیا اس کو
دشمنوں کے پڑھائے لوگوں نے

کیا تماشا ہے جو نہ دیکھے تھے
وہ تماشے دکھائے لوگوں نے

کر دیا مومنؔ اس صنم کو خفا
کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

کیوں الجھتے ہو جنبش سے

خیر ہے میں نے کیا کیا صاحب

کیوں لگے دینے خطِ آزادی

کچھ گنہہ بھی غلام کا صاحب

ہائے ری چھیڑ رات سن سن کے

حال میرا کہا کہ کیا صاحب

ستم آزار و ظلم و جور و وفا

جو کیا سو بھلا کیا صاحب

دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم

کیا جانے کسے جلائیں گے ہم

وادی میں جو اپنے آئیں گے ہم

کیا قیس کی خاک اڑائیں گے ہم

اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتشِ دل بجھائیں گے ہم

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

گر غیر سے ہے یہ رنگ صحبت
تو اور ہی رنگ لائیں گے ہم

تو بخت عدو اجل فلک دل
کس کس کے ستم اٹھائیں گے ہم

اے پردہ نشیں نہ چھپ کہ تجھ سے
پھر دل بھی یوں ہی چھپائیں گے ہم

بھیجیں گے عدو کے ہاتھ پیغام
حال دل اُسے جتائیں گے ہم

مت لال کر آنکھ اشک خوں پر
دیکھ اپنا لہو بہائیں گے ہم

دشمن کے کہے سے روٹھتا ہے
وہ ہی کہے تو منائیں گے ہم

کترا ہے جو گوشۂ سرِ خط
مطلب ہے کہ سر اڑائیں گے ہم

ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے
مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم

دم دیتے تو ہو پر یہ سمجھ لو
دشمن کی قسم دلائیں گے ہم

کیوں غش ہوئے دیکھ کے آئینہ کو
کہتے تھے کہ تاب نہ لائیں گے ہم

دُز دیدہ نظر ہے کیوں دم قتل
کیا مرنے جی سے جی چرائیں گے ہم

گر ہے دل غیر نقشِ تسخیر
تو تیرے لئے جلائیں گے ہم

آئینہ زنگ غم نے توڑا
کیونکر اسے منہ دکھائیں گے ہم

کیا پوچھے ہے رکھ تو دیکھ رشتہ
اپنی گردن جھکائیں گے ہم

کہہ اور غزل بطرزِ واسوخت
مومن یہ اسے سنائیں گے ہم

اب اور سے تو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت
کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

سر دوشِ عدو پہ رکھ کے بیٹھے
جانا نہ کہ سر اٹھائیں گے ہم

بگڑے تو کریں گے اور سے صلح
تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم

دل دے کے اِک اور لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب کا ترے دعوے مسیحی
مر اور پہ آزمائیں گے ہم

گر خواب میں بھی اُدھر دیکھا
آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا
کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم

پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو
جی ہی کو ہوا بتائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے مردے جگائیں گے ہم

آتا ہے گلے سے دھیان تیری
خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بت خانہ چیں ہوگر ترا گھر
مومنؔ ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

مومنؔ کی غزل گوئی میں تمام خصوصیات کے ساتھ شوخی اور طنز بھی ایک اہم خصوصیت ہے۔اس سے مومنؔ کی عاشق مزاجی اور ان کے تخیل کے پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔شوخی وطنز ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہر خاص وعام کے گرفت میں نہیں آتی ہے۔اشعار میں شوخی وطنز کا رنگ ابھاڑنے کے لئے ضروری یہ ہوتا ہے کہ شاعر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہواور وہ ایک قادرالکلام شاعر ہواور اس معاملہ میں وہ کہنہ مشق شاعر کے کلام میں ہی ابھرتا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا ذہن بذات خود بلند تخیل پرواز کا حامل ہوتا ہے۔ورنہ کلام میں شوخی وطنز دور ہے بلکہ وہ تلخ دل آزاری اور شوقیانہ پن کا مرقع بن کے رہ جاتا ہے۔لیکن اس کے برعکس مومنؔ کے کلام میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔اس سلسلے میں اگر کلام مومنؔ کا جائزہ لیا جائے تو مومنؔ کی غزلوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ان اشعار کی نکل آئے گی جن میں موصوف نے اپنے محبوب پر طنز وتعریض کا واضح رجحان پیش کیا ہے۔اس کام میں مومنؔ بہت ماہر ہیں وہ اپنے محبوب کو جلی کٹی ترکی بہ ترکی سنا کر بھی اپنا مقصد براری حاصل کر لیتے ہیں۔اس سلسلے

میں ضیاء احمد بدایونی کے جملے ملاحظہ فرمائیں :

''جہاں تک ہمارا خیال ہے اساتذۂ اردو میں مومن خان سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا ہے۔''

(مطالعہ مومن: ساحل احمد، مضمون نگار، ضیا احمد بدایونی، ص ۱۱۲)

مومن کی ذہانت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ بلا کے ذہین تھے اور انہوں نے اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت اپنی غزلوں میں کئی ایسی خوبیاں داخل کر لی ہیں جو دوسروں کے یہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ لیکن مومن کی غزلوں میں طنز و تعریض اور شوخیٔ بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قبیل کے چند اشعار ثبوت کے طور پر پیش کر دئے جائیں تا کہ ان کی یہ خصوصیت بھی مترشح ہو جائے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

غیر عیادت سے بُرا مانتے
قتل کیا آن کے اچھا کیا

رحم فلک اور میرے حال پر
تو نے کرم اے ستم آرا کیا

مٹی نہ دی مزار پہ تلک آ کے اس پہ بھی
کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملا دیا

فرماتے ہیں وصال ہے انجام کار عشق
کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا

نامِ وصال سنتے ہی ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

عمرِ دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو
دیکھو زمانہ ہجر کے امیدوار ہیں

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس بے حال کہیں
کہ سخت چاہیے دل اپنے رازداں کے لئے

کی جی لگا ہے تذکرہٗ یار میں، عبث
ناصح سے مجھکو آج تلک اجتناب تھا

گر علاج جوش وحشت چارہ گر
لادے ایک جنگل مجھے بازار سے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

کیا پسند آئی اپنی جور کشی
چراغ کے انتخاب نے مارا

جو پھر جائے اس بے وفا سے تو جانوں
کہ دل پر زور نہیں چلتا کسی کا

کسی دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے
زبان تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنیے
اتنا تو یہاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل
ظالم کہاں دگر نہ اثر میری آہ میں

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی اے غمزۂ غماز دیکھنا

شعلہ دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

اس منھ پہ اس سے دعوئ حسن اِک ذرا نہیں
اے میری روشنی میرے روز سیاہ میں

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

رحم کر خصم جانِ غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

لیا ہے دل کی عوض جان دے رقیب تو دوں
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لئے

توبہ گنہہ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہہ گار ہوا

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ مومن کی غزلوں میں پیچیدگی کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جہاں موصوف سلاست کو پیش نظر رکھ کر اشعار کہتے ہیں وہاں سادہ اور سلیس الفاظ کی بھرمار لگادیتے ہیں۔ روزمرّہ کے الفاظ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ جیسے الفاظ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کھڑے

التجا کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنے اشعار میں شامل کرلیں۔ غرض ان کی زبان میں سادہ بیانی کا وہ جادو ہے، جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ایسے اشعار میں وہ خوبی ہوتی ہے کہ عام سطحی ذہن کا قاری بھی بہ آسانی اس شعر کے مفہوم کو سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح زبان کی سلاست میں بھی وہ اپنا استادانہ ہنر دکھاتے ہیں اور اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کا لوہا منوالیتے ہیں۔ مومن کی غزلوں کا اسلوب نہایت شستہ اور سہل نظر آتا ہے۔ اس لئے انہیں صاحب اسلوب شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ واضح ہے کہ وہ لفظ کی نبض شناسی سے بھی واقف ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیل کے اشعار نقل کردئے جائیں تاکہ ان کی غزلوں میں سادگی کا پرتو بھی واضح ہوجائے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں ہم
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے

میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو
کہیں دامان تر نہ ہو جائے

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

کیوں بنی خونتا بہ نوشی بادہ خواری آپ کی
کس لئے ہے بے خودی عقلت شعاری آپ کی

منظور نظر غیر سہی اب ہمیں کیا ہے
بے دید تری آنکھ سے دل پہلے بھرا ہے

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
چوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

مندرجہ بالا مطلعوں کی مکمل مکمل غزلیں سادگی کے پیکر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن اگر تمام غزلوں کے اشعار نقل کر دئے جائیں تو بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔ ان مطلعوں کے علاوہ بھی کئی غزلیں ہیں جن کے مطلعوں کو

جان بوجھ کرنظر انداز کیا جارہا ہے۔لیکن چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

پیغام بر رقیب سے ہوتے ہیں مشورے
سنتا نہیں کسی کی یہ کہنے کی بات ہے

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح پہ بند غم نہیں قیدِ حیات ہے

تمہیں تقصیر اس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی
مسلمانو! ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شب غم میں کوئی کس طور سحر کرتا ہے

بخت بدنے ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

پہونچے وہ لوگ رتبہ کو کہ مجھے
شکوۂ بخت نارسا نہ رہا

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہی جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

مے نہ اتری گلے سے جو اس بن
مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو نہ یاد ہو

اس طرح کے اشعار جو مومن کی غزلوں میں سادگی اور سلاست کے مظہر ہیں سینکڑوں کی تعداد میں نقل کئے جا سکتے ہیں۔ المختصر یہ کہ مومن کی حیثیت غزل گو شعراء میں بلند مرتبہ کی حامل ہے۔ ان کی غزل گوئی انفرادو امتیاز کی ایک موثر شخصیت سے ہمکنار کراتی ہے۔ غزل کا اچھوتا انداز انہوں نے جو وضع کیا ہے وہ قابلِ قدر بھی ہے اور لائق افتخار بھی ہے۔ ان کے اسلوب کا یہی طرۂ امتیاز ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ موضوع اور مواد تو عام ہے لیکن وہ ایک صاحب طرز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موصوف کا مخصوص زاویہ نظر ان کا نظریہ حیات بھی واضح کرتا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی موضوعات کو پیش کرنے کے باوجود ان کی غزل گوئی دوسرے شعرا سے مختلف نظر آتی ہے۔ ان کے ذاتی تجربات اور شدید احساسات انہیں روایتی ڈگر سے جدا کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی غزلوں میں دبستان لکھنو کا رنگ بھی ہے اور دبستان دہلوی کا نقطۂ نظر بھی ہے۔ ان کی شاعری میں تہذیبی قدروں اور معاشرتی معیاروں کا گہرا شعور بھی مترشح ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں آفاقی رنگ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن کی غزل گوئی اپنی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔ جس میں عصری حسیت کا احساس بھی مضمر ہے۔

باب سوم

مومن کی غزلوں میں ہیئت و مواد

Content and Topics of Momin's Ghazals

مومن کی غزلوں میں ہیئت ومواد

ہیئت کا تعلق فن سے ہے اور مواد کا تعلق خیال وفکر سے ہے۔ صنف کا مدار ہیئت اور مواد دونوں پر ہے۔ اگر ہیئت کے تعلق سے گفتگو کی جائے تو اس کے دائرے میں تکنیک اور عروض بھی آجاتے ہیں۔ اس طرح اس باب میں مومن کی غزل کی تکنیک اور اس کے عروضی پہلو بھی زیر بحث لائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مواد کے تعلق سے مومن کی غزلوں میں تخیل، تعقل، جذبہ، مشاہدہ اور تجربہ زیر بحث آئیں گے۔ جو مومن کی غزلوں کے فکری اور فنی دونوں پہلوؤں کو آشکار کرنے کی کوشش ہوگی۔

تکنیک کا لغوی معنیٰ فن، اصول فن، طریقۂ کار اور فنی قابلیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکنیک وہ طریقۂ کار ہے۔ جس میں صنعت گری، کاریگری اور مہارت فن کے تعلق سے گفتگو کی جاتی ہے۔ اس کا انگریزی مبدل لفظ Technique ہے۔ جس کا انگریزی میں معنیٰ A way of carrying out a particular task aspecially the execution or performance of an artistic work or sceintific procedure or, skill or ability in a particular field.) تکنیک کا اصطلاحی معنیٰ اور بھی گہری وسعت ومعنویت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے لغوی معنیٰ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تکنیک کی کوئی واضح تعریف ممکن نہیں ہے لیکن تکنیک کے خارجی اور باطنی دو پہلو بھی ہوسکتے ہیں۔ داخلی اور خارجی پہلوؤں کے اشتراک سے بھی نئی تکنیک وجود میں آتی ہے۔ جس سے فن اعلیٰ اور بلند مقام کا حامل ہوجاتا ہے۔ خارجی تکنیک میں زبان کا شعور، الفاظ کا انتخاب، قواعد کی پابندی، ترتیب وتہذیب اور دیگر عناصر کا فنکارانہ استعمال ہوتا ہے۔ باطنی تکنیک میں تخلیق کار کا ذہن، مزاج، علم اور اس کے طبعی رجحان بروئے کار آتے ہیں۔ غزل میں داخلی اور خارجی دونوں طرح کی تکنیکوں کے باہمی اشتراک

سے غزل قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہے۔ خارجی تکنیک پر لکھنوی شاعروں نے زیادہ زور دیا ہے۔ جس سے غزل خیال اور مواد سے بے تعلق ہو کر تصنع اور بناوٹ کی حد میں قید ہوگئی۔ مومنؔ نے غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کی آمیزش سے ایک حسین فضا تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کی ظاہری تکنیک پر دسترس رکھنے والوں میں ناسخ، انشا اللہ خاں انشا اور شاہ نصیر وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ تکنیک کے تعلق سے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''تکنیک ایک پیچیدہ اور مرکب ادبی اصطلاح ہے، اس کے خارجی اور باطنی پہلوؤں کا مکمل معروضی تجزیہ ممکن نہیں۔ ادبی تخلیقات میں تکنیک کے ظاہری عناصر جیسے زبان کے اسرار و رموز سے آشنائی، لفظیات کا انتخاب، ردیف، قافیہ، بحر، وزن اور ہیئت کا چناؤ صنائع و بدائع کا فنکارانہ استعمال اور دیگر محسنات شعری کا اِدراک وغیرہ باطنی یا داخلی تکنیکی عناصر سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی عناصر کے امتزاج سے ہی تخلیق کا وہ مخصوص انداز ابھرتا ہے جسے اس کا اسلوب، سٹائل، طرز، یا قدیم ادبی اصطلاح کے مطابق ''رنگ'' کہتے ہیں۔''

(اردو غزل کا تکنیک، ہیئتی اور عروضی سفر: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ص ۲۶)

مومنؔ کی غزلوں میں ہیئت کے عمدہ تجربے ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنے سے قبل ہیئت کے متعلق تھوڑی گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہیئت کا لغوی معانی صورت، شکل، چہرہ حالت یا ساخت وغیرہ کے ہیں۔ انگریزی میں اس کا مبدل لفظ Form استعمال ہوتا ہے۔ لفظ Form کا استعمال انگریزی ادب میں ہیئت کے معنوں کے علاوہ صنف کے معنٰی میں بھی ہوتا ہے۔ مغربی ناقدین کے یہاں Form دوہری معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔ جبکہ مشرقی ادب میں صنف اور ہیئت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ صنف کا تعلق فن پارے کے مواد اور موضوع سے ہے۔ جبکہ ہیئت کسی تخلیق کے ظاہری ڈھانچے اور شکل و صورت کو کہتے ہیں۔ اردو ادب میں

ہیئت یقینی طور پر انہیں معنوں میں مستعمل ہے۔لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صنف اور ہیئت باہم خلط ملط ہو جاتی ہیں اور ان کی انفرادی شناخت گم سی ہو جاتی ہے۔اس طرح صنف ہیئت کے لئے اور ہیئت ،صنف کے طور پر استعمال ہونے لگتی ہے۔مثال کے طور پر غزل بیک وقت صنف بھی اور ہیئت بھی ہے، کیونکہ غزل میں دونوں چیزیں آپس میں ضم ہوگئیں ہیں۔لیکن اگر ہم باریکی سے نظر ڈالیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ غزل صنف نہیں ہے کیونکہ صنف کا تشخص مواد اور موضوع سے ہوتا ہے۔غزل اپنے ابتدائی دنوں میں اپنے موضوع عشق ومحبت سے شناخت رکھتی تھی لیکن اس میں جیسے جیسے دیگر موضوعات کی آمیزش ہوتی گئی غزل اپنی صنفی حیثیت کھوتی چلی گئی۔آج غزلوں میں دنیا کے تمام موضوعات پیش کئے جاتے ہیں اس کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ اس تعلق سے جب غزل کا نام زبان پر آتا ہے تو اس کے ہیئتی خد وخال ہماری نظر کے سامنے ابھرنے لگتے ہیں۔جیسے غزل کا مطلع، حسن مطلع، ردیف، قافیہ وغیرہ اس اعتبار سے اس کی شناخت، ہیئتی رہ گئی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے صنف کا درجہ بھی دیتے ہیں۔اسی لئے ناقدین نے غزل کو ''ہیئتی صنف'' نام دیا ہے۔اسی طرح مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ اصناف سخن نہیں ہیں بلکہ ''شعری ہیئتیں'' ہیں۔شعری اصناف میں حمد، نعت، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔مگر ان میں سے نعت اور حمد کو بھی صنفی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی ہیئتی شناخت ہی قائم ہو سکی ہے۔اس طرح کئی اصناف شعری ہیئتی شناخت ہی قائم ہو سکی ہے۔ اس طرح کئی اصناف شعری کی ہیئتی شناخت رکھتی ہیں۔کئی مواد اور موضوعات شناخت رکھتی ہیں اور پکاری جاتی ہیں۔اس طرح معاملات کئی جگہ خلط ملط نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں شمیم احمد کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''شعری ہیئتوں کی شناخت کوئی بڑا مسئلہ نہیں اس لئے ان کی شناخت بہت حد تک ظاہری صورت سے متعلق ہوتی ہے لیکن صنف سخن کی شناخت میں تھوڑی بہت پیچیدگی ضرور ہے کیونکہ بعض اصناف کی شناخت ہیئتی اصولوں پر منحصر ہوتی ہے۔بعض موضوع سے پہچانی جاتی ہیں۔بعض دونوں پر اپنی شناخت کا دارومدار رکھتی ہیں۔بعض موضوع و ہیئت دونوں میں سے کسی پر

اپنی شناخت کا انحصار نہیں کرتیں۔بعض ایسی اصناف ہیں۔ جو محض کسی وزن (اوزان) ہی کی وجہ سے اپنی صنفی شناخت قائم کرتی ہیں۔"

(اصناف سخن اور شعری ہیئتیں :شمیم احمد،ص ۸)

ہیئت اور صنف کی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے علماؤں نے شاعری کو دوشقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک غزل دوسری نظم۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا گیا کہ غزل کی دوہری ہیئت ہے پہلی صنفی دوسری ہیئتی ۔ابتدائی دنوں سے کلاسیکی غزل اپنے مخصوص عشقیہ موضوع کی وجہ سے ایک صنف سخن کی حیثیت سے روشناس ہوئی لیکن جب غزل کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا اور اس کا میدان تمام سرحدوں کو توڑنے لگا اور مختلف النوع موضوعات اس میں سمٹنے لگے تو غزل اپنی پارینہ شناخت بھی کھونے لگی اور اس کی تشخیص مشکل ہوگئی لیکن لوگوں نے اسے اس کی ہیئت سے اس کی شناخت کرانی شروع کردی اس طرح غزل موجودہ دور میں اپنی ہیئت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔لیکن بیشتر شاعروں نے غزل کی ہیئت میں نظمیں بھی لکھی ہیں اور اس میں تسلسل خیال کی وجہ سے اسے نظم کا درجہ دیا جاتا ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کی ہیئت میں نظم کی بیشتر اصناف اس کے دامن میں سمٹ آتی ہیں۔اس سلسلے میں شمیم احمد کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

نظم کی تخلیق میں جہاں ایک طرف غزل کی ہیئت سے بہ کثرت کام لیا جاتا رہا ہے۔ وہاں مثنوی ،مسمط ،ترکیب بند، ترجیع بند، نظم معریٰ اور آزاد نظم کی ہیئتوں کو بھی اس کے لئے کثرت سے استعمال کیا گیا۔موضوعات کی رنگار نگی، کثرت اور تنوع اور ان کا خیال کے تسلسل اور فکر کی مرکزیت کے سبب یہ صنف ماسوا غزل تقریباً تمام اصناف کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ لہٰذا اردو شاعری کی مختلف اصناف دراصل نظم ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔اس طرح اردو شاعری میں مروج تمام ہیئتیں بشمول غزل اور مثنوی کی ہیئتیں نظم کے لئے استعمال کی گئیں۔"

(اصناف سخن اور شعری ہیئتیں: شمیم احمد ص ۱۱-۱۲)

اس طرح ہمارے سامنے جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ہم کس طرح پہچانیں کہ صنفوں کی پہچان موضوع سے ہو کہ ہیئت سے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے لیکن اس کے تفصیل میں یہاں جانے کا موقع نہیں ہے اس لئے سرسری طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کی کئی صنفوں کو موضوع کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ کئی صنفوں کو ہیئت کی وجہ سے اور کئی صنفوں کو موضوع اور ہیئت دونوں کی وجہ سے اور کسی کو اوزان کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

غزل اپنی ہیئت کی وجہ سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ اور صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک عرصے تک غزل اپنے مخصوص موضوع پیار ومحبت کی وجہ سے پہچانی گئی لیکن دور جدید میں اس پر کسی بھی موضوعات کی پابندی نہیں ہے۔ اس میں ہر طرح کے خیالات نظم کئے جاتے ہیں۔ اس کے موضوعاتی تنوع کا کوئی دائرہ نہیں ہے۔ اس صنف میں تخلیقی توانائی اور وسعت نظر کا بخوبی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس کی صنفی تشکیل میں ہیئت ہی اہم ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں (۱) مطلع، (۲) قافیہ (۳) ردیف اور مقطع کا ہونا اہم تصور کیا جاتا ہے لیکن اس میں بھی قطعیت کو راہ نہیں پاسکی ہے۔ بعض غزلوں میں مطلع نہیں بھی ہوسکتا ہے۔ بعض غزلوں میں مطلع کے ساتھ کئی کئی حسنِ مطلع بھی ہوتے ہیں۔ غزل میں قافیہ ایک اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر غزل کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ بعض غزلوں میں ردیف ہوتے ہیں بعض میں نہیں بھی۔ ردیف کا ہونا لازم نہیں ہے۔ یہاں سہولت کے اعتبار سے شاعر ردیف کا استعمال کرتا ہے۔ غزل کے آخری شعر جس میں شاعر کا نام استعمال ہوتا ہے مقطع کہا جاتا ہے۔ اکثر غزلوں میں مقطعے کے اشعار ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی غزل میں شاعر کا نام بغیر استعمال کئے ہوئے غزل ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی شاعر مطلع یعنی غزل کے پہلے شعر میں بھی اپنا نام استعمال کرتا ہے۔ مومنؔ نے اپنی غزلوں میں پہلا شعر یعنی مطلع ہم قافیہ اور ہم ردیف استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند مطلعے ملاحظہ فرمائیں۔

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا
دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

وہ ہنستے سن کے نالہ بلبل کا
مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

گئے وہ خواب سے اٹھ غیر کے گھر آخر شب
اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخر شب

یاں سے کیا دنیا سے اٹھ جاؤں اگر رکتے ہیں آپ
رک گیا میرا ابھی دم کیوں اس قدر رکتے ہیں آپ

کرتے ہیں عدو وصل میں حرماں کی شکایت
تھی بارے موثر غمِ ہجراں کی شکایت

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث
یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

ہو نہ بیتاب ادا تمہاری آج
ناز کرتی ہے بے قرار آج

پنجۂ شانہ سے تو زلف گرہ گیر نہ کھینچ
دل سے دیوانہ کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

گر چندے اور یہ ہی رہی یار کی طرح

ہم بھی بنیں گے بوالہوس اغیار کی طرح

عدو نے دیکھے کہاں اشک چشم گریبانِ سرخ

نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ دامانِ سرخ

مومن نے اپنی غزلوں میں بغیر مطلع کے بھی غزلیں کہی ہیں۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

صاحبو میرا حال مت پوچھو

بندۂ سخت بے وفا ہوں میں

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا

ہر زہ گردی میں مبتلا ہوں میں

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے

کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا۔

کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں

جو تھا سو اس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

عم بزرگوار کہ ہیں عیسیٰ زماں

نسخہ کا جن کے معجزہ سے مشکل امتیاز

سقراط زہر خوردہ کا گر چارہ وہ کریں
عمر خضر سے ہو نفس واپسیں و راز

ہوا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بے درد کو لکھوں
کہ مجھ کو تختۂ مشقِ اطبار کویں بنا یا ہے
نہ یہ سمجھیں سبب نے کچھ علامت نے مرض پا دیں
سڑی ہیں آپ مالیخو لیا مجکو بتایا ہے

مومن نے بیشتر ایسی غزلیں کہی ہیں۔ جن میں قافیہ اور ردیف کا استعمال ہے۔ لیکن چند ایسی بھی غزلیں کہی ہیں۔ جن میں صرف قافیہ کا استعمال ہوا ہے۔ ردیف کا نہیں۔ اس سلسلے کے چند غیر مردف غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کس کے خیال میں یہ پراگندگی ہوئی
احساس کو ذرا نہیں وسواسِ احتراز
صد سالہ مردہ زندہ ہوگر اپنی بات پر
آجائے اس صنم کا لبِ معجزہ طراز
از بس کہ زندگی کی توقع نہیں رہی
وہ بھی مرے علاج سے کرتے ہیں احتراز
یہ حال ہے کہ ضعف سے کھلتی نہیں ہے آنکھ
ہے یاد کس کی نرگسِ بیمار نیم باز

غزل میں درمیانی اشعار میں پہلا مصرعہ آزاد ہوتا ہے اور دوسرا مصرعہ مطلع کے مطابق ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس درمیانی حصے میں تمام غزلوں میں کیفیت ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ اشعار کی تعداد

کے متعلق بھی قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔غزل میں کم سے کم پانچ اشعار لیکن زیادہ سے زیادہ کا کوئی تعین نہیں ہے۔مومنؔ نے بھی کافی لمبی لمبی غزلیں لکھی ہیں۔جن میں اشعار کی تعداد تیں، ۳۰ر، بتّیس، ۳۲ر اور پینتالیس ۴۵ر تک ہے۔لیکن کم سے کم اشعار کی غزلوں میں پانچ، سات اور نو، ۹ر اشعار کی غزلیں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے چھوٹی غزل ملاحظہ فرمائیں۔

مجھ پر بھی تجکو رحم نہیں اے کرخت دل
کم ہوئے گا جہان میں تجھ سا بھی سخت دل

داغِ جنون و سنگ درِ یار ہو نصیب
کرتا ہے رات دل ہوسِ تاج و تخت دل

گر جانتے کہ ہے شبِ ہجراں یہ کچھ بلا
دیتے کسی کو کاہے کو ہم تیرہ بخت دل

الماس ریزہ تھے مرے آنسو کہ ضبط سے
ہے پاش پاش سب جگر اور لخت لخت دل

کیا شبہہ مومنؔ آہن و قمری کہ کفر میں
کرتے ہیں نذر جلوۂ سنگ و درخت دل

اس طرح مومنؔ کی غزلوں میں ہیئت کا وہی حال ہے جو دیگر شعراء کے یہاں غزلوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غزلوں کی ہیئت میں نیا تجربہ نہیں کیا ہے۔تمام غزلوں کے آخری شعر میں موصوف نے اپنے تخلص کا

استعمال نہایت ہنرمندی سے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے لفظ مومنؔ اپنے وسیع معنوں کی ترجمانی بھی پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس نکتے پر تفصیل کے ساتھ گذشتہ باب میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس لئے یہاں تفصیل میں جانے کا کوئی محل نہیں نظر آتا ہے۔ اس باب کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے مقطع کے چند اشعار نموتاً ضرور پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جس سے غزل کی ہیئت کا واضح نقش ابھر کر سامنے آجائے جو اس باب کے ساتھ حق بہ جانب ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

پڑھے مومنؔ نے کیا کیا گرم اشعار
بھری تھی دل میں یارب کس قدر آگ

مر چکے اب تو اس صنم سے ملیں
مومنؔ اندیشہ خدا کب تک

یہی دین اگر ہے تو چھوڑ دو طرف اس صنم کی نہ رخ کرو
جسے مومنؔ آپ کے واسطے ہے مثال قبلہ نما قلق

کافر گلے لگا ہے تو مومنؔ کے مت مکر
دیکھ اپنے نقش رشتۂ زنّار کی طرف

تھا عجب کوئی آدمی مومنؔ
مر گیا کیا ہی نوجواں افسوس

مومنؔ نے طویل غزلوں میں درمیان غزل دوبارہ مطلع پیش کر کے پھر اشعار کہے ہیں۔ اس طرح

کی غزل کو دوغزلہ کہتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی کسی شاعر کے یہاں یہ سلسلہ اتنا طویل بھی ہو جاتا ہے کہ دوغزلہ، سہہ غزلہ اور چہار غزلہ تک بات چلی جاتی ہے۔ لیکن مومن کی غزلوں میں بات دوغزلہ اور سہہ غزلہ تک ہی محدود ہے۔ نمونے کے طور پر مومن کی ایک سہہ غزلہ ملاحظہ فرمائیں۔

کیونکہ پوچھے حال تلخی عاشقِ دل گیر سے
ہوگئے ہیں بند لب شیرنیِ تقدیر سے

جوش وحشت کشمکش اس ناتواں دلگیر سے
جو نہ در تک پہنچے صحنِ خانۂ زنجیر سے

کام ہوتے ہیں جوانوں کے سپہر پیر سے
لے گیا ہے پُشت خم شاید تیری شمشیر سے

دوستو لے آؤ قاتل کو کسی تدبیر سے
سر کٹائیں گے کہ اب تو جنگ ہے تقدیر سے

صبح دم جاتا ہے پہلو سے مرے وہ مہ جبیں
دن سیہ ہوتے ہیں کیا کیا مہر کی تنویر سے

وہم و میخواری سے دل کو نشۂ بنگ آگیا
ہوش جاتے ہیں تری بہکی ہوئی تقریر سے

فرط ضعف و جوشِ بیتابی ہے مرا حال دیکھ
اشک خوں جاری ہیں چشم ہر جوان و پیر سے

ہوں عضب سے اس کے سرگرمِ فغانِ شعلہ زن
جل گیا جی احتراقِ زہر کی تاثیر سے

لذّتِ وحشت سے جلتا ہوں کہیں بھاگے نہ دل
ہیں مشابہ آپ کی زلفیں بہت زنجیر سے

کام جز الفت نہیں اے کاتب اعمال یاں
فائدہ حرفِ مکرر کی بھلا تحریر سے

طوطیاں سیکھیں کہاں سے نالۂ رشک آفریں
ہو نہ زیب پشت آئینہ تری تصویر سے

ہوں سزا وارِ ستم میں نے کیا ہے جرم عشق
بوالہوس ہیں بے گنہہ پھر کیوں ڈریں تقدیر سے

اے فسوں گر چشم جادو پر نہیں چلتا عمل
دیکھنا بھی چھٹ نہ جائے سرمۂ تسخیر سے

حسن کی تیرنگیوں سے کم نہیں ار زنگ عشق
نوبہ نو جلوہ ملا لو رنگ کی تعمیر سے

رشک دامانِ جواہر اور لکھی ہے غزل
جس کو مفلس بھی نہ بدلے نسخۂ اکسیر سے

جل گئے اختر یہ کس کی حسن کی تنویر سے
ہے منور تر شبِ غم مہرِ عالم گیر سے

رو دیا بے اختیار اس شوخ نے تاثیر سے
دودِ دل بھی کم نہیں ہے سرمہ تسخیر سے

چین ہو خوابِ عدم میں تو کسی تدبیر سے
میری بالش کے لئے پرلادو اس کے تیر سے

ہو گئی ساری زمیں صرفِ حروفِ نو رقم
اِک جہاں ویران ہے میرے نامہ کی تحریر سے

کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا
اب تو باندھوں گا میں ناصح اس کو بھی زنجیر سے

کیوں نہ مجھ سے رم دہ مہوش اب زیادہ تر کرے
بد گماں ہے سبعۂ سیارہ کی تسخیر سے

پاس محوِ زار ہے اور شوق بیتابیِ خواب
باندھتے ہیں نامہ بالِ ہُد ہُدِ تصویر سے

جی رکے ہے ضبط کرتے کرتے میں تو مرگیا
ناک میں آیا دم اس آہِ ستم تاثیر سے

صبح کیونکر ایک دم میں ہو گئی شامِ فراق
کیا اثر ہوتا تھا تم کو نالۂ شبگیر سے

کہتے ہیں سب یہ رہا آوارہ بعدِ قتل بھی
ہوگئی کتنی مری نام آوری تشہیر سے

ان کو جلدی جانے کی مجھ کو عذاب جاں کنی
دونوں کا دم ناک میں ہے موت کی تاخیر سے

میں نے سوچا آپ اپنے خونِ ناحق کا جواب
نام اس کا سینہ پر لکھا ہے نوکِ تیر سے

غیر کے لکھنے کو تم نے کیا تراشی ہے قلم
ورنہ میری استخواں کیوں ہوگئی قطگیر سے

مار ڈالا ہم کو جورِ گردشِ ایام نے
بڑھ گئی رات اپنی روز حشر کی تقصیر سے

مومنؔ اب پڑھتا ہوں وہ مضمون بسمل کی غزل
شوخیوں کو جس کے دعوئ ہو رمِ نخچیر سے

ہے فسانہ ساتھ سوئے کب کسی تدبیر سے
نیند آتی ہے ہمارے خواب کی تعبیر سے

ہائے پھر مرنے لگا ہیں لطف کی تقریر سے

اس کا دم بھی کم نہ تھا ہرگز دمِ شمشیر سے

بزم دشمن سے نہ اُٹھے وہ کسی تدبیر سے

مل گئے ہم خاک میں محشر تیری تاخیر سے

میرے لکھے کو مٹایا آپ نے اچھا ہوا

تھا شگوں ہی مدعا یاں نامہ کی تحریر سے

جام شربت مرتے دم خون پلایا ہائے ہائے

منہ میرا کھولا ستم پیشہ نے نوک تیر سے

ایسے نازک کے شمائل کیوں نہ دل میں نقش ہوں

کھنچ گیا سینہ پہ نقشہ غیر کی تصویر سے

لب لگا اے کاسہ گر اس لب سے جام اس خاک کا

کام ہونے کا نہیں پھر فائدہ تدبیر سے

کاٹتاہوں عرض سوزشِ میں زباں کا دمبدم

میرے دندانِ ندامت کم نہیں گلگیر سے

اے جنوں اپنی اسیری بعد مردن بھی رہی
حلقہ ماتم میں آئے حلقۂ زنجیر سے

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے گا کوئی
ان کو بیتابی ہے کیوں اس خواب بے تعبیر سے

تم سے وہ کرتا ہے باتیں رشک سے روتا ہوں میں
سچ کہا جھرتے ہیں موتی غیر کی تقریر سے

نالہ ہائے بوالہوس نے کھودیا آزار شوق
لوہم اچھے ہوگئے درمانِ بے تاثیر سے

ساتھ سونا غیر کے چھوڑ اب تو اے سیمیں بدن
خاک میری ہوگئی نایاب تر اکسیر سے

عشق اس قاتل کا بعد قتل بھی ہم کو رہا
ہے یہ کیسا جرم جو جاتا نہیں تقدیر سے

سر پٹکتا ہے قلق میں مومنؔ خانہ خراب

مسجدیں رہتی نہیں کیا فائدہ تعمیر سے

منقولہ بالا سہ غزلہ میں مومنؔ نے غزل کی ابتداء میں چار مطلعے ایک ساتھ کہے ہیں پہلا شعر مطلع ہے باقی تین اشعار حسنِ مطلع ہیں۔اسی طرح درمیانی حصے میں بھی تین مطلعے ہیں اور آخری حصے میں چار مطلعے ہیں۔اس طرح مومنؔ کی غزلوں میں دوغزلہ تو کئی ہیں لیکن سہ غزلہ صرف ایک ہے۔کلیات مومنؔ میں تقریباً چھ دوغزلہ ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدائی جملوں میں عرض کیا تھا کہ اس باب میں عروضی پہلو پر بھی روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔لیکن چونکہ اس باب میں عروضی پہلو کی گنجائش نہیں ہے۔عروضی تجزیہ کے لئے ایک مکمل مقالہ کی ضرورت پیش آئے گی اس لئے عروضی پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے اتنا عرض کردوں کہ مومنؔ نے اپنی غزلوں میں سالم بحروں کا استعمال کم کیا ہے۔انہوں نے مروجہ تمام بحروں میں بحسن وخوبی اشعار کہے ہیں اور اس میں استادانہ ہنر مندی دکھائی ہے۔چھوٹی بحروں میں اور لمبی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور کامیاب غزلیں کہی ہیں۔

مومنؔ کی غزلوں میں جہاں تک مواد کا تعلق ہے وہ خالص عشقیہ افکار وتصورات سے تعلق رکھتے ہیں۔انہوں نے عشق مجازی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ان کی پوری شخصیت ان کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔انہوں نے حدیث دل کی ترجمانی نہایت خوش اسلوبی سے غزلوں میں کی ہے۔فرضی اور خیالی تصورات کو انہوں نے ترجیح نہیں دی ہے۔ان کی غزل گوئی ماجرائی اور سوانحی ہے،اس میں جسم کا جمال بھی ہے، جنس کی مہک بھی ہے، چاہنے والوں کی خواہش کا بھی ذکر ہے۔ان میں شوخیاں، نازک خیالی، بانکپن، پسندیدگی، ناپسندیدگی، وصال کی آرزو، ہجر کا غم بے رُخی اور مہربانیاں وغیرہ تمام واردات حسن وعشق کی سرگرمیوں سے تمام مواد کشید کئے ہیں۔اسی لئے انہوں اپنے محبوب سے کبھی لڑائی یعنی ایک طرح کی معاملہ بندی کا رجحان ومیلان غزلوں میں پیش کیا ہے۔کبھی بوس وکنار کی محفلیں بھی آراستہ ہوتی ہیں۔ان کی غزلوں میں کبھی انانیت اور نیاز مندانہ شیفتگی کی باتیں رقم ہوئی ہیں اسی وجہ کر ان کی غزلوں میں اپنے محبوب کو جلانے کا میلان نظر آتا ہے۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

بہت خانہ چین ہو گر ترا گھر
مومنؔ ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا، صیاد کیا

آئے غزل چشم سدا میرے دام میں
صیّاد ہی رہا میں، گرفتار کم ہوا

پچھلے باب میں تفصیل کے ساتھ تجزیہ آچکا ہے۔جس میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔کہ مومنؔ کی غزلوں میں تمام مواد عشق مجازی سے تعلق رکھتے ہیں اور حقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ان کی پوری زندگی عشق کی سرگرمیوں سے فعال اور عبارت رہی ہے۔جس کے نتیجے میں عشق کے روز نئے تجربات ومشاہدات کا سامنا عام بات رہی ہے۔اسی لئے عشق کے محدود دائرے میں بھی انہوں نے جو وسعت پائی ہے۔وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی زندگی اور شاعری میں مختلف اور متضاد عناصر کی جھلک نظر آتی

ہے۔ان عناصر میں آویزش وپکار بھی ہے۔اور موج وکنار کی سی محبت بھی، کبھی صلح ہے، کبھی لڑائی۔ان کی شخصیت، کعبہ وبت خانہ کے درمیان معلق رہی۔اسی وجہ سے وہ قشعہ کھینچ کراور پاؤں توڑ کر دیر میں نہ بیٹھ سکے۔لیکن آخری وقت میں مسلمان بھی نہ ہو سکے۔اور اس ''گمراہی'' پرتو کبھی راضی نہ ہوئے کہ بت وبت خانہ بالکل چھوڑ بیٹھیں۔ان کی شخصیت لکھنو اور دہلی کے درمیان جھولتی رہی۔ان کے یہاں ناسخ اور نصیر دونوں کا انداز ہے۔ اتنا پیچیدہ اور ژولیدہ کہ وہ کم سے کم تغزل کے متعارف اسلوب سے میل نہیں کھاتا۔اور بعض جگہ اتنا تہہ دار اور خوشنما بھی کہ ناسخ ونصیر سے افضل واعلیٰ ہے۔ان کے یہاں لکھنو کی خارجیت بھی ہے۔دہلی کی داخلیت بھی۔ اس کا حسین امتزاج بھی اسی طرح ان کی سیرت میں رندی بھی ہے، زہد بھی، خودداری بھی، فتادگی بھی، غیرت بھی، نیاز آگینی بھی۔انانیت بھی اور نیاز مندانہ شیفتگی بھی۔ وہ نقش پائے محبوب پر سجدے کرتے ہیں۔لیکن سجدوں کی ذلّت کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ محبت کرتے ہیں لیکن حریف تغافل نہیں ہوتے۔''

(مومن شخصیت اورفن: پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص ۲۷)

مومن نے عشق ومحبت کے محدود دائرے میں جس قدر تنوع اور وسعت کو راہ دی ہے۔وہ اپنی مثال آپ ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں پامال موضوعات کو تغزل کی چاشنی میں حقیقت کا رنگ آویزاں کرکے، اپنی نکتہ یابی، نازک خیالی اور شوخی ادا سے انہیں موضوعات کو''تیر نیم کش'' بنا دیا ہے۔مومن نے غزلوں میں پردہ اور چلمن کو اس انداز میں پیش کیا کہ پردہ اور چلمن ایک روایتی لفظ نہ رہ کر ایک نئے رنگ میں متعارف ہوا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اردو شاعری میں عشق پردہ نشیں کا ذکر نہایت خوبصورتی سے کیا کہ مواد و ہیئت کی دوری

درمیان میں نہ رہی۔اس سلسلے میں خواجہ احمد فاروقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ نے تغزل میں سچائی کا رنگ پیدا کر کے اس کو رسمی اور روایتی قیدوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہے اور پنی نکتہ یابی نازک خیالی اور شوخی ادا سے اسے ''تیر نیم کش'' بنا دیا ہے۔ان کے یہاں پردہ، چلمن روایت ہی نہیں حقیقت بھی ہیں۔انہوں نے غزل کی فرسودہ روایت پر اپنی انفرادیت کا رنگ چڑھا کر پرانی قدروں کو نئی صورت دی ہے اور غالباً اردو میں پہلی دفعہ عشق پردہ نشیں کا ذکر ہنر مندانہ توازن اور تحت الشعوری وواقعیت کے ساتھ کر کے مواد و ہیئت کی دوڑی مٹادی۔''

(نگار (پاکستان) مومنؔ نمبر، خواجہ احمد فاروقی)

مومنؔ نے اپنی غزلوں میں جس پردہ نشیں کا ذکر کیا ہے۔وہی ان کی محبوبہ ہے۔لیکن اس پردہ نشیں کے ذکر کو انہوں نے لافانی کر دیا۔تمام شاعروں کے یہاں پردہ، چلمن، حجاب، کا ذکر کثرت سے ہوا ہے۔لیکن مومنؔ کے یہاں یہ الفاظ ایک نئی جہت معنی لیکر سامنے آتے ہیں۔یعنی کلاسیکل شاعری کے مروجہ الفاظ جو تمام شاعروں کی غزلوں میں موجود ہیں۔انہیں الگ ہنر مندی سے مومنؔ پیش کرتے ہیں۔مومنؔ کی یہی انفرادیت ہے کہ وہ روایتی الفاظ اور روایتی مواد کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کی خصوصیات تمام شاعروں سے مختلف ہو جاتی ہے۔اسی لئے کلیم الدین احمد نے انہیں صاحب طرز سے موسوم کیا ہے۔اور مواد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی دنیا محدود ہے۔غالبؔ وسوداؔ کی دنیا کی طرح وسیع وفراخ نہیں اور وہ کبھی اس تنگ دنیا سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے۔اس لئے ان کے اشعار میں مضامین کے لحاظ سے وہ تنوع نہیں جو سوداؔ اور غالبؔ کے کلام کو میسر ہے۔لیکن مومنؔ صاحب طرز ہیں۔ان کا الگ اسلوب ہے اور اپنے

مخصوص رنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ درست ہے وہ دردؔ اور غالبؔ کی طرح مسائل تصوف کو نظم نہیں کرتے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بلند فلسفیانہ خیالات سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا میدان شاعری تنگ ہو جاتا ہے۔ میرؔ کی طرح مومنؔ کی دنیا میں بھی عشق کی حکمرانی ہے۔ عشقیہ جذبات جو ان کے شعروں میں ملتے ہیں وہ وہی ہیں۔ جو ان کے دل پر گزرے ہیں۔ مصنوعی جذبات سے انہیں پرہیز ہے۔ جس عشق کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ عشق حقیقی نہیں عشق مجازی ہے۔ وہی عشق جس سے وہ باخبر تھے۔ اس لئے ان کے سارے جذبات وکوائف داخلی ہیں۔ یہ عشق وہی ہے جو عام طور سے اردو غزلوں میں ملتا ہے۔ اس کے کرشمے بھی وہی ہیں۔ وصل، ہجر، اشک، جنوں، آہ وفغاں انہیں کا مختلف پیرایہ میں مومنؔ کی غزلوں میں بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبات کچھ نئے نہیں۔ تمام غزل گو شعراء انہیں مضامین کا سہارا لیتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مومنؔ ان پر محض رسماً طبع آزمائی نہیں کرتے۔ ان کا دل ان کوائف سے آشنا تھا۔ اس لئے ان کی غزلوں میں صرف قافیہ پیمائی نہیں حقیقت وواقعیت کا جلوہ ہے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، ص ۱۴۳۔۱۴۴)

واضح ہے کہ مومنؔ کی غزلوں میں مواد وہی روایتی ہیں لیکن ان روایتی مواد وموضوع میں جس قدر انہوں نے تنوع پیدا کیا ہے۔ اسی کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ایک نئی شان اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلے پردہ، چلمن یا پردہ نشیں کے تعلق سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے
پردۂ شوخ جو پیوند گر بیاں ہوگا

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مرگ نے ہجراں میں چھپایا ہے منہ
لو منہ اسی پردہ نشیں کا کیا

کس وقت کیا مرد مک چشم کا شکوہ
اے پردہ نشیں ہم تجھے رسوا نہ کریں گے

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں
میں نے دعویٰ کیا تحمل کیا

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

غیروں سے ہو وہ پردہ نشیں کیوں نہ بے حجاب

دمہائے بے اثر مرے پردہ اٹھا گئے

مومنؔ کی غزلوں میں موضوعات ومواد کی تشخیص دیگر شعراء سے زیادہ کی جاسکتی ہے۔ان کی غزلوں میں مخدوفات معنیٰ ،مکر شاعرانہ ،شوخی وطنز ، نازک خیالی معاملہ بندی، مسجد و دیر کی الجھن ،اسلوب بیان میں تازی روایت میں جدت ،تبحر علمی ،سادگی پیچیدگی ،تضاد اور روزمرہ کے الفاظ اور محاورات وتراکیب وغیرہ سے موضوعات ومواد میں تنوع پیدا ہوا ہے۔ان کی غزلوں میں انسانی ہمدردی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ان کی عشق پرستی حسن پرستی سے عبارت ہے۔ان کی حسن پرستی سے جمالیاتی نقطۂ نظر بھی واضح ہوتا ہے۔مومنؔ کی غزلوں میں جذبات کی عکاسی نہایت سلیقے کے ساتھ ہوئی ہے۔ان کے احساسات وجذبات میں رنگینی اور رعنائی بھی ہے۔ ان کا عشق مجازی ان کی غزلوں میں حقیقت کا رنگ بھرتا ہے۔انہوں نے عشق کے ایسے ایسے تجربات ومشاہدات لطیف پیرایے میں بیان کئے ہیں کہ ان کی غزل گوئی لاجواب اور بے مثال ہو جاتی ہے۔ان کی غزلوں میں ایک مٹھا در دحقیقت کا رنگ لئے ہوتا ہے۔جو موثر بھی ہے اور جاذب نظر بھی ہے۔ان کی جملہ خصوصیات کے مترشح چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو

ہے بوالہوس پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح

اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

تشبیہ کس سے دوں کہ طرح دار کی مرے
سب سے نرالی وضع ہے سب سے نئی طرح

بے تاب ہجر میں نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو اس توقع پر
تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں

کس کی خبر آنے کو ہے کس لئے ہے یہ بے تابی
کس لئے ہم ہیں ہردم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانہ اور ملا
حضرت مومنؔ اب تمہیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ
بدنامئ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

ہے دشمنی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

بے جرم پائمال عدو کو کیا گیا
مجھ کو خیال بھی تیرے سر کی قسم نہیں

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجئے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہیں

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

کیا شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخ کام تر
میری جو شور شوں نے عدو کو مزا دیا

گر پاس ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے
ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہے ہمارا

اگرچہ شوق مومنؔ بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے ایک معنیٰ بند مضموں یاب اپنا سا

صبر وحشت اثر نہ ہوجائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

یہ عذر امتحاں جذب دل کیسا نکل آیا
ہم الزام اس کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھے اپنی نظر نہ ہوجائے

مومنؔ کی غزلوں کے مطالعے سے واضح ہے کہ ان کے اشعار میں موضوعات ومواد کے اعتبار سے اپنے محدود دائرے میں کافی تنوع اور رنگارنگی ہے۔ان کی غزل گوئی فکری اور فنی اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی حامل ہے۔ان کی غزلوں میں اسلوب بیان بھی نہایت منفرد وممتاز ہے۔ان کی غزلوں میں اعلیٰ غزل گوئی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔اس لئے انہیں اپنے دور کا ایک بلند پایہ شاعر کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

باب چہارم

مومنؔ کی غزلوں میں تشبیہ، استعارے، نجوم، شطرنج، ریاضیات کے اصول اور علم موسیقی کی ترجمانی

Role of Simili, Metaphor, Terms of Mathematics, Astrology, Music and Chess in Momin's Ghazals

مومن کی غزلوں میں تشبیہ، استعارے، نجوم، شطرنج، ریاضیات کے اصول اور علم موسیقی کی ترجمانی

مومن کی غزل گوئی اپنی تغزلیت کی وجہ سے شہرت ومقبولیت کے بلند مقام تک پہنچی ہے۔ جس کا جائزہ پچھلے باب میں لیا جاچکا ہے۔ اس باب میں مومن کی غزلوں میں تشبیہ، استعارہ وغیرہ کی نشاندہی خصوصاً کی جائے گی۔ مومن نے بھی اپنی غزلوں میں تشبیہات واستعارات کا استعمال بحسن وخوبی کیا ہے لیکن ان کے کلام میں تشبیہ و استعارہ کا استعمال دیگر شعرا کی مناسبت میں کم ہوا ہے۔ اردو نظم، غزل اور نثر ہر میدانوں میں تشبیہ واستعارہ کا استعمال ہوتا ہے۔ خصوصاً شعری ادب میں ان صنعتوں کا استعمال تقریباً ناگزیر ہے۔ اس لئے صرف تشبیہ اور استعارہ کی نشاندہی مومن کی غزلوں میں کی جائے تب بھی اشعار کا ایک حصہ اس باب میں نقل کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی جو بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے اس باب میں ان تمام نقوش کی مختصراً نشاندہی کی جائے گی۔

مومن نے اپنی غزلوں میں تغزلیت، نازک خیالی، ندرت خیال، مکر شاعرانہ، مخدوفات اور اسلوب بیان میں پیچیدگی وسادگی کے ساتھ ساتھ صنائع بدائع کی بیشتر صنعتوں کا استعمال کم وبیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں زیادہ کنایوں کا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ صنعت تضاد پر بھی خاصا زور رہا ہے۔ مندرجہ بالا پہلوؤں میں کچھ پہلوں ان کی غزل گوئی کی پہچان بن گئی ہے۔ ان پہلوؤں کی توجہ خاص نے ان کے کلام میں ندرت خیال اور ندرت اسلوب بھی پیدا کئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں پیچیدگی اور چیستاں گوئی کا رنگ ابھر کر سامنے آیا ہے لیکن سادگی اور سہل ممتنع کی مثال بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔ انہیں خوصیات سے ان کے کلام میں تغزلیت کا رنگ نمایاں ہوا ہے۔ تشبیہات واستعارات سے بھی انہوں نے کلام میں حسن پیدا کیا ہے۔ مومن کے کلام میں تشبیہات واستعارات اور کنایہ کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جسے اپنے مضمون میں سید امتیاز احمد نے نقل کیا ہے اور اپنی رائے بھی شامل کی ہے۔ دونوں کے خیالات منجلہ ملاحظہ

فرمائیں :

''غزلوں میں ان کے خیالات نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے ان میں معاملات عاشقانہ عجب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے۔ اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر خود وہ بھی نازاں تھے۔ اشعار (مذکورہ) میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں، دلکش تراشیں ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا جتلانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ''ایک شئے کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے ذات شئے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں''

یعنی آزاد بھی مومنؔ کی نزاکت تخیل، علوئے مضامین زور تشبیہ واستعارہ کے مداح ہیں۔ وہ گو مومنؔ کی فارسی ترکیبوں کو عمدہ اور تراشوں کو دلکش کہتے ہیں۔ مگر دبی زبان سے یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ باتیں اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ آزاد کی زیر خط عبارت میں کچھ سمجھ نہ سکا غالباً اس سے استعارہ بالکنایہ مراد ہے۔ یہ یاد رہے کہ کنایہ اور استعارہ بالکنایہ میں فرق ہے۔ اگر لفظ یا جملہ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر اس طرح کہ حقیقی معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں تو یہ کنایہ کہلائے گا اور اگر حقیقی معنی مراد نہیں لئے جاسکتے ہیں۔ وہ استعارہ بالکنایہ ہوتا ہے جو ایک فرع تشبیہ کی ہے۔ بعض نقادوں نے خصوصیات مومنؔ کے ضمن میں ندرت اسلوب اور شوخی ادا پر بھی زور دیا ہے۔''

(نگار پاکستان، مومنؔ نمبر مضمون نگار سیّد امتیاز احمد، ص ۳۳)

مومنؔ کی غزلوں میں تشبیہ واستعارہ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ دیگر شعراء کے مقابلے یہاں اچھوتی تشبیہ کا نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرح تشبیہ واستعارہ میں جدّت کا پہلو بھی وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ اس سے شاعری کی فکری پرواز اور فنی دسترس کا ملکہ بھی واضح ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کیا کیا شکن دئے ہیں دل زار کو مگر
اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب
محو دودِ چراغِ خانہ رہا

آتشِ آہ بے اثر سے مرے
آسماں گلشنِ خلیل ہوا

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومنؔ
نیند آتی ہے بآرام دگر آخر شب

واں تو ہے زود پوش یہاں میں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

داغِ جدائی دُر دندان و روئے و زلف

ہے اشک شمع، شعلہ شمع، دخال شمع

ربط اس سے بے مثل شعلہ و شمع

مرجاؤں گر ایک دم جدا ہوں

واعظ کے ذکر مہرِ قیامت کو کیا کہوں

عالم شب وصال کی آنکھوں میں چھا گئے

استعارہ کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں ۔

خندہ زن کس کا ہوا زخمِ دروں

شدت گریۂ پنہاں کیوں ہے

ساقیا زہر پلا دے مجھ کو

شربت مرگ چکھا دے مجھ کو

اقرار ہے صاف آپ کے انکار سے ظاہر

ہے مستی شبِ نرگس میخوار سے ظاہر

لطف سے اس کے زمیں غیرتِ باغ فردوس

خلق سے اس کے زماں رشکِ دکانِ عطار

ہاں جوش تپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو
چھیر جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

کس واسطے اے شمع زبان کاٹتے ہیں لوگ
کہا تونے بھی کی تھی شبِ ہجراں کی شکایت

دھیان ہے غیر کے تحمل کا
ہوش دیکھا ترے تغافل کا

ہیں آرزو سے مرگ کی بے التفاتیاں
جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو

مومن کی غزلیں تشبیہات واستعارات سے خالی نہیں ہیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کے یہاں تشبیہات قدرے کم ہیں۔انہوں نے اشعار میں زور واثر بغیر تشبیہات کے بھی پیدا کیا ہے۔تشبیہات کی مناسبت میں استعارہ زیادہ ہے اور استعارہ کی مناسبت میں کنایہ زیادہ ہے۔مومن نے اپنے حدیث دل کی واردات وحکایات اور حسن و عشق کے علاوہ کسی بھی پہلو کو اپنے کلام میں جگہ نہیں دی ہے۔عشق ومحبت سے متعلق جتنے بھی تلخ وشیریں تجربات و مشاہدات ہو سکتے تھے تمام پہلوؤں کو اپنی غزلوں کے اشعار میں موصوف نے سمیٹ لیا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنی غزلوں میں تغزلیت کا رنگ ابھارا ہے۔وہ بغیر تشبیہ کے بھی اپنے شعر کو موثر بنا لیتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

منقولا بالا شعر میں کوئی تشبیہ نہیں ہے لیکن نزاکت آواز کا بیان جس انداز میں کیا ہے۔ اس میں تشبیہ و استعارہ سے کوئی کم اثر نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں تشبیہات قدرے کم نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں آصفہ زمانی کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومنؔ کی خوبی یہ ہے کہ انہوں تشبیہات و استعارات کا کمتر سہارا لیا ہے اور پھر بھی تغزل سے بھرپور غزلیں کہیں ہیں۔ افلاطون کا قول ہے کہ ''اچھے ادب کے لئے کامل خلوص اولین شرط ہے'' مومنؔ کی بنیاد چونکہ جذب صادق پر ہے اس لئے ان کا تغزل شدت تاثیر سے مملو ہے۔''
>
> (مومن خان مومنؔ: ایک مطالعہ، مضمون نگار، آصفہ زمانی، ص ۱۰۲)

مومنؔ خان مومنؔ کی غزل گوئی اسی لئے اپنے محدود موضوعات میں تغزلیت کی وجہ سے اعلیٰ وارفع مقام حاصل کرتی ہے اور اس میں شدت تاثر بھی مرتب کرتی ہے۔ اس طرح ان کی غزل گوئی میں سادگی بے مثال اور لاجواب ہو جاتی ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

یہ غدرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہئے ستانے کو

الٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومنؔ کی غزلیں انہیں تمام خصوصیات کی وجہ سے سادگی میں بھی اپنا تاثر رکھتی ہیں۔اسی لئے انہوں نے تشبیہات واستعارات کا استعمال نہایت احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔چونکہ مومنؔ ایک بڑے شاعر ہیں اس لئے انہوں

نے بغیر ان صنعتوں کے بھی اشعار میں تاثیر پیدا کر لی ہے۔اور جہاں اس کا استعمال کیا ہے وہاں بھی ندرت خیال اور ندرت تشبیہ بھی تراشے ہیں۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ مومنؔ نے اپنی تعلیمات میں طب ونجوم سے بھی فیض اٹھایا تھا۔اور باقاعدہ ان علوم وفنون کو حاصل کر کے ان میں اپنی صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔اس لئے تمام علوم وفنون میں ان کی دستگاہ کے واضح نقوش پائے جاتے ہیں۔حالانکہ ان علوم وفنون کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی ہے۔لیکن موصوف کے کلام میں ان علوم وفنون کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ان کی حالات زندگی کے مطالعے سے بھی موصوف کی طب ونجوم میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔اور علم نجوم سے متعلق کئی قصے بھی بیان کئے گئے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومنؔ بلا کے ذہین تھے۔اس لئے اس ماحول سے انہوں نے بہت جلد بہت کچھ حاصل کیا۔مشہور یہ ہے کہ استاد کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے وہ انہیں از بر ہو جاتے تھے۔غرض مومنؔ نے اس علمی ماحول میں شاہ عبدالقادر جیسے استادوں سے درسیات کی تکمیل کی اور اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے۔جو ان کا آبائی پیشہ تھا۔طب کی تعلیم انہوں نے اپنے والد غلام نبی خان اور اپنے چچا غلام حیدر خان اور غلام حسن خان سے حاصل کی۔اور اس فن کو کمال تک پہنچایا۔طب کی تکمیل کے بعد ان کی تنوع پسند طبیعت علم نجوم کی طرف راغب ہوئی۔چنانچہ وہ اس طرف بھی متوجہ ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی۔نجوم کے ساتھ ساتھ شطرنج کی طرف بھی راغب ہوئے اور اس فن پر بھی بہت تھوڑے عرصہ میں حاوی ہو گئے۔اس عرصہ میں شاعری سے انہیں برابر خاص نسبت رہی۔چنانچہ ابتداء میں اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھایا لیکن کچھ عرصہ بعد بعد ان سے اصلاح لینی

چھوڑ دی اور پھر کبھی کسی استاد کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ شعر کہتے رہے اور اس میں بھی جلد ہی اپنی ایک حیثیت بنالی۔ یہاں تک کہ ان کا شمار اس دور کے مشہور اساتذہ میں ہونے لگا۔''

(کلیات مومن مقدمہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی)

ظاہر ہے مومن خان مومنؔ نے حصول تعلیم کے زمانے میں طب کی کتابیں اپنے والد اور چچا سے پڑھی اور اس علم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد پیشہ طبیب سے بھی منسلک ہو گئے تھے۔ اور مطب میں بیٹھ کر نسخہ نویسی بھی کرنے لگے تھے۔ طب کے متعلق مومنؔ کے فارسی خطوط اور قصائد میں زیادہ واضح ذکر ملتا ہے۔ مومنؔ نے چونکہ عاشقانہ طبیعت پائی تھی۔ اس لئے ان کا دل طب میں نہ لگا اور پھر انہوں نے شاعری میں جگہ بنالی۔ غرض یہ کہ ایک طبیب شاعر کے لبادے میں گھومنے لگا۔ اس سلسلے میں سیدّ امتیاز احمد کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''درسیات کو ختم کرنے کے بعد اپنے والد حکیم غلام نبی خاں اور اپنے دونوں چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ''ہر کہ درکانِ نمک رفت نمک شد'' حکیم مومن خان کی شخصیت بھی مومن شاعر کی شخصیت میں جذب ہو کر رہ گئی۔ مومنؔ نے طب پڑھی، طبابت کی مگر وہیں تک جہاں تک ان کی عاشقانہ انداز طبیعت کا تقاضا تھا۔ مومنؔ کے یہاں طب نے دراصل شاعری کا جامہ پہن لیا۔''

(مطالعہ مومنؔ: مضمون نگار، سیدّ امتیاز احمد ص ۱۱)

مومنؔ نے غزل کے علاوہ قصیدہ اور مثنویوں میں بھی علم طب کے متعلق اشعار کہے ہیں۔ جن میں کہیں اپنی طبابت کا دعویٰ کیا ہے۔ کہیں اپنے اس علم میں کمال حاصل ہونے کی بات کہی ہے۔ اس سے قبل کہ ان کے اس قبیل کے اشعار نقل کئے جائیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ علم طب کے تعلق سے جو حکم چند نیّر نے حقیقت بیانی کی

ہے وہ بھی آپ کے پیش نظر آ جائیں چونکہ مومنؔ کی طباعت ہر عام وخاص سطح پر قدر واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی اس کا بیّن ثبوت فراہم ہو سکے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ شاہی طبیب کے طور پر کسی نواب کے ملازم بھی ہو گئے تھے۔ جناب کلب علی خان فائق کا خیال ہے کہ نواب فیض محمد خاں والی جھجر کے دربار میں ملازم ہوئے تھے۔ انشائے مومن میں ایک خط شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن نے کچھ عرصے شاہی طبیب کے فرائض انجام دئے۔ لیکن نواب کی بے رخی دیکھ کر ملازمت چھوڑ دی اور واپس دہلی آ گئے۔''

(مومن خان مومنؔ حیات وشاعری، مضمون نگار، خلیق انجم، مرتبہ نذیر احمد، ص ۱۸)

منقولہ بالا بیانات اور اقتباسات سے واضح ہے کہ مومنؔ ہر خاص و عام میں اپنے علم طب کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ تمام محققین وناقدین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ جیسا کہ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کے اقتباس سے بھی واضح ہے۔ اس سلسلے میں مولوی کریم الدین احمد نے تو نہایت غلو سے کام لیا ہے۔ مولوی کریم الدین کا خیال ہے کہ مومنؔ بوعلی سینا سے بھی بلند علم وفضل رکھتے تھے۔ علم طب میں مومنؔ نے بڑی قدرت پائی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''بوعلی سینا اگر ساری عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ آئے (گلدستہ نازنیناں ص ۱۰۲) میرے خیال میں اس طرح کے بیان سے حقیقت بھی پس پشت چلی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ضمیر الدین احمد بمعروف عرش گیاوی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''جب مومنؔ اچھے خاصے عالم ہو گئے تو خاندانی فن کی طرف رجوع یعنی والد اور چچا غلام حسن خان اور حکیم غلام حیدر خاں سے طب کی تکمیل کی اور انہیں کے مطب میں طریقہ تشخیص کے ساتھ نباضی اور نسخہ نویسی بہ غور سیکھی اور ان بزرگوں کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ اس فن میں یہ آبرو پائی کہ اب تک طب کی بڑی بڑی کتابوں میں ان کے نام پہ نسخے موجود ہیں۔ در

حقیقت یہ ان کی انتہائی ذہانت تھی کہ یہ موجدان فن طب کے نقشِ پا تسلیم
ہوئے اور صاحب تصنیف بھی ہوئے۔''

(حیات مومن: عرش گیاوی، ص ۳۷)

لیکن عرش گیاوی کی پوری بات تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ مومن تمام قدر و مہارت کے باوجود اس فن میں کوئی تصنیف چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔ حالانکہ عرش گیاوی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ صاحب تصنیف بھی ہوئے لیکن اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ یہ صرف زبانی دعویٰ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں اس فن میں دستگاہ حاصل ہوگئی تھی اور علم طب کی کتابوں میں بھی ان کے طریقہ علاج کا ذکر موجود ہے۔ یہی مومن کے لئے باعث فخر وانبساط ہے۔

اسی طبابت کے زمانہ میں مومن کی ملاقات بصورت مریضہ امتہ الفاطمہ المعروف بہ صاحب جی سے ہوئی تھی۔ اور مومن کے ان کے علاج کے لئے جوامتہ الفاطمہ کا ہاتھ پکڑ کے نبض دیکھا وہ خود ان کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ اس کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد مومن نے جو غزل کہی اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

کیا لگا دست دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

کس کے ہاتھوں سے لگا تھا کہ جدا
نہیں ہوتا دل ناکام سے ہاتھ

ہاتھ دیتے تو ہو اب ہاتھ میں پر
کان پر رکھئے گا پھر نام سے ہاتھ

کیا کہوں آہ بقول مومن

دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

اسی پس منظر میں موصوف نے اپنی ایک مثنوی ''قول غمیں'' میں جو اشعار کہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا

ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا

اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے

دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے

آفت تازہ جو جان پر آئی

یہ غزل اپنی زبان پر آئی

اسی پیشہ طب سے متعلق موصوف نے اپنے قصیدہ منقبت کی تشبیب میں واضح اشارہ کیا ہے اور اس فن پر ماہرانہ دسترس کا بھی اعلان کیا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے خاندانی افراد یعنی ورثہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بھی اس فن میں مہارت رکھتے تھے اور میں بھی ان سے تعلق رکھتا ہوں اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے فنون و علوم

خدا کسی کو نہ دے ایسے طالع منکوس

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر

کرے معارضہ سر دفتر عقول و نفوس

طبیب وہ ہوں کہ ہو ساز سینۂ بلبل
نظارہ رُخ گلفام سے مجھے محسوس

جو ہوں معالج مبطون تو قابض ارواح
کرے دعائے رواجِ طریق جالینوس

درم ہو چارہ گرِ فیض تابدست لئیم
کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ مغز فلوس

قصیدہ نواب ٹونک کی تشبیب میں اپنے ورثہ پر فخر کرتے ہوئے اشعار ؎

مرے سینہ کے صفحہ میں ہے رقم
علم دانا دلان، یونانی

مجھ تلک پہونچے ہیں اب وجد سے
ورثہ نکتہ ہائے لقمانی

مومنؔ کی حالات زندگی کے مطالعے سے بھی واضح ہے کہ انہیں نے علم طب اپنے خاندانی رواج کے مطابق پڑھا اور پھر دیگر افراد خاندان کی طرح اسے اپنا پیشہ بنایا۔لیکن چونکہ موصوف کی طبیعت میں عاشقانہ رویہ زیادہ گہرا تھا۔اس لئے انہوں نے طبیب کی روح کو شاعری کا جامہ پہنا دیا۔پھر ان کی شاعری میں غزل ہو، نظم ہو، قصیدہ ہو، مثنوی ہو تمام جگہ اس علم وفضل کا اظہار شعری پیکر میں واضح ہونا واجب ہی تھا۔موصوف پیشہ کے اعتبار سے طبیب، ذوق کے اعتبار سے عالم اور شوق کے مناسبت سے عاشق تھے۔اسی طرح جب ان کی طبیعت طب سے بھر گئی تو انہوں نے علم نجوم کی طرح اپنی توجہ مبذول کی اور اس فن کو حاصل کرنے میں لگ گئے اور رفتہ رفتہ اس علم میں

بھی اپنی استادی کا ڈنکا بجانے لگے۔ علم نجوم کے سلسلے میں محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آبِ حیات میں موصوف کی اس علم ودانش کا اظہار یوں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''اس کو(نجوم)اہلِ کمال سے حاصل کیا۔ اور مہارت بہم پہنچائی ۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک ستاروں کے مقام اوران کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی ۔ جب سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے۔''

(آبِ حیات، مصنفہ: محمد حسین آزاد، ص ۴۱۳)

مومنؔ کے احوال وکوائف کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مومنؔ علم نجوم میں کمال رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انشائے مومنؔ میں موصوف نے اپنے خطوط میں بھی اس امر کی وضاحت کی ہے۔ خط چونکہ فارسی زبان میں ہے اس لئے اس کا فارسی متن نقل نہیں کررہا ہوں۔ لیکن مومنؔ کی اختر شناسی کا بڑے بڑے منجم لوہا مانتے تھی۔ اس تعلق سے کئی واقعات جو ان کی زندگی میں پیش آئے تھے بیشتر نقادوں اور محققوں نے صفحہ قرطاس پر رقم کئے ہیں جو موضوع کے تعلق سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لئے چند اقتباسات اس سلسلے کے رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

''مشہور ہے کہ ایک برہمن آیا اور کہا کہ میں لٹ گیا۔ مومنؔ نے صورت دیکھتے ہی کہا کہ تمہارے یہاں چوری ہوئی ہے۔ برہمن نے عرض کی کہ جو کچھ زیور تھا وہ چوری ہوگیا۔ فرمایا کہ وہ زیور تم نے تمہاری بیوی نے چرایا ہے۔ برہمن کو اچنبھا ہوا کہ میں نے زیور بنوایا اور بیوی کی ملکیت ہے پھر ہم دونوں کے چرانے کا کیا سوال۔ جواب دیا کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہو اس نے بتایا کہ مکان کا ایک ایک کونہ تلاش کیا جاچکا ہے۔ مومنؔ نے مکان کا نقشہ اور اس میں

کمرہ کا رخ جس کے مچان پر وہ زیور رکھا تھا پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔

ان کے نجوم کا دوسرا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حکیم سکھا نند رقم کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ کھیل کے دوران میں فرمانے لگے جب سامنے والی دیوار پر جو چھپکلی ہے اس کا جوڑا پورب سے آئے گا۔ اس وقت آپ پر مات ہو جائے گا۔ حکیم صاحب کو حیرت ہوئی کہ پورب سے جوڑا کیونکر آئے گا۔ اسی وقت ایک بزاز آیا اور کپڑے دکھانے کا خواہش مند ہوا۔ جب اس نے گٹھری کھولی تو اس میں سے ایک چھپکلی نکلی اور سامنے کے دیوار پر پہونچ گئی اور یہ وہی موقعہ تھا جب مومن نے حکیم صاحب کو متنبہ کیا کہ ان پر مات ہو رہا ہے۔ جب بزاز سے اس کے وطن کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ پورب کی طرف سے آیا ہے۔''

(مومن شخصیت اور فن: پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص ۸۹)

اس طرح مومن کی اختر شناسی کے سلسلے میں اور بھی کئی قصے بیان کئے جاتے ہیں جو موضوع کے تعلق سے ماہرانہ دسترس کی دلالت کرتے ہیں۔ پہلا واقعہ موصوف کے علم نجوم سے اور دوسرا علم رمل سے متعلق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان واقعات کی صحت اور جواز جو بیان کئے جاتے ہیں ان میں کئی اعتراضات کے پہلو بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔زیور کی گمشدگی والے واقعہ کے ختم ہونے کے بعد محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں اس طرح کے دیگر واقعات جو کسی نے بذریعہ مراسلہ ان تک پہنچا تھا۔ اس کو محمد حسین آزاد نے شامل نہیں کیا۔ ان کا یہ نوٹ ملاحظہ فرمائیں :

''ایک صاحب کا مراسلہ اسی تحریر کے ساتھ پہنچا ہے، جس میں یہ اور اس قسم کے کئی اسرار نجومی ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ آزاد ان کے درج کرنے میں قاصر ہے۔ معاف فرمائیں ۔ زمانہ ایک طرح کا ہے، لوگ کہیں گے، تذکرہ شعرا لکھنے بیٹھا اور

نجومیوں کا تذکرہ لکھنے لگا۔''

(آبِ حیات: محمد حسین آزاد ص، ۴۷)

غرض یہ کہ آبِ حیات میں جو واقعے درج کئے گئے ہیں انہیں کو لوگ بیان کرتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی مومنؔ کے علم نجوم سے متعلق کئی واقعات درج کرنے سے رہ گئے۔ اس سے ہمیں آج بھی ناواقفیت ہے۔ بہر کیف اتنا تو واضح ہے کہ مومنؔ کو علم نجوم و رمل دونوں میں مہارت حاصل تھی۔ منقولہ بالا دونوں واقعات کی روشنی میں نثار احمد فاروقی کی رائے ملاحظہ فرمائیں جو اعتراضات کے سلسلے میں ہے:

''اس واقعے سے مومنؔ کی ستارہ شناسی اتنی ثابت نہیں ہوتی، جتنا یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں علم غیب بھی حاصل تھا۔ حالانکہ جس مکتب فکر سے ان کا تعلق تھا اس کا کہنا ہے کہ علم غیب خدا کے سوا کسی کو نہیں .... اس میں بھی وہی غیب دانی والی بات ہے، یا پھر مومنؔ اتنے پہنچے ہوئے تھے کہ انہیں شطرنج کھیلنے میں بھی کشف ہوتا رہتا تھا.......... یہ چھپکلی والا واقعہ متعدد بزرگوں کی کرامات کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ روایت حضرت شاہ عفد الدین چشتی صابری (مصنف مقاصد العارفین) کی کرامت کے ذیل میں سید نثار علی بخاری بریلوی نے شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی کے ملفوظات ''مفتاح الخزاین'' میں لکھا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس میں شطرنج کا ذکر نہیں.......... مزید لطف یہ کہ مومنؔ کی ایک رباعی کے حوالے سے (ظہیر احمد صدیقی) نے یہ بھی لکھ دیا کہ ''اگر چہ مومنؔ زبردست منجم تھے مگر وہ خیام کی طرح علم نجوم پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔'' اس جملے نے تو ستارہ شناسی کی مہارت کے سارے قصوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ یوں کہا جائے، اگر چہ مومنؔ بڑے حاذق طبیب تھے۔ مگر وہ یونانی طریق علاج میں

اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔''

(مومن خان مومنؔ: ایک مطالعہ مضمون نگار: نثار احمد فاروقی ص ۲۶۔۲۴)

مومن خان مومنؔ کے علم وفضل پر ناقدین نے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ یکساں طرح کے واقعات اور کرامات کے ذکر صرف مسلمانوں کے یہاں ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی مل جاتے ہیں۔ جہاں واقعات کی تھوڑی سی ردوبدل کے بعد کشف وکرامات کسی دیگر اشخاص کے تعلق سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ مومنؔ کے علم وفضل کے قصے اور من گرہت ہیں۔ ہاں بیان کے اسلوب میں کچھ ضمنی باتوں کی طرف اعتراضات واجب ہیں لیکن ان واقعات کو سرے سے کوئی خارج نہیں کرسکتا ہے۔ پھر زمانے کی تبدیلی کے ساتھ لوگوں کا نظریہ اور چیزوں کی حقیقت میں بھی تغیر آتے رہتے ہیں۔ بہر کیف اتنا تو واضح ہے کہ مومنؔ ایک باکمال منجم تھے بھلے ان باتوں پر ان کا مذہبی عقیدہ نہ تھا۔ لیکن علم کے جاننے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ ایک اور واقعہ موصوف کی اختر شناسی کے تعلق سے اہم ہے جو ان کے اشعار کی تاویل وتشریح میں بیان کیا جاتا ہے کافی دلچسپ ہے جسے سیّد امتیاز احمد نے اپنے مضمون میں رقم کیا ہے ملاحظہ فرمائیں :

> مومنؔ کی اختر شناسی بھی ان کی عاشقانہ طبیعت کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ دنیا میں کم ہی لوگ ہوں گے جو آئندہ کی باتیں جاننے کے خواہاں نہ ہوں خصوصاً صنف لطیف یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مومنؔ خان ابتدائے شباب میں زندہ دل، یار باش، آزاد مشرب، رنگین طبع، وارفتہ مزاج آدمی تھے۔ طبابت اور اختر شناسی نے ان کے لئے اور بھی سہولتیں پیدا کر دیں تھیں۔ چنانچہ نجوم سے مومنؔ وہ کام لیتے ہیں جو ایک عاشق کو لینا چاہئے۔ ایک بار اختر شناس آتش فراق میں جل رہا تھا۔ کچھ دل میں آیا۔ زائچہ اٹھایا دیکھا تو ستارے مہربان تھے، امید وصل نے دل کو تسکین دی اور جوش میں اپنے مطلوب کو جا کر یوں مطلع کیا۔

کہاں ہے بدر سیما وہ ترجم
کہ ہوں میں رازدانِ سیر انجم
نہیں کیا تم نے احکام آزمائے
انہیں باتوں نے تو یہ دن دکھائے
یہ سب کچھ سچ پر ابا بھی کہیں گے
کہ جیتے ہیں تو اِک دن مل رہیں گے
سلیمان ہمدم بلقیس ہوگا
قرآن زہرہَ برجیس ہوگا
ابھی سے گر جفا کم ہو تو اچھا
زیادہ ربط باہم ہو تو اچھا
نہیں تو ہوگی اس کی شرم ساری
کسے منظور ہے خجلت تمہاری۔''

(مطالعہ مومنؔ: مضمون نگار سیّد امتیاز احمد ص ۱۳)

مومنؔ چونکہ شاعر ہیں اور اختر شناس بھی ہیں۔ اس لئے انہیں ستاروں کی رفتار کا علم ہے اور وہ ان ستاروں کی حقیقت سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جوان کے تڑپتے ہوئے دل کو اس وقت سکون دیتا ہے۔ فراقِ یار سے نجات کا باعث بنتا ہے۔ اور بلند حوصلگی سے اپنے محبوب و مطلوب سے ملاقاتیں ہوتیں ہیں۔ لیکن ستارے ہمیشہ موافق ہی نہیں ہوتے کبھی کبھی ناموافق صورت حال کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں یہی علم نجوم ان کے ذہنی کرب کا باعث بن جاتا ہے اور قبل از وقت اپنی بربادی کا علم بھی کراتا ہے۔ جس سے انسان بیزار بھی ہوسکتا ہے۔ اس وقت اس کو اپنی علم و دانش پر رنج و ملال بھی ہوسکتا ہے۔ اسی لئے مومنؔ نے اپنی تیرہ اختری کا ذکر اپنی غزلوں کے اشعار میں بھی کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

دن بھی دراز، رات بھی کیوں ہے فراق یار میں
کاہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں

غزل کے بعد مثنوی کے اشعار میں اصطلاحات نجوم ملاحظہ فرمائیں۔

جوں ہی اس گھر میں ہوا اپنا گزر
آئی کچھ تثلیث، زہرہ کی نظر

ہے یہ نئی گردش چرخِ کبود
اختر عاشق کو ہوا اتنا صعود

حکم عشرت داں فضائے مشتری
معجزہ زہرہ روائے مشتری

تازہ رجعت رشک وصل یار میں
نحس اکبر طالع اغیار میں

مومنؔ خان مومنؔ نے اپنی اختر شناسی کا غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ میں دعویٰ کیا ہے۔ اس سلسلے میں حالات زندگی کے مطالعے سے اس علم و فضل کا ثبوت جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان کے اردو کلام اور فارسی کلام میں درجنوں اشعار اس قبیل کے بکھرے ہوئے ہیں۔ مومن خان مومنؔ نے کنور اَجیت سنگھ کی شان میں قصیدہ لکھا تھا اور کنور

اَجیت سنگھ نے انہیں ہتھنی عنایت کی تھی اس تعلق سے مومن کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

اسی طرح دیگر قصیدوں میں بھی اس تعلق کے اشعار ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہے اس طرح فرح انگیز کو کوئے قمری
کہ جیسے فوج مظفّر کو شور و غلغل کوس

کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آکر روانِ بطلیموس

مرے کلام ثریّا نظام کا منکر
وہ تیرہ روز جو برجیس کو کہے منحوس

طلسم ماہ لکھوں گر پئے زماں بستن
بنا ہے مہر دہن چرخ نکتہ جاسوس

یقیں کہ زہرہَ و خورشید میں مقابلہ ہو
پڑھوں جو میں پئے دوری دعائے بدر بطوس

واہ اے چرخ تیری نافہمی
مراوج کمال فال اختر

قاضی مشتری کمال سے ہیں
ہندوانِ زحل شیم برتر

منشیانِ عطارد آسا کو
نور خورشید سوز حسرت زر

صدر انجم شناس سے تاباں
مہ کامل کی طرح داغِ جگر

زحل پرست جو میری عزیمتِ منظوم
پڑھے تو لخلخۂ مشک ہو دخانِ عقل

نہ یہ سمجھا ہوں سیر اختر سے
علم ظنّی نہ ہووے ایقانی

رہے نہ بیم خسوف اور نہ احتمالِ غروب
جو اس کی رائے سے ہو مبتغے مہہ کامل

توسنِ چرخ سے تشبیہ فلک کا تیرے سنگ
کلب جبّار سے نسبت سگِ در کو تیرے عار

دُزدۂ اوج سے برجیس کو رجعت ہوجائے
ثور میں زہرہ کرے مہہ کے قراں سے انکار

تاکہ ہوجائے ہر آزار کا مصدر ایک ایک
سخت تحسین کو ہے دفع طبیعت کو قرار

زیست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا
بھول جائیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

ہے ترے در پہ منحصر اب جو شرف تو جائے تنگ
ماہ کو بیت زہرۂ و زہرہ کو بُرجِ مشتری

اس طرح موصوف نے اپنے قصائد میں نجوم واختر کا ایک دوسرے کے ساتھ آنا کبھی صاد کبھی نحس سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کے تمام تراکیب واصطلاحات سے مومن نے اپنی مقصد براری کا کام لیا ہے۔ نجوم سے ہی متعلق علم رمل سے بھی مومن واقفیت رکھتے تھے۔ جس کے تعلق سے گذشتہ سطور میں حوالہ بھی پیش کیا جاچکا ہے واضح ہے کہ انہیں اس فن پر بھی دسترس حاصل تھی۔ جس کی نشاندہی منقولہ بالا اشعار سے ہوتی ہے۔ مولوی کریم الدین

نے طبقات الشعراء میں علم نجوم اور رمل کے متعلق لکھا ہے کہ انہیں دونوں علوم میں مہارت حاصل ہے :

''مومنؔ مذکور کو علم نجوم اور رمل بھی خوب آتا ہے۔''

(طبقات الشعرائے ہند: مولوی کریم الدین، ص ۴۴۵)

اس سلسلے میں انگریز شاعر جارج برنس شورؔ نے اپنی مثنوی میں مومن خان مومنؔ کے علم نجوم اور رمل کا ذکر یوں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ مومنؔ بھی شاعر وہ انسان تھے
جنہیں مانتے سب مسلمان تھے

یہ رمّال بھی ایسے تھے انتخاب
حساب رمل جن کا تھا لاجواب

اور حکمت میں وہ تھی انہیں دست گاہ
ارسطور سمجھتا تھا پشت پناہ

مومنؔ کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومنؔ کو علم طب، علم نجوم و رمل سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ انہوں نے اس علم و فضل میں اپنی استادی قائم کی تھی۔ انہوں نے اپنی موت کے متعلق بھی پیش گوئی کی تھی اور مرنے کی تاریخ پانچ دن یا پانچ ماہ میں رخصتی کی بات کہی اور ٹھیک پانچ ماہ بعد کوٹھے سے گر کر انتقال کر گئے۔ اور اپنے وفات کی تاریخ ''دست و باز و بشکست'' سے نکال دی تھی۔ ان تمام باتوں کے بعد بھی یہ بھی واضح ہے کہ مومنؔ کو علم نجوم پر اعتقاد نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ ان کی دین اسلام سے واقفیت ہی رہی ہوگی۔ کیونکہ اسلام میں اس طرح کے کسی بھی عقیدہ کی واضح طور پر ممانیت کی گئی ہے۔ اس لئے موصوف نے اپنے ایک فارسی خط میں اس نکتے پر روشنی ڈالی ہے۔ فارسی متن کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :

ترجمہ :

''افسوس کہ مومنؔ لا تتحر کذرۃ الاذن اللہ کے اعتقاد کے باوجود ستارہ

پرست ہے اور دنیا سے اتنی بے تعلقی کے باوجود صبح سے شام تک اصطرلاب

(۱) کا علاقہ ہاتھ میں لئے رہتا ہے۔ آفتاب کی بلندی اختر شناس (مومن)

کے قسمت کی پستی کی گواہ ہے اور تسوید البیوت (۲) اس ست بنیاد (مراد

خود) کی خانہ خرابی کی دلیل ہے۔''

ایک فارسی رباعی کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیں :

''دیکھئے میرا طالع اور نصیب کیا ہوگا

میرا دن سراپا رات ہے پھر رات کیا ہوگی

میں ستارہ شناس ہوں لیکن اتنا نہیں

جانتا کہ میرا طالع اور ستارہ کیسا ہے

اس طرح واضح ہے کہ مومنؔ ایک ماہر نجوم ورمل تھے لیکن بہ اعتبار اعتقاد وہ ان باتوں پر دل سے یقین نہیں کرتے تھے۔ یعنی ایمانی سطح پر وہ ان باتوں کو لائق اعتبار نہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ شطرنج، ریاضی اور موسیقی سے بھی گہرا انسلاک رکھتے تھے۔ جیسا کہ مختلف اقتباسات اور بیانات سے گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے۔ پھر علم نجوم سے متعلق جو محمد حسین آزاد نے واقعہ درج کیا ہے اس میں بھی مومنؔ کو شطرنج کھیلتے ہوئے بتایا گیا ہے۔ اور انہوں نے یہی پیش گوئی کی تھی کہ دیوار پر موجود چھپکلی کا جوڑا جیپورب سے آجائے گا تو میں آپ کو مات دے دوں گا۔ اس واقعہ سے دوسرا نکتہ جو واضح ہوتا ہے وہ موصوف کی شطرنج سے وابستگی اور اس فن میں ان مہارت ہے۔ جو کسی محقق سے چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ تمام محققین نے اس موضوع پر قطعیت سے بیان کیا ہے کہ مومنؔ شطرنج کے بہترین کھلاڑی تھے اور علاقے میں ان کے مقابلے کا دوسرا شاید ہی کوئی شخص ہو۔ اس سلسلے میں ظہیر احمد صدیقی

۱؎ ستاروں کے فاصلے کوناپنے کا آلہ

۴۔ کاغذ پر بارہ برجوں کی شکل بناتے ہیں اور ہر خانہ میں ستاروں کے نام لکھتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے کی خوش بختی یا نحوست کے بارے میں معلوم کرتے ہیں۔

کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''شطرنج سے خاص شغف تھا۔ دہلی کے مشہور شاطر کرامت علی سے رشتہ داری بھی تھی ۔کہا جاتا ہے کہ دہلی میں چند منتخب شطرنج کھیلنے والوں میں ایک مومن خان مومنؔ بھی تھے۔ ارواح ثلٰثہ میں روایت ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی سے غالبؔ نے دریافت کیا کہ آخر شطرنج میں مومنؔ سے ہار جانے کا سبب کیا ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ ''مومنؔ بھیڑیا ہے جسے اپنی قوت کی خبر نہیں اگر وہ عشق و عاشقی کے قصوں کو چھوڑ کر علمی مشاغل میں پڑتا تو اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔'' ریاضی کے علم میں وہ خواجہ نصیر کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا مدمقابل نہ گردانتے تھے۔''

(ہندوستانی ادب کے معمار مومن خان مومنؔ: ظہیر احمد صدیقی، ص ۲۰)

مومنؔ کی شطرنج سے وابستگی کے متعلق محمد حسین آزاد نے بھی ''آبِ حیات'' میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مومنؔ شطرنج کھیلنے میں اس قدر دل و دماغ کو منتقل کر لیتے تھے کہ انہیں باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا علم بھی نہ رہتا تھا۔ اور وہ ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ اسی طرح کی بات مومنؔ کے شاگرد مرزا رحیم الدین حیا نے بھی کہی ہے ۔انہوں نے کہا ہے کہ جب وہ شطرنج کھیلنے بیٹھتے تھے تو سارا دن، ساری رات کب گذر جاتی تھی اس کا انہیں پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ حتیٰ کہ انہیں بھوک کی شدت کا بھی احساس نہ ہوتا تھا۔ دونوں اقتباس تواتر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں :

''شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی ۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی ۔ اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو

مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔"

(آبِ حیات: محمد حسین آزاد، ص ۴۴۴)

مرزا رحیم الدین حیا کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

"اس فن میں انہاک کی یہ صورت تھی کہ صبح بیٹھتے تو چراغ جل گیا اگر شام کو بیٹھے تو صبح ہوگئی۔ کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بساط کے کسی خانے سے پیادہ کے ساتھ صبح کو نکلے تو منزل طے کر کے دوسری صبح کو گھر پلٹے۔"

(حیات مومنؔ: عرش گیاوی مضمون نگار مرزا رحیم الدین حیا، ص، ۳۹)

مومن خان مومنؔ طب، نجوم ورمل، شطرنج، ریاضی اور موسیقی وغیرہ علوم وفنون میں ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ اسی طرح ان کے شطرنج کھیلنے اور اس کھیل میں سامنے والے کو مات دینے کے بھی کئی واقعات ان کے احوال و کوائف کے بیان میں بیشتر محققین نے درج کئے ہیں۔ اس سلسلے میں سید امتیاز احمد کا بھی بیان ملاحظہ فرمائیں جو ان کی شطرنج میں مہارت کی دلیل پیش کرتا ہے :

"نجوم اور رمل حکیم مومنؔ کی بے قرار طبیعت کو زیادہ دنوں تک سکون نہ دے سکے۔ مومنؔ نے شطرنج سے دل بہلانا چاہا اور اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دلّی ایسے شہر میں ان کا شمار شاطروں میں ہونے لگا۔ کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ تھی جو وہاں کے مشہور ترین شاعر تھے۔ لیکن مومنؔ کی منچلی طبیعت شطرنج، نجوم، رمل، طبابت سے بہل نہیں سکتی۔ صرف ایک شاعری تھی جو البتہ اسے سکون دے سکتی اور اس منزل پر پہونچ کر ان کی بے قرار طبیعت کو قرار آتا تھا۔"

(مطالعہ مومنؔ: مرتبہ ساحل احمد، مضمون نگار: سید امتیاز احمد، ص ۱۵)

مومن خان مومنؔ شطرنج میں نہایت ماہر گردانے جاتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ اپنے دواحباب جن کے ساتھ بیٹھ کے شطرنج کھیلتے تھے یعنی کرامت علی کے مرنے پر فارسی زبان میں ایک قطعہ تاریخ کہا جس میں اس کھیل کی طرف اشارہ ہے۔ملاحظہ فرمائیں ؎

منصوبہ مرگ بیں کہ بے مات
نہ گذاشتہ ہیچ آدمی را
زیں خانہ بہ خانہ عدم برو
یک کشت کرامت علی را
افسوس کہ طرفہ شہ رُخے خورد
نادیدہ عسرائے مدعی را
تا فکر شمار سال تاریخ
زچ کردہ رقوم ہندسی را
گفتم کرامت علی خاں
تہہ کردہ بساطِ زندگی را

مومن خان مومنؔ نے ایک رباعی میں شطرنج کے کئی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔رباعی ملاحظہ فرمائیں ؎

صد حاست دریں عرصہ عرائی غم و رنج
مات اند ہنر و ران بہ منصوبہ گنج

افتادہ بدست ایں و آں باہمہ لہو
سلطان زماں ماست شاہ شطرنج

(عرصہ۔عرا۔مات۔منصوبہ،شاہ شطرنج یہ تمام اس کھیل کی اصطلاحات ہیں) شطرنج کے تعلق سے مولانا

فضل حق کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ وہ بھی شطرنج کے ایک ماہر کھلاڑی تھے۔ گذشتہ اقتباس میں ان کے متعلق ذکر ہو چکا ہے کہ وہ اکثر مومنؔ سے مات کھا جایا کرتے تھے۔ موصوف کا شطرنج کے تعلق سے ایک شعر جو اردو میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نزد بازوں کو عہد میں تیرے

شش جہت جیسے مہدۂ ششدر

جب مومنؔ کا دل شطرنج سے بھی بھر گیا تب انہوں نے موسیقی کی طرف توجہ کی اور موسیقی میں بھی نام کمایا۔ اس کے علاوہ وہ ریاضی کے علم سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے تو آبِ حیات میں مومنؔ کے علم طب، علم نجوم اور شطرنج کا ذکر کیا ہے لیکن موسیقی اور علم ریاضی کے متعلق خاموش رہے ہیں۔ شاید ان کے معلومات میں یہ باتیں نہ رہی ہوں یا پھر انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ علی ہٰذا القیاس لیکن یہ تو سچ ہے کہ مومنؔ موسیقی اور علم ریاضی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ اس بات کا ذکر ضیا احمد بدایونی نے اپنی تحقیق میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں عرش گیاوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومنؔ شطرنج اور رمل وغیرہ کے شوق کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھے۔ علم موسیقی، ریاضی، صنعت وحرفت میں سادہ کاری میں، آتش بازی وغیرہ میں بھی ایجاد کا مادہ انہوں نے پیدا کیا۔ ان فنون میں دلچسپی رکھنے والے مومنؔ خاں کے دربار میں برابر آیا کرتے تھے اور فیضیاب ہوتے تھے۔ سادہ کاری کی چیزیں خود ان کی بنائی ہوئی ان کے خاندان میں موجود ہیں۔''
>
> (حیات مومنؔ: عرش گیاوی، ص ۴۰)

عرش گیاوی نے مومنؔ کی علم موسیقی اور ریاضی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ مومنؔ کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ عبدالحی انصاری نے مومنؔ کی پتنگ بازی کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ پتنگ کے ذریعہ اپنی منظور نظر کو خط بھیجا کرتے تھے۔ بہر کیف مومنؔ عاشق مزاج تھے اور اپنی ذہنی آسودگی

کے لئے کئی طرح کے علوم وفنون میں اپنا کمال ثابت کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ مشاعروں میں بہت ہی دل پذیراور دردناک آواز میں غزل پڑھا کرتے تھے۔اس سے بھی ان کی موسیقی سے فطری انسلاک کا پتہ چلتا ہے۔ مومنؔ کی موسیقی سے قربت بے انتہا رہی ہے۔اس سلسلے میں کلب علی خان فائق نے اپنے مضمون میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ملاحظہ فرمائیں :

''خاندانِ خواجہ میر دردؔ کو موسیقی سے انتہائی لگاؤ تھا۔ چنانچہ مومنؔ کے خسر خواجہ محمد نصیر نبیرۂ خواجہ میر دردؔ کو بھی موسیقی میں دستگاہ تھی۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی تھی اور علما ومشائخ اور اکثر امراءشرکت کرنا فخر سمجھتے تھے۔ یہ مجلس سماع خواجہ محمد نصیر کے مرنے پر مولوی یوسف علی خاں صاحب سجادہ نشیں نے جاری رکھی۔ میر ناصر احمد نبیرۂ ہمت خاں، بقول سر سیّد احمد خاں نغمہ سرائی اور بین نوازی میں یکتائے روزگار ہیں۔ یہ بھی خواجہ شاہ محمد نصیر کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے بعد انتقال مولانا یوسف علی سجادہ نشیں کی مجلس میں شریک ہوتے، اب جانب اودھ روانہ ہوئے ہیں (آثار الصنادید ص ۲۲۷،طبع اول غالباً) سید ناصر حبیب نے انہیں میر ناصر احمد بین نواز کو نظیر بین باز بیان کیا ہے۔ جو سماعی غلطی ہوگی۔''

(حیات مومنؔ :مضمون نگار کلب علی خاں فائق :اورینٹل کالج میگزین ،ص ۱۵)

اب ضیا احمد بدایونی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''کنیز فاطمہ صاحبہ اپنے والد سید ناصر حبیب صاحب ناصر دہلوی نبیرۂ مومنؔ کے حوالے سے بیان کرتی ہیں کہ مومنؔ مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ ان کے کمال کے معترف ہو

گئے۔''

(دیوان مومن مع شرح، مرتبہ: ضیا احمد بدایونی، ص ۲۵)

ضیا احمد بدایونی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ مومن کے انتقال کے بعد میر ناصر نے جو اس فن کے ماہر گردانے جاتے تھے اور مومن کو اپنا مدِ مقابل مانتے تھے۔ بین اٹھا کر رکھ دی اور عرض کیا کہ اب اس کا دہلی میں کوئی قدر دان باقی نہیں رہا ان تمام واقعات کا احاطہ کرتے ہوئے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے یوں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''مومن کو جن مشاغل سے دلچسپی تھی ان میں موسیقی شطرنج اور ریاضی تھے۔ عشق اور موسیقی دونوں کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ مومن کی داستان محبت کا ذکر آگے آئے گا۔ موسیقی نے ان کے جذبات کو برانگیختہ کردیا۔ موسیقی سے دلچسپی کا یہ حال تھا کہ میر ناصر جو دہلی کے مشہور بین بجانے والے تھے۔ انہوں نے مومن کے انتقال کے بعد بین اٹھا کر رکھ دی کہ اب اس کا دہلی میں قدر دان کوئی نہیں ہے۔ جب مومن کا تعلق خاندانِ درد سے ہوا تو یہ شوق اور بھی نمایاں ہوگیا۔ اس لئے کہ خود مومن کے خسر خواجہ محمد نصیر کو موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ اور ان کے یہاں برابر موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔''

(مومن خان مومن: ظہیر احمد صدیقی، ص ۲۰)

موسیقی سے متعلق مومن کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

زمزمہ سازی سے دم سازی
چنگ نوازی، گوش نوازی

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ مومن کو فن موسیقی سے قلبی لگاؤ تھا۔ اسی لئے وہ مشاعروں میں بھی ترنم کے ساتھ غزل پڑھا کرتے تھے اور جب وہ اپنی دردناک آواز میں غزل پڑھتے تو پورا کا پورا مشاعرہ وجد میں

آجاتا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ علم ریاضی کے ماہر بھی گردانے جاتے تھے۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علم ریاضی کی تعریف اوراس کے متعلق اہم نکات پر روشنی ڈال دی جائے۔"

علم ریاضی دراصل وہ فن ہے۔جس میں (Number) اعداد کے استعمال کے ذریعے مقداروں کے خاص اوران کے درمیان تعلقات کی تحقیق اور مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اس میں ساختوں ، اشکال اور تبدلات سے متعلق بحث بھی کی جاتی ہے۔اس علم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدایا ارتقاء دراصل گننے، شمار کرنے، پیمائش کرنے اور اشیاء کی اشکال و حرکات کا مطالعہ کرنے جیسے بنیادی عوامل کی تجرید (abstraction) اور منطقی استدلال (Logical reasioning) کا ذریعہ بنتا ہے۔اس فن کے اصول کے تحت مندرجہ بالا خیالات وتصورات پر بحث کی جاتی ہے۔اوراس امر کا مقصد گمان کئے ہوئے تصورات و خیالات کے لئے صیغے اخذ کرنا ہوتا ہے اور پھر نکالے گئے مسلمات اور تعریفوں اور قاعدوں کی مدد سے ریاضی کے اخذ کردہ صیغوں کو درست ثابت کرنا ہوتا ہے۔بنیادی قسم کی ریاضی کی معلومات کا استعمال زمانہ قدیم سے ہی مشتہر ہے اور قدیم مصر، بین النہرین وقدیم ہندوستان کی تہذیبوں میں اس کے آثار ملتے ہیں۔آج دنیا بھر میں علم ریاضی سائنس ہندسیات (engineering) طب اور معاشیات سمیت تمام شعبہ ہائے علم میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان شعبہ جات میں استعمال ہونے والے ریاضی کو عموماً نفاذی ریاضی (Applied Mathematics) کہا جاتا ہے۔ان شعبہ جات پر ریاضی کا نفاذ کرکے مدد لیکر نہ صرف نئے ریاضیاتی پہلوؤں کی دریافتوں کا راستہ کھل جاتا ہے بلکہ بعض اوقات ریاضی اور دیگر شعبہ جات کے ادغام یا ملاپ سے ایک بالکل نیا شعبہ علم وجود میں آجانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

علم ریاضی کا استعمال عربی زبان میں ملتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی اس علم کے نقوش ملتے ہیں۔اسلام میں اس کی ایک حسین ودلکش اور اعلیٰ ترین جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ اسلام کے روحانی انداز کی عکاسی بھی کرتا ہے۔اس علم کو قدیم روایات میں نہایت قدرواحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔اس علم کی دوشاختوں کی نشاندہی اسلامی تہذیب میں ملتی ہیں۔علم ہندسہ جس کا تعلق براہِ راست اسلامی تعلیمات کے جوہر سے ہے۔اس

حقیقی جوہر کو ہم وحدانیت کے فلسفے یعنی توحید سے تعبیر کرتے ہیں۔

خدا ایک ہے۔ یہ جملہ اپنے اندر پورے ہندسہ کو سمیٹ لیتا ہے۔ یہ وحدانیت کی علامت ہے۔ اگر ہم غور وخوص کریں تو اندازہ ہو جائے گا کہ نمبروں کا پورے کا پورا سلسلہ یہ ذات خود توحید یعنی وحدانیت کی طرف جاتا ہے۔ عربی حروف تہجی کے حروف کی عددی علامت الحفر کی سائنس سے منسلک ہے۔ انہیں حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے مرتب کیا تھا۔ یہ ہماری کتاب مقدسہ یعنی قرآن کریم کے بعض پیغامات سے بڑی گہرائی اور اندرونی صفات کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہی ہندسہ ترقی کی منزل طے کر کے علم الجمل کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور مومن خان مومنؔ نے اپنے کلاموں میں اسی کی مدد سے تاریخی قطعات کہے ہیں۔ جس کے حوالے آگے پیش کئے جائیں گے۔

یونانی گنتی کو علم نجوم میں زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے حساب النجوم کہا جانے لگا اور اس صنف میں مومن خان مومنؔ مہارت رکھتے ہیں۔ جس کی مثال گذشتہ صفحات میں مومنؔ کے علم وفضل کے تعلق سے آچکی ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ نہایت دلچسپ ہے اس لئے یہاں اسے بیان کرنا لطف اندوز ہوگا کہ شطرنج کے ایجاد کرنے والے نے جب بادشاہ کو تحفہ شطرنج پیش کیا تو اس نے خوش ہو کر پوچھا کہ اسے کیا انعام دیا جائے تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ اسے شطرنج کے خانوں کے مطابق اس ترتیب سے اناج کے دانے دئے جائیں کہ پہلے خانے میں ایک دانہ دوسرے میں دو، تیسرے میں چار، اور اسی طرح اگلے خانوں میں پچھلے خانوں سے دوگنے دانے ہوں۔ اسی طرح چونسٹھ خانوں میں دانے بھر دئے جائیں۔ بادشاہ نے پہلے تو یہ بات مان لی۔ لیکن بعد میں حساب کتاب کے بعد پتا چلا کہ اتنے دانے تو اس کی پوری ریاست میں موجود نہیں ریاضی کے اس مخصوص مسئلے کو البیرونی نے حل کیا۔ البیرونی کا یہ جواب تھا۔ کل ۱۸۴۴۶۷۴۴۰۷۳۷۰۹۵۵۱۶۱۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

المختصر یہ کہ یہ موضوع نہایت وقیع ہے اور اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام محققین اور ناقدین نے مومنؔ کے متعلق علم ریاضی کے ماہر ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے لئے کوئی دلیل اور ثبوت نہیں پیش کئے ہیں۔ مولانا ضیا احمد بدایونی سے لیکر تمام وہ لوگ جنہوں نے مومنؔ پر کام کیا ہے ان کے تمام علوم وفنون میں علم ریاضی

کا بیشتر محققوں نے صرف ذکر کیا ہے۔ لیکن اس پر تفصیل سے کسی نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ناقدین و محققین کے بیان کا وہ حصہ نقل کر دیا جائے جو علم ریاضی کے تعلق سے صفحہ قرطاس پر مختلف جگہوں پر درج ہیں۔ یوں تو علم نجوم ورمل خود علم ریاضی کا ہی ایک حصہ ہے۔ نجوم ورمل کی تمام صلاحیتوں کا انکشاف علم ریاضی کی بدولت ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص علم ریاضی سے بہرہ ور نہ ہو تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ علم نجوم ورمل کی شدبُد حاصل کر لے۔ بہر کیف پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''کسی کو اپنے برابر نہ خیال کرتے۔''

(دیوان مومنؔ مقدمہ پرفیسر ضیا احمد بدایونی، ص ۲۵)

عرش گیاوی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ شطرنج اور رمل وغیرہ کے شوق کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھے۔ علم موسیقی ، ریاضی، صنعت و حرفت میں، سادہ کاری میں، آتش بازی وغیرہ میں بھی ایجاد کا مادہ انہوں نے پیدا کیا۔''

(حیات مومنؔ: ضمیر الدین احمد عرش گیاوی، ص ۶۰)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا جملہ ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کو جن مشاغل میں دل چسپی تھی ان میں موسیقی شطرنج اور ریاضی تھے۔''

(مومن خان مومنؔ: ظہیر احمد صدیقی، ص ۶۰)

پرفیسر نذیر احمد کے خطبۂ استقبالیہ سے دو جملے ملاحظہ فرمائیں :

''شاعری کے علاوہ وہ مختلف فنون میں دستگاہ رکھتے تھے۔ طب نجوم، ریاضی، موسیقی وغیرہ فنون میں انہوں نے دستگاہ پہنچائی تھی۔''

(مومن خان مومنؔ ایک مطالعہ: خطبہ استقبالیہ، ص ۱۰)

المختصر مومنؔ کی شاعری اپنی جملہ خصوصیات کی وجہ سے معتبر اور قابلِ رشک ہے۔ جہاں ان کی غزلوں میں تغزل، نازک خیالی، محذوفات معنی، مکر شاعرانہ، پیچیدگی وسادگی وغیرہ کے ساتھ تشبیہ واستعارہ، کنایہ اور دیگر صنائع بدائع کی صنعتیں موصوف کے کلام کو مزیّن وآراستہ کرتی ہیں۔ وہیں دیگر اصناف سخن میں ان کی علم طب، نجوم ورمل اور جفر موسیقی، شطرنج، ریاضی کے اصطلاحات ونکات کی نشاندہی کراتے ہیں۔ لیکن موصوف کی غزل گوئی بطور خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اور اردو ادب میں جب بھی غزل گوشعرا کا شمار کیا جائے گا تو مومنؔ کا نام خصوصی طور پر لیا جائے گا۔ کیونکہ غزل گوئی کی روایت بغیر ان کے نام کے شمولیت کے بااعتبار سمجھی نہیں جائے گی۔ جس طرح شعرائے کرام کا تذکرہ لکھتے ہوئے محمد حسین آزاد کو قصداً ہی سہی مومنؔ کا نام اپنے تذکروں میں شامل کرنا ہی پڑا۔ یہی مومنؔ کی شاعرانہ عظمت کی دلیل بھی ہے اور ان کی مقبولیت کے اسباب بھی ہیں۔ اس لئے موصوف کی غزلیں کسی بھی عظیم شاعروں سے کم درجہ کی نہیں گردانی جاسکتی ہیں۔

باب پنجم

مومن کی مثنویاں : ایک مطالعہ

Momin's Masnavi-A Study

مومنؔ کی مثنویاں : ایک مطالعہ

مومنؔ نے غزل، قصیدہ، رباعیات وقطعات، معمیات اور واسوخت وغیرہ اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری کی شروعات مثنوی سے ہوئی تھی۔ ان کی حالات زندگی کے مطالعہ سے واضح ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی مثنوی شکایت ستم سولہ سترہ برس کی عمر میں لکھ ڈالی تھی۔ انہوں نے کل بارہ مثنویاں لکھی ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے :

(۱) شکایت ستم ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۶ء ۵۹۲/اشعار

(۲) قصۂ غم ۱۲۳۵ھ ۱۸۲۰ء ۵۳۴/اشعار

(۳) قول غمیں ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء ۴۴۰/اشعار

(۴) تف آتشیں ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء ۵۵۳/اشعار

(۵) مثنوی در ماتم حکیم غلام نبی خاں (والد مومن) ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء گیارہ اشعار

(۶) نکاح یار جانی کی تاریخ ۱۲۴۲ء ۱۸۲۷ء ۲۷/اشعار

(۷) حنین مغموم ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء ۵۶۲/اشعار

(۸) آہ وزاریٔ مظلوم ۱۲۴۶ء ۱۸۳۱ء ۵۵۳/اشعار

(۹) مناجات عاشقانہ............۳۰۸/اشعار

(۱۰) مثنوی جہادیہ............۶۰/اشعار

(۱۱) نامۂ مومنِ جان باز بہ جانب محبوبہ دل نواز............۳۹/اشعار

(۱۲) نامہ بہ سوز وگداز بہ سمت معشوقۂ طنّاز............۳۲/اشعار

تمام مثنویوں میں ابیات کی تعداد ۳۴۹۸/اشعار ہو جاتی ہیں۔ اس میں دس مثنویاں مومنؔ کی عشقیہ

زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک مثنوی مذہبی نوعیت کی ہے اور ایک مثنوی اپنے والد کی وفات کے تعلق سے قطعاتِ تاریخ کے ضمن میں ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومنؔ کی تمام مثنویاں ان کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔

مومنؔ کی مثنویاں ان کی غزل کی طرح حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مومنؔ کی مثنویاں ان کے عشق و محبت کی روداد پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے سطور بالا میں کہا ہے کہ موصوف کی دس مثنویاں اسی قبیل کی ہیں۔ جن میں عشق و محبت کی داستان بیان ہوئی ہے۔ جس طرح مومنؔ کی غزلیں حقیقت کا رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ان کی مثنویاں بھی حقیقت بیانی کی مرقع نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد گیان چند جین کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''اردو شاعری میں عشق کا تصور عام طور پر بڑا مثالی رہا ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں کے کردار کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثنویوں میں بھی عشق کا معیار غزلوں ہی سے لیا گیا ہے۔ لیکن بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں جو مبالغہ یا مثالیت سے پاک ہیں۔ اس نوع میں مومنؔ کے کارنامے سرفہرست ہیں۔ ان کے تجربات عشق سوفی صدی ایسے ہیں۔ جو گوشت پوست کے انسانوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اردو کے مثنوی نگاروں میں مومنؔ سب سے بڑے حقیقت نگار ہیں۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں: گیان چند جین، ص ۳۹۹)

مومن خان مومنؔ کی مثنویوں کا وہی موضوع ہے جو ان کی غزلوں کا موضوع ہے۔ ان کی غزلوں میں جو حدیث دل کی ترجمانی ہے وہی ان کی مثنویوں کا بھی رنگ و آہنگ ہے۔ غزلوں میں جو واقعات اشارے کنائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں وہی باتیں واضح اور مفصل طور پر بیان ہوئی ہیں۔ مومنؔ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مثنویوں میں مروجہ رجحان سے الگ ہٹ کر داخلیت پر زور دیا ہے۔ ساتھ ہی

ساتھ مثنوی کی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں اور غزل کی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں میں مومنؔ نے اپنا امتیاز قائم رکھا ہے۔ مومنؔ کے غزل کی تغزلیت مومنؔ کی مثنویوں میں بھی موجود ہے۔ مومنؔ کے جذبات و خیالات مثنویوں میں بغیر کسی پردہ داری کے بیان ہوئے ہیں۔ یہی مثنوی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ جذبات و خیالات کے تمام جزیات اس صنف میں واضح ہو جاتے ہیں۔ اس میں بیچ کے واقعات کو حذف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ مومنؔ نے اپنی غزلوں میں محذوفات معنی پیش کئے ہیں۔ مثنوی میں تمام اصناف سخن جو اردو میں رائج ہیں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور تسلسل کے ساتھ واقعات بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن مومنؔ کی مثنویوں میں واقعات کے تسلسل کا فقدان ہے۔ مومنؔ نے مثنوی کے اجزائے ترکیبی کو نظر انداز کر کے صرف اپنی حدیث دل اور واردات قلبی کو شعری پیکر میں درج کیا ہے۔ اس لئے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مومنؔ کی مثنویاں فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں عطا محمد کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومنؔ نے اپنی شخصیت کا مکمل اظہار اپنی مثنویوں میں کیا ہے۔ وہ خالص تغزل جواب تک مومنؔ سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے پہلے نشانات ان کی مثنویوں میں ملتے ہیں۔ ان مثنویوں کو پڑھ کر ایک بات تو صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مومنؔ نے یہ مثنویاں چھپنے کے لئے نہیں کہی تھیں بلکہ یہ تو ایک طرح کا ان کا خودنوشت تذکرہ ہے جسے انہوں نے از راہ شوق مرتب کیا ہے۔ ان مثنویوں کو کہتے وقت ان کے پیش نظر نہ کوئی مثنوی تھی کہ کہانی۔ اسی لئے ان مثنویوں میں نہ تو کوئی مثنوی کی خوبی ملتی ہے اور نہ قصہ گوئی کی، نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ افسانے کا مقام عروج، نہ ان کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ ابتدا اس لئے نہیں کہ ساقی سے ایک جرعہ طلب کرنے کے بعد مثنوی میں فوراً عشق کی واردات کا ذکر آجاتا ہے، اور انتہا

اس لئے نہیں کہ سوا ایک آدھ جگہ کے محبوب اس محبت کو نباہتا ہے۔ نہ عاشق ۔ان کہانیوں کا سر پیر ندارد ہے۔ یہ یکا یک شروع ہو جاتی ہیں اور یکا یک ختم ہو جاتی ہیں۔ فی الاصل ان میں چند خوبصورت عورتوں کے ساتھ معاشرت ومباشرت کا تذکرہ ہے۔''

(مطالعہ مومن: مضمون نگار عطا محمد، مرتبہ ساحل احمد، ص ۱۴۸)

مومن کی مثنویاں میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کی طرح مثنوی کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ لیکن مومن کی مثنویوں میں وہ پامال روایتی عشق ومحبت کے قصے بھی رقم نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کی مثنویاں حقیقی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں الگ ہوتی ہیں اور افسانے کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ یہاں کوئی شہزادہ نہیں ہے۔ محبوب بھی کوئی ماورائے فطرت نہیں ہے بلکہ گوشت پوست والا انسان ہے جو زمین پر چلتا ہے اور اپنی قوت انسانی سے محدود دائرہ اثر میں فطری عادات وحرکات سے پیش رفت کرتا ہے۔ مافوق الفطرت عادات کے کردار کی جھلک اس میں کہیں نہیں ہے۔ مومن کی مثنویوں پر اس عہد کے رجحانات ورویوں کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔ زمانے کے تیزی سے بدل رہے حالات سے اقدار و معیار میں نمایاں فرق محسوس کئے جا رہے تھے۔ جو موصوف کی مثنویوں میں بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی مثنویوں میں صرف ایک مثنوی ''شکایت ستم'' کو چھوڑ کر تمام مثنویوں میں محبوب کی محبت ایثار وقربانی اور وفا شعاری کا میلان مفقود ہے۔

بہر کیف مثنوی کی ان فنی کمیوں کا دفاع کرتے ہوئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

''مثنوی کے بارے میں بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ مثنوی بغیر پلاٹ کے بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں جو خیال پرورش پا رہا ہے وہی پلاٹ ہوتا ہے۔ صرف ہم یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس میں تسلسل ہو اور واقعات ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح جکڑے ہوئے ہوں۔ اور انداز بیان میں حسن ہو ورنہ ان میں اثر نہ ہوگا

اور سپاٹ پن پیدا ہو جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ پلاٹ اہم ہے مگر اس کی اہمیت اتنی نہیں ہوتی جتنی کردار کی۔ چاہئے یہ کہ شاعر کردار کو واقعات پر اتنا حاوی کر دے کہ پلاٹ کی حیثیت ثانوی رہ جائے۔ اس کے علاوہ شاعر کا ایک خاص مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے...............اس کے پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر میں باہم اس قدر ربط وضبط ہو کہ ایک دوسرے کے بغیر سمجھنا دشوار ہو۔ اس کے ساتھ اس میں واقعہ نگاری کا ایک خاص مقام ہے۔ جذبات انسانی کی تصویر کشی، ماحول کی عکاسی، باہمی تعلقات کا اظہار یہ وہ مراحل ہیں جن کے بغیر مثنوی کا پایہ تکمیل کو پہنچنا ممکن نہیں۔''

(مومنؔ شخصیت اور فن، مصنفہ پرفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص ۲۲۱/۲۲۲)

مومنؔ کی مثنویاں اپنے اندر عصری میلانات رکھتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ جاگیردارانہ نظام ختم ہو رہے تھے اور مزدور محنت کش کا بول بالا ہو رہا تھا۔ اقدار و معیار یکسر بدلتے جا رہے تھے۔ ایسے دور میں جب سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی تمام رجحانات میں انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ اخلاقی اقدار بھی پامال ہو رہے تھے۔ ان تمام حالات کا اثر شاعری پر اور شاعر پر بھی ہونا واجب تھا۔ لیکن مومنؔ کی تعلیم و ترتیب ایسے دینی ماحول میں ہوئی تھی کہ زمانہ کا اثر ان کی شخصیت پر اور ان کی شاعری پر جزوی طور پر پڑا۔ مومنؔ اپنی مثنویوں میں ایک حد تک عریانی کو راہ دیتے ہیں لیکن متقدمین کی نسبت کم۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد کیفی چڑیا کوئی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ پر جو لوگ یہ الزام رکھتے ہیں کہ ان کی مثنویاں، متانت سے گری ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے شاید حضرت جامی کی ''مثنوی ''یوسف زلیخا'' امیر خسرو کی ''مجنوں لیلیٰ'' اور نظامی کی ''لیلیٰ مجنوں'' شیریں خسرو میں شب زناۃ اور شب وصال کے بیان نہیں دیکھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایسے مواقع کے جذبات بیان کرنا اپنا کمال سمجھتا ہے، معانی و بیان کے ماہرین کا قول ہے کہ جو بیان حسن قدرت، واقعہ اور فطری جذبات کے مناسب ہوتا ہے۔ اسی قدر اثر انداز فطرت ہوتا ہے۔

''مقامات بدیع الزماں ہمدانی'' میں خصوصیت کے ساتھ ایک ''مقالہ'' اسی بیان میں ہے۔ بڑے بڑے محتاط شاعر اس صنف میں آکر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ''مومن'' کی سادگی دیکھئے کہ وہ اپنے واقعات اور واردات اپنی زبان سے کم وکاست بیان کر دیتے ہیں، کوئی واقعہ کہیں اگر متانت سے گر جاتا ہے تو واقعہ کی نوعیت ہے شاعر کا کیا قصور ہے۔''

(نگار (پاکستان) مومن نمبر، مضمون نگار کیفی چڑیا کوٹی، ص ۲۱۳)

مومن کی مثنویاں ان کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ ان کے یہاں عشق و محبت کی خالص ہوس پرستی نہیں ہے بلکہ ایک عاشق مزاج اوباش پسند انسان کی فطری ضرورتوں کی تکمیل کا مرقع ہے۔ مومن کی زندگی میں عشق و محبت ایک محدود وقت میں رونما ہوتا ہے اور پھر اپنی عمر کی درازی ختم ہوتے ہی نئے محبوبہ کو تلاش لیتا ہے۔ مومن کی یہی فطرت انہیں مباشرت کی طرف راغب کرتی ہے ان مثنوی میں عریاں اشعار اور اس کیفیت کے اظہار میں جو اشعار تخلیق ہوتے ہیں وہ اخلاقی اعتبار سے کم تر ہوتے ہیں۔ لیکن مثنویوں میں تمام شاعروں کے یہاں یہی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ پیشتر شاعروں یا مثنوی نگاروں کی مثنویوں میں عریاں اشعار، سطحی اشعار مل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرش گیاوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''ہاں بعض معترض کا جواب دینا جنھوں نے چھوٹا منھ بڑی بات کہی ہے، ضرور ہے۔ یعنی وہ لکھتے ہیں کہ یہ مثنویاں عریاں احوال سے بھری ہوئی ہیں اور ان کا اثر اخلاق پر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ مثنوی

''خواب وخیال'' مصنفہ میر اثر برادر خواجہ میر دردؔ یا ان مثنویوں سے بھی زیادہ خراب ہیں، جن کے اشعار میں یہ مصرع بھی داخل ہے کہ ع

ساری کھٹیا لہو لہان ہوئی

(فیصلہ) مثنوی عمیق مصنف نے احوال خاص میں لکھی ہے ۔ دوسری مثنویاں جن میں اپنے کو مخاطب تو کیا ہے مگر واقعی زمانہ کے شوقینوں اور نوجوانوں کے حالات سے وابستہ ہیں کیونکہ مومنؔ کو کسی مورخ نے آوارہٗ روزگار نہیں لکھا اور اسی صورت میں تم سمجھو کہ نہ سمجھو مگر وہ عشق کا ڈرامہ جو خیالی ہے نتیجہ سے خالی نہیں۔ نیز ان کے دامن اتقا پر تمہارے لگائے داغ نہیں لگ سکتا۔ مومنؔ کی ان مثنویوں تک جذبات عشق مجازی کو مدنظر رکھ کے میر حسنؔ کی مثنوی جس میں خلاف یقین دیو اور پری کے قصے ہیں ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔''

(حیات مومنؔ: ضمیرالدین احمد عرش گیاوی، ص ۱۰۵)

مومنؔ کی مثنویوں کے متعلق اس طرح کے اعتراضات اور اس کا جواب مختلف ناقدین کی آرا میں موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو مثنوی کی روایت میں تقریباً تمام مثنویاں ایسی ہیں جن میں شاعر نے کردار کے جذبات و حرکات کو عریانی اور سطحیت کے حمام میں ننگا کھڑا کر دیا ہے۔ اور یہ تمام باتیں اس زمانے کی عصری حسیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ یعنی اس عہد میں سماجی، معاشی، اقداری اور معیاری تصورات شکست و ریخت کے شکار ہو گئے تھے۔ یعنی تمام لوگوں کی دو صورتیں واضح طور پر ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ ایک سماج کے سفید پوش لوگ کی دوسری تصویر انہیں لوگوں کی سیاہ پوش کی بھی تھی۔ اس طرح دکھاوا کچھ اور تھا اور کردار کچھ اور تھے۔ اس سلسلے میں عطا محمد کا ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں :

''یہ زمانہ شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے سامنے ہتھیار

ڈال رہا تھا۔ پرانے رؤساء اور شرفا نئے رؤساء اور شرفا کے سامنے دوزانوں ہوکر بیٹھنا سیکھ رہے تھے۔ اور اپنی ذلت وغربت سے گھبرا گھبرا کر ''ہائے شرافت نسل'' اور ''ہائے شرافت خاندان'' کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اقتصادیات کے ڈھانچے پگھل کر نئے ڈھلنے والے تھے۔ جب یہ حال ہوتو بھلا عشق کا کہاں گزارا۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں کے یہاں غم جاناں پر غم روزگار حاوی آتا دکھائی دیتا ہے۔ جب اپنی ہی استقامت مشتبہ ہوتو غم جانان کی استقامت معلوم!..........مگر مومن خان میں اتنی قوت نہ تھی۔ وہ ان متزلزل بنیادوں پر کھڑے خود بھی کانپ رہے تھے۔ چنانچہ عشق کافور ہو گیا۔ اور ہوس ہی ہوس رہ گئی۔ اور یہ ہوس بھی وقت کی تیز رفتار تبدیلیوں سے قدم نہ ملا سکنے کی وجہ سے کچھ اس درجہ پتلا پن اختیار کرگئی اور اس قدر عارضی ہوکر رہ گئی۔''

(مطالعہ مومن، مرتبہ ساحل احمد مضمون نگار: عطا محمد ص ۱۴۹)

مومن کی شاعری میں یہی عصری کشاکش کے پس منظر ان کے افکار وتصورات کے گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے مزاج میں عشق بازی اور اوباش پسندی نے گھر کرلیا۔ اس لئے وہ دل لگانے کو ایک مشغلہ وقت تصور کرتے ہیں اور ہر مرتبہ دل لگا کر اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور پھر آگے کے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ جہاں انہیں پھر دوسرے، پھر تیسرے اور پھر چوتھے سے دل لگانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لئے وہ کسی ایک حسین کی زلف میں گرفتار نہیں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے عشق میں طہارت وپاکیزگی، استقامت وپائیداری اور گہرائی وگیرائی عنقا نظر آتی ہیں۔ لیکن مومن ان تصورات وخیالات کو بالکل حقیقت وواقعیت کے پیرائے میں بغیر کسی آمیزش کے شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی مثنویوں سے حقیقت کا رنگ، ان کی شخصیت کا پرتو اور جمالیاتی پہلو مترشح ہوتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا امتیاز

وانفرادبھی ٹھہرتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی مثنویوں میں مثنوی کا عام انداز نہیں ہے۔انہوں نے اس صنف کے مقصد مقتضیات کو سامنے میں رکھ کر برتنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ انہوں نے تو اس کو اپنی آپ بیتی بیان کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ تو گویا نظمیں ہیں۔ جن میں مومنؔ کی نجی زندگی کے نشیب وفراز کی اصلیت اور حقیقت سے بھر پور تصویریں ہیں۔ اس لئے ان میں وہ بے لاگ خارجیت نہیں جس کا ہونا مثنوی کی صنف کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مومنؔ کی نجی زندگی کے نشیب وفراز کی کہانیوں نے ان مثنویوں کو خارجیت کے بجائے خاصی حد تک داخلیت کے قریب کر دیا ہے۔ چنانچہ داخلی آہنگ ان پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ان مثنویوں میں سوز وگداز کے عناصر سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان میں کہانی اور پلاٹ کی کوئی دلچسپی نہیں، کردار نگاری بھی یہاں لطف کا کوئی سامان پیدا نہیں کرتی، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کو بھی ان میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ لیکن ان میں محسوسات کے بیان نے ایک ایسا گداز پیدا کر دیا ہے۔ جس سے ولاس کی طرف کھینچتے ہیں۔ اور مومنؔ نے چونکہ ان میں اپنے تجربات کو پیش کیا ہے اس لئے ان میں ہر جگہ اصلیت کی چاندنی چھٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پھر ان میں اظہار کی جو سادگی، بیان کی جو روانی اور طرز ادا کی جو طرحداری ہے۔ اس نے ان مثنویوں کو ایک ایسی بلندی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ جہاں سوائے مومنؔ کے کسی اور کا پرواز کرنا ممکن نہیں۔ مومنؔ نے ان مثنویوں کی تخلیق کر کے مثنوی کے فن کے حدود توڑ

دئے ہیں اور اس فن کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ لیکن یہ بات
عجب نہیں ہے کیونکہ ان سے قبل میرؔ بھی ایسا ہی کر چکے تھے۔ ان مثنویوں
میں دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ مومنؔ نے اس صنف کے ذریعے اپنے اوپر
بیتی ہوئی باتوں کو کس خوبی سے بیان کر دیا ہے۔ تغزل مومنؔ کے مزاج کا
لازمی جزو تھا۔ چنانچہ تغزل کی بنیادی خصوصیات بڑی حد تک ان کی ان
مثنویوں میں بھی نظر آتی ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے۔ مثنوی کی صنف میں
ان کے اس میلان کو ایک نیا تجربہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔''

(کلیات مومنؔ مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۵۵/۵۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مومنؔ کی مثنویوں کی تمام خصوصیات کو نشانِ زد کر دیا ہے اور اس کے امتیاز و انفراد کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گیان چند جین نے مومنؔ کو حقیقت نگار شاعر انہیں مثنویوں کی بنیاد پر کہا ہے۔ اس لئے مومنؔ تمام اصناف شاعری میں ایک حقیقت نگار شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ اور ان کے فطری میلان میں تغزل کا رنگ اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ وہ جس صنف میں بھی طبع آزمائی کریں یہ عنصر ان اصناف میں کم و بیش داخل ہو ہی جاتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی تمام مفروضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مومنؔ کی مثنویوں کا جائزہ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔

مومنؔ کی مثنوی ''شکایت ستم'' میں داخلیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اس مثنوی میں ابتدا سے آخر تک واقعیت کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ بطور خاص زبان و بیان، سلاست و روانی اور الفاظ و تراکیب کے نشست و برخاست نہایت برجستہ و برمحل نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ جذبات کی ترسیل نہایت عمدہ ہے۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ سطور میں بحث ہوئی ہے کہ جذبات کی پیکر تراشی میں کہیں کہیں عریانی اور سطحی خیالات الفاظ کے پیکر میں ڈھل گئے ہیں۔ جو جذبات کا بولہوسانہ اظہار معلوم ہوتا ہے۔ بہر کیف اس بحث سے قطع نظر مومنؔ کی یہ مثنوی ان کی تمام مثنویوں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے پہلے

اپنے دل کی کشمکش، بے چینی اور دردِ دل اور عشق کی حرماں نصیبی کا ذکر ابتدائی اشعار میں کیا ہے۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا دے چک آب آتش رنگ
گرم و سرد زمانہ سے ہوں تنگ

نالۂ آتشیں ہے تف پرور
کرۂ زمہریر ہے دم سرد

جوش صیف و شتا سے حال نہیں
اس ہوا میں کہ اعتدال نہیں

مے طبیبِ روان محزوں ہے
خم بادہ خُم فلاطوں ہے

یہ اگر التفات فرما ہو
بادِ صرصر دَم مسیحا ہو

گرم تدبیر کر ذری ہو جائے
تپ غم نار عنصری ہوجائے

چارہ سازی کرے جو بعدِ ہلاک
بنے خاک شفا مزار کی خاک

گر عرق ریز فکرِ درماں ہو
گریہ ماتم آبِ حیواں ہو

اس سے ممکن علاج عاشق ہے
گرم و ترہم مزاج عاشق ہے

کھودے یہ رشک شربتِ اعجاز
نزلہ اشک چشم اہلِ نیاز

کیا کہوں اس کی چارہ فرمائی
ہے یہ تریاک زہر تنہائی

مثنوی ''شکایت ستم'' کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اپنے غم کا علاج چاہتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اپنے عشق کا افسانہ جو میں نے اب تک چھپا رکھا تھا۔ اسے اب بیان کردوں اور جوش و مستی میں آ کر وہ اپنے عشق کی داستان شروع کر دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ جب نو برس کے تھے تب اس عشق کی ابتدا ہوئی تھی اور یہ غم ان کا کم سے کم سات برس پرانا تھا۔ جس وقت موصوف نے مثنوی لکھی اس وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ برس تھی۔ اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

تھے برس ہم شمارۂ افلاک
کہ ہوا پائمال صورت خاک

کھو دیا چین اے مہہ رو نے
شب سیہ کی ہلال ابرو نے

خنجرِ غمزہ نے ہلاک کیا
نرگسِ سرمہ سانے خاک کیا

اور اس کا بھی مجھ پر دل آیا
کھو کے دل میں نے جان کو پایا

دشنہ تھے زخم بار دونوں کے
ہوئے سینہ فگار دونوں کے

صبر و آزمائش وثبات چلے
آپ سے دونوں ساتھ ساتھ چلے

مومن کولڑکپن میں ہی کسی حسین دل نشیں سے عشق ہوگیا دونوں ایک دوسرے سے عہد و پیاں کرنے لگے۔ یہ عشق جیسے ایک کھیل تھا۔ دونوں کواٹھارہ سال یعنی سن بلوغت سے پہلے ہی یہ مرض لگ گیا اب انہیں پڑھا

سبق یاد نہیں رہتا تھا کچھ خیالوں خیالوں میں لطف محبت کی بات یاد کرتے اور خوش ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ تمام کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اس عشق کی خبر لوگوں کو ہو گئی اب ملنا جلنا بھی ختم ہو گیا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شہرۂ عاشقانہ ہونے لگا
حال میرا فسانہ ہونے لگا

گھہ گئے جو وصال ہوتا تھا
وہ بھی جی کا وبال ہوتا تھا

اس طرح دونوں کے عشق کے قصے زمانے میں بیان ہونے لگے۔ اب کیا تھا غم ہجر میں جلنا قسمت کو نصیب ہوا۔ جدائی کے دو سال اسی طرح گذر گئے لیکن قسمت نے کروٹ بدلی اور سوئی قسمت جاگ اٹھی۔ کسی کی شادی کی تقریب میں وہ ماہ رو پھر آئی دونوں کا ملنا جلنا شروع ہوا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہوئی شادی ہمارے یاں یکبار
آئی مہماں وہ دولت بیدار

شرکت محفل سراپا زیب
اس کے آنے کی ہو گئی تقریب

ایک خالی مکان میں آکر
مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر

کیا ملاقات رشک تنہائی
دم بدم تازہ حسرت افزائی

دونوں جانب سے نالہ و فریاد
شکوہ جورو طعنۂ بیدار

گرد دل سے اُڑیں زمیں کے ہوش
نالۂ آسماں فگن کا جوش

لیکن یہ وصال کب تک، جدائی تو ہونا ہی تھا۔ یعنی محبوب کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔ یہ ہاتھ ملتے رہ گئے، وہ چلی گئی۔ اس طرح تمام خوشیاں کافور ہوگئیں۔ اب جدائی میں جان گھلنے لگی۔ مومنؔ کے محبوب کو سب سے زیادہ جدائی کا غم ہوا تھا۔ اس کو جدائی کا صدمہ پہنچا اور وہ بیمار ہوگئی۔ بستر مرگ پر لیٹی رہی۔ ایک ایسا بھی وقت آیا کہ اسی دردِ محبت نے اس کی جان لے لی اور وہ خدا کو پیاری ہوگئی۔ یہ خبر ایک روز مومنؔ کو بھی مل گئی۔ ادھر مومنؔ کا بھی حال بُرا ہو گیا۔ اس تعلق کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سینۂ کو بی سے دل فگار ہوا
تیر حسرت جگر کے پار ہوا

دم اٹکتے اٹکتے ٹوٹ گیا
سر پٹکتے پٹکتے پھوٹ گیا

جی کو رشک زمین خاک کیا
خواہش مرگ نے ہلاک کیا

موت پر نکلے آرزو کا دم
یہ بنی دم پہ پر نہ بگڑا دم

نالہ آخر فسوں ہوا دل کو
رکتے رکتے جنوں ہوا دل کو

مومنؔ اپنے معشوق کے غم میں اپنے جاں کو کھلانے لگے اور شدید بیمار ہو گئے دل کا دورہ پڑنے لگا۔لوگوں نے بہت علاج کرایا رفتہ رفتہ بیماری جاتی رہی صرف کمزوری رہ گئی۔مومنؔ کی زندگی میں یہ ان کی پہلی محبت تھی اس لئے شاید ظہیر احمد صدیقی اس مثنوی کے داستان کو مومنؔ کا سچا عشق تصور کرتے ہیں اور یہ قیاس از بعید نہیں ہے کہ انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے اسی محبوب کی موت پر لکھا ہے۔حالانکہ کئی لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ مرثیہ صاحب جی امتہ الفاطمہ کی موت پر مومنؔ نے لکھا ہے۔لیکن اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی ،حتیٰ کہ محققین امتہ الفاطمہ کے متعلق خاموش ہیں سیّد امتیاز احمد نے اپنے مضمون میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ مرثیہ مومنؔ کی پہلی محبوبہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔کیونکہ ان کی پہلی محبت سچی تھی مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مجھکو نہ اپنے ساتھ عدم میں لے گیا
ہر دم شکایتِ نفس نار سا ہے آج

آواز ہائے ہائے کی آتی ہے متصل
گردوں طلسم گنبد ماتم سرا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے
کیا جانے اس زلف پریشاں کو کیا ہوا

پیتی ہے اپنا خونِ دل افسوس سے حنا
اس دشت رشک پنجۂ جرجاں کو کیا ہوا

شبنم کو پھر ہے جانبِ خورشید التفات
شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا

منقولہ بالا مرثیہ میں جذبات کی شدّت اپنے اوج پر ہے۔اظہار میں خلوص و بے ساختگی بھی ہے۔ غرض فکری اعتبار سے مومنؔ کا یہ مرثیہ قابلِ قدر بھی ہے اور واقعیاتی رنگ بھی لئے ہوئے ہے۔بہرکیف مومنؔ کی پہلی محبوبہ کے انتقال کے بعد مومنؔ نے اپنے دل کو سمجھایا اور دھیرے دھیرے صحت یاب ہو ہی رہے تھے کہ ایک روز اچانک انہیں غش آ گیا جب آنکھ کھلی تو ایک نازنیں کے زانوں پر سر رکھے ہوئے تھے بس کیا تھا۔ پھر اس کو اپنا دل دے بیٹھے اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

دیکھ زانوں پر اس کے سر اپنا
تھا دماغ آسماں پر اپنا

جان سی آگئی کہ تھا سر شار
آب حیواں سے جام زانوئے یار

کیا کہوں پرسشِ نگاہِ کرم
چشم سے غمزہ داد خواہ ستم

غرض یہ کہ ڈوبتے کو سہارا مل گیا۔طبیعت بالکل بشاش ہوگئی۔دونوں میں عشق ومحبت کے عہدوپیاں ہوگئے۔دونوں کا ملنا جلنا تنہائیوں میں چلنے لگا۔یہ سلسلہ تقریباًایک سال تک چلاایک روز یہ راز بھی فاش ہوگیا کسی نے دونوں کوایک ساتھ بوس وکنار کرتے دیکھ لیااور تمام لوگوں میں یہ بات مشتہر ہوگئی۔گھر پر بھی انہیں کافی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔چند روز تک تعلق منقطع رہالیکن ایک روز پھر دونوں تنہائی میں مل گئے۔دونوں میں بات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ آدھی رات کے قریب چپکے سے اٹھ کر محبوبہ کے مکان پرآجایا کریں اور پھر چند گھنٹوں کے بعد لوٹ جایا کریں۔کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ایک روز چاندنی رات میں جب مومنؔ آئے اورآکر لوٹ گئے لیکن اس ملاقات سے مومنؔ کے دل کو تشفی نہ ہوئی،دل کی بے قراری نہ تھمی اور پھر دوبارہ اس طرف کارخ کیا۔گھر میں داخل ہونے سے پہلے ایک ضعیفہ نے دیکھ لیااوراس نے ٹوک بھی دیا کہ یہ دونوں کیسے شریر ہیں۔ہمیں تو نیند نہیں آتی یہ ہر رات چین کرتے ہیں۔صبح ہونے دو کیا فتنہ اٹھاتی ہوں۔مومنؔ الٹے پاؤں بھاگے پھر محبوبہ کے گھر کارخ نہ کیا۔غنیمت یہ ہوئی کہ اس ضعیفہ نے صرف دھمکا کر چھوڑ دیا کسی سے نہ کہا۔

ایک روز اتفاقاًوہ محبوبہ مومنؔ کو بام پر نظر آگئی۔مومنؔ نے ملنے کی کوشش کی لیکن اس نے منع کردیا کہ تم نے مجھے رسوا کردیا اب ادھر کارخ نہ کرو۔جاؤ کہیں اور جاکر عشق بازی کرو۔وہ یہ سن کر لوٹ آئے اور دوسال تک جدائی کا صدمہ جھیلتے رہے۔ایک روز پھر وہ بام پر نظر آئی۔مومنؔ چپکے سے چھت پر چلے گئے اورانہوں نے اسے زبردستی گلے سے لگالیا۔پہلے تو وہ تھوڑا تلملائی مگر پھر فوراًراضی بھی ہو گئی اور نوبت وصل تک پہنچ گئی۔

جب کبھی وہ اکیلی ہوتی تو ایک راز دار بڑھیا کے معرفت مومنؔ کو بلوالیتی۔ ایک روز جب وہ بڑھیا بلانے آئی تو مومنؔ دیوان خانہ بند کر کے فکر شعر میں غوطہ زن تھے۔ اس لئے انہوں نے کہلوایا کہ تم چلو میں پیچھے سے آرہا ہوں۔ لیکن اس خادمہ نے پتہ نہیں جا کر کیا کہہ دیا کہ اس کے بعد رشتہ ہی منقطع ہوگیا۔

مومنؔ نے جو اس خادمہ کے تعلق سے شعر کہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جا کے اس سے کہا کہ اے نادان
بے خبر کس طرف ہے تیرا دھیان

تو ہے اس کے لئے حزن و ملول
وہ ہیں عیش و نشاط میں مشغول

اب وہ کھل کھیلے کب ہیں تجھ پر بند
دیکھ کر مجھکو کر لیا در بند

رخنہ در سے میں نے جب جھانکا
اور عالم نظر پڑا واں کا

اک پری وش نہ تجھ سے غیرت حور
پاس بیٹھی تھی ان کے اب سے دور

میری آواز سن نہ آئے نکل
وہیں سے بولے آؤں گا تو چل

جوں ہی یہ حرف تا بلب آیا
گئی وہ ہاتھ سے غضب آیا

بات کہنے میں اس نے کام کیا
قصہ دوستی تمام کیا

مومنؔ نے پھر دوبارہ اس محبوب سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش ہوگئی اور پھر موصوف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب مومنؔ نے اس کی طرف سے اس قدر بے توجہی دیکھی تو انہیں بھی اپنے آپ پر شرم آنے لگی اور بالآخر انہوں نے بھی ارادہ کرلیا کہ اب اس سے نہ مل کر اس کا انتقام لوں گا۔ اس طرح یہ مثنوی بھی ختم ہوجاتی ہے اور مومنؔ کی عشق کی کہانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مومنؔ نے اپنی مثنویوں میں دو دو تین تین معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی میں مومنؔ کی عمر سترہ بتائی گئی ہے۔

''قصہ غم،، مومنؔ کی دوسری مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں مومنؔ کا انداز ذرا مختلف ہے۔ اس مثنوی میں وہ بظاہر ہیرو نہیں ہیں بلکہ ایک راوی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل اس مثنوی کا ہیرو ان کا دوست ہے اور دوست ہونے کی وجہ سے وہ اس کے متعلق تمام باتیں جانتے ہیں اور ان تمام مراحلوں کا ذکر کرتے ہیں جو مثنوی کی کہانی میں پیش آتے ہیں۔

مومنؔ اس مثنوی کی ابتدا کرنے سے پہلے ایک لمبی چوڑی تمہید باندھتے ہیں اور امید کرتے ہیں اس مرتبہ انہیں معشوق وفادار ملے۔ جو ان کا ساتھ ہمیشہ دے ورنہ دل لگانے کے بعد عشق میں طرح طرح کی

صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اگر بے وفا محبوب مل جائے تو ہجر میں جان کھلانی پڑتی ہے۔ یہ تمام افکارو خیالات ان کے تصوراتی ہیں جن میں انہوں نے سینکڑوں اشعار صفحہ قرطاس پر رقم کردئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے تمہیدی اشعار پیش کردئے جائیں۔ جس سے قاری بھی محظوظ ہوسکے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کج دارو مریز کب تلک یوں
بس جام میں بھر شراب گلگوں

پھر لب سے مرے اسے لگادے
ساغر کوئی متصل پلادے

ساقی ہیں یہ روز ہائے گلگشت
ہے غیرت باغ ہر برو دشت

اب دور فلک سے دل ہوا شاد
ہے نام حمل کا مہر آباد

ہیں جلوۂ نو بہار کے دن
بد مستی بادہ خوار کے دن

تزئین سمن کے ہیں یہ ایام
گلگشت چمن کے ہیں یہ ایام

کیا رنگ چمن بہار پر ہے
کالم گل و لالہ زار پر ہے

یہ داغ وہ آتشِ جہاں سوز
اِک جس کا شرر ہو آسماں سوز

یہ عشق ہے رنج جاودانی
ممکن ہی نہیں نجات پانی

گو آپ کہیں نہیں دیا دل
پر دیکھے ہیں عاشقانِ کامل

گر سنئے تو کچھ بیاں کروں میں
اِک راز نہاں عیاں کروں میں

ہیں چند فغاں عاشقانہ
آلودہ درد ہے فسانہ

ہے قصد دوستانِ صادق
ناز صنم و نیاز عاشق

کیا حال عجیب و دل نشیں ہے
افسانہ درد آفریں ہے

اس کے بعد اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔جس میں سب سے پہلے ہیرو کا تعارف کرایا جاتا ہے۔اس ہیرو کا نام بھی اتفاق سے مومن ہی ہے۔جس کی کہانی شاعر یعنی مومن خود سنا رہے ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ہیرو شاعر کا دوست ہے۔اس لئے اس کے مزاج سے وہ واقفیت رکھتے ہیں اور شاعر کا دوست کہیں دل لگا بیٹھا ہے۔اس عشق میں وہ اس قدر دیوانہ ہوگیا ہے کہ آبادی گھر وغیرہ چھوڑ کر جنگل کی طرف چلا جاتا ہے لیکن اس بات کی خبر شاعر کو نہیں ہے۔ایک عرصے تک دونوں ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں لیکن اتفاقاً شاعر جب جنگل میں پکنک کی غرض سے جاتا ہے تو اسے وہاں اس کا دوست نظر آجاتا ہے۔یہ اپنے محبوب کے فراق میں جنگل میں گزر بسر کر رہا ہے۔یہ فراق زدہ نوجواں عالم تصور میں محبوبہ سے شکایت کر رہا ہے کہ پہلے تو تم محبت کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھی وصال کا وعدہ وفا کیا کرتی تھی اب کیوں بے وجہ تم مجھ سے ناراض ہوگئی ہو۔اس عاشق کی محبوبہ ایک طوائف ہے یا بازاری عورت ہے۔اس کی بے وفائی سے عاشق کا بھی برا حال ہے۔اسے اپنے پرائے کسی کی تمیز نہیں ہے۔ضعف رقابت کی وجہ کر حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے۔لیکن عاشق اپنے معشوق سے وصل کی باتیں یاد کر رہا ہے اور اسے دہرا رہا ہے۔اس دلچسپ واقعات کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔جس میں مباشرت اور مباشرت کی تیاریوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔یہ حصہ مثنوی کا نہایت سادہ اور دلچسپ اور پر اثر بھی ہے۔اس کے بعد وہ موجودہ صعوبتوں اور ہجر کے کیفیات کا دردانگیز واقعہ بھی بیان کرتا ہے۔لوگ رنج وغم کے واقعات سنتے سنتے تھک چکے ہیں اور کہانی کو روک دیتے ہیں۔
اس مثنوی کا کچھ حصہ نہایت عریاں اور سطحیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔اسی مثنوی کی وجہ سے مومن کو

چوما چاٹی کا شاعر بھی کہا گیا ہے۔اس مثنوی کی عریانیت مومن کو ایک ہوس پرست اور اوباش پسند شاعر کی صف میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ اس مثنوی کا طرز بیان اسے میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' اور مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' سے مماثلت پیدا کرتا ہے۔ان مثنویوں میں بھی بوس وکنار اور وصل کے بیان حد سے تجاوز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بہر کیف اس مثنوی کے اختتامیہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کیا جرم ہوا معاف کیجئے
دل میری طرف سے صاف کیجئے

پھر بہر خدا تمہارے قرباں
ہو جایئے ویسے ہی مری جاں

پھر خلوت خاص میں بلا لو
دل کی مری حسرتیں نکالو

پھر مل کے شراب ناب پیجئے
پھر وصل سے کامیاب کیجئے

اب مجھ میں نہیں ہے تاب و فرقت
کب تک سہوں عذاب فرقت

بیتابی دل سے لب ہے بے جان
ہوں کوئی گھڑی کا دم کا مہمان

اب مرنے میں میرے کیا ہے باقی
فانی ہیں سبھی خدا ہے باقی

اس طرح غرض بہک رہا تھا
کچھ جوش جنوں میں بک رہا تھا

اس جوش میں اور جوش آیا

بیہوش کو طرفہ ہوش آیا

پھر درد زباں انا الصنم ہے

منصور سے مرتبہ نہ کم ہے

بس مومنؔ دل گداز خاموش

اب طاق ہوئی ہے طاقت جوش

باقی نہیں اب توہم میں حالت

ہے اور ہی درد و غم میں حالت

جاری ہے ہر ایک چشم سے خوں

تھے شعر کہ نالہ ہائے موزوں

اس قصہ غم نے جی کھپایا

اس سوز نہاں نے دل جلایا

کر ڈالا کباب سامعیں کو

آگے نہیں تاب سامعیں کو

ہر حرف ترا شرر فشاں ہے

ہے آگ کا شعلہ یازباں ہے

زیں باش زسوز سینہ مخروش

چوں شمع خموش باش خاموش

''قول غمیں'' مومنؔ کی ایک بہترین مثنوی ہے۔ یہ مثنوی مومنؔ کی شاہکار مثنوی گردانی جاتی ہے اس مثنوی کی ابتدا میں تمہیدی اشعار کے طور پر موصوف نے اپنے پرانے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ محبت

میں انہوں نے کیسے کیسے زخم کھائے ہیں۔ جدائی میں، بے وفائی میں کیسے دن گن گن کر گزارے ہیں۔ عشق و محبت میں تمام گزرے ہوئے واردات کی یاد دہانی کی گئی ہے اوراس کام میں ۹۶ رچھیانویں اشعار درج کئے ہیں۔ تمام اشعار میں ایسی ہی گزری ہوئی تمام باتوں کو یاد کیا ہے۔ اس حصے کے ابتدائی اور اختتامی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا زہر پلا دے مجکو
شربت مرگ چکھا دے مجکو

یاں سیہ مستی حرماں یہ نگاہ
دے وہ مے یعنی کف مار سیاہ

تلخی یاس عبادت کب تک
حسرت ذوق شہادت کب تک

کیا ذرا سودۂ الماس نہیں
سم ہلاہل تیرے کچھ پاس نہیں

آتش شوق کی حدت نہ رہی
نا توانی کی وہ شدت نہ رہی

زخم کاری ہوئے آخر نا کام
آگیا جوش طپش کو آرام

سخت جانی کا گلہ دل پر شاق
حسرتِ وصل نہ اندوہ فراق

نہ سبک سر میں گراں جانی سے

گر پشیماں تو پشیمانی سے
نالہ و آہ فغاں کچھ نہ رہا
رنج کا نام و نشاں کچھ نہ رہا
اب شب و روز مسرت کا خروش
انبساط و طرب و عیش کا جوش
یادوں میں ہنسنے کا غُل آٹھ پہر
وقت لب خندۂ گل آٹھ پہر
زمزمہ ساز برنگ بلبل
نغمۂ پرواز برنگ بلبل
نغمہ سنجی و خوش الحانی بس
شعر گوئی و غزل خوانی بس
رات دن ہنسنے ہنسانے کی بات
یاروں سے ملنے میں صرفِ اوقات
آشناؤں میں سدا گھر میں کہاں
گہہ وہاں گاہ وہاں گاہ وہاں

منقولہ بالا تمہیدی اشعار کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ عرض کرتے ہیں کہ ایک روز مومنؔ اپنے کسی دوست کے یہاں جا رہے تھے۔ راستے میں چاروں طرف کا نظارہ کرتے ہوئے ان کی نظر چاروں طرف بھٹک رہی تھی۔ اچانک ان کی نظر کسی بالا خانے پر چلمن کے پیچھے کسی شوخ حسینہ سے ٹکرا جاتی ہے۔ دونوں کی نظر جب ملتی ہے تو وہ مسکرا دیتی ہے۔ پہلے تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ ان کا وہم تھا۔ پھر کہیں میری جان جوکھم میں نہ پھنس جائے۔ پھر جبراً، قہراً قصد کیا اور اس شوخ حسینہ تک پہنچے، وہاں کا منظر ہی عجیب نکلا۔ وہاں دور

عیش ونشاط گرم تھا۔اس شوق حسینہ کے لب سے مزاحیہ باتیں نکل رہی تھیں۔انہیں بھی یہ دیکھ کر لطف آنے لگا۔ ان کا دل جوافسردہ تھاشاد کام ہونے لگا۔اس طرح وہاں کا ماحول بھانے لگا۔لبوں پر مسکراہٹ آنے لگی۔وہاں دل بستگی کا سامان مہیا دیکھ کر اسے دل دے بیٹھے۔اس طرح روز وہاں آنا جانا شروع ہوگیا۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دن جاتے تھے یار کے پاس
یارو غمخوار و وفادار کے پاس
راہ میں طرفہ تماشا دیکھا
غرفہ وبام دل آرا دیکھا
آگے اس غُرفے کے چلمن ہے پڑی
پس چلمن کوئی عورت ہے کھڑی

محو نظارۂ رنگ بازار
ناگہاں ہوگئی وہ مجھ سے دوچار
کہ وہ چلمن کا ذرا تھا پردہ
گرچہ تھا پردہ پہ کیا تھا پردہ
ہوئے آپس میں نظارے کیا کیا
کئے ابرو سے اشارے کیا کیا
ترجماں چشم و نظر مطلب سے
کچھ تبسم بھی نمایاں لب سے
اور میں حیران و سراپا حیرت

کیا کہوں میں کہ مجھے کیا حیرت
کہ الٰہی یہ تماشا کیا ہے
گر سرِ خود ہے تو ڈر کس کا ہے
کیوں نہیں چلمن اٹھا دیتی ہے یہ
کیوں نہیں گھر میں بلا لیتی ہے یہ
اور جو تابع ہے تو کیوں باک نہیں
کیا سبب ہے کہ خطرناک نہیں
جی میں آیا کہ تجسس کیجئے
کسی ڈھب بھید یہاں کا لیجئے
پھر ڈرا میں کہ کچھ آفت تو نہ آئے
دل کے ہمراہ کہیں جان نہ جائے

ایک روز اتفاق سے مومنؔ وہاں تشریف فرماں تھے کہ اچانک کسی مہمان کے آنے کی خبر ملی۔ اس لئے پردہ کی خاطر وہ وہاں سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال آیا کہ ان کا وہاں رہنا شاید مناسب نہ ہو۔ اس کے بعد مومنؔ دوبارہ کچھ روز بعد جب تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ نو وارد مہمان خاتون بیمار ہے۔ بس کیا تھا یہ حکیم تھے ہی انہیں مریضہ کو دکھایا گیا۔ بس مومنؔ نے جو اس مریضہ کا نبض پکڑا خود اس کے عشق میں بیمار ہو گئے۔ نازنین مہمان نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مریضہ کا مومنؔ نے نبض کیا پکڑا۔ گویا ایک نیا حادثہ رونما ہو گیا۔ اس ہاتھ پکڑنے کو مومنؔ نے اس قدر بیان کیا ہے کہ اس تعلق سے غزلوں میں بھی کتنے اشعار کہہ دئے ہیں اس مثنوی کے درمیان میں بھی انہوں نے اس واقعہ کے ترجمان اشعار کہے ہیں۔ جو ایک مکمل غزل کی صورت میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کیا لگایا دست دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

کس کے ہاتھوں سے لگا تھا کہ جدا
نہیں ہوتا دل ناکام سے ہاتھ

پختہ مغزانِ جنوں سے ہوں میں
کیوں اٹھاؤں طمع خام سے ہاتھ

ہاتھ دیتے تو ہو اب ہاتھ میں پر
کان پر رکھئے گا پھر نام سے ہاتھ

دھوئے شبنم سے نہ ہوگا ہم رنگ
مہر کا دست گل اندام سے ہاتھ

کیا کہوں آہ بقولِ مومؔن
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

یہی وہ محبوبہ تھی جن کا نام امۃ الفاطمہ بہ متخلص صاحب جی بتایا جاتا ہے۔اس طرح مومؔن نے اسے اپنا محبوب بنالیا۔دوسرے لوگ مومؔن کو دیکھ کر مذاق اُڑانے لگے۔خیر کسی طرح مومؔن نے فضا ہموار کی اور وہاں کی محفل میں آنا جانا جاری رکھا۔ایک روز تنہائی میں موقع پا کر اظہار عشق کر دیا۔اس نے بھی اقرار عشق کیا۔دونوں کے دلوں میں عشق کی آگ لگ چکی تھی۔لیکن قدرت کو دونوں کا ملنا منظور نہ تھا۔اس محبوب سے بوس و

کنار کی لذت مومنؔ اٹھا نہ سکے۔ وصال کی کوئی صورت نہ نکلی تھی کہ اچانک کسی نے خبر دی کہ نازنین مہمان کے جانے کا حکم صادر ہو گیا ہے۔ مومنؔ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس موقع پر انہوں نے فرطِ غم میں جو اشعار کہے ملاحظہ فرمائیں۔

اِک جواں تھا بہ الم خو کردہ
شور وحشت کا نمک پروردہ
حکم بے ربط دہِ ملک جنوں
افسر داغ بسر چوں مجنوں
کیا کہا گر یہ کہا کچھ نہ کیا
نہ رہا مرتبہ اس کا نہ رہا
قیس کو اس سے بھلا کیا نسبت
ایک شاہ ایک گدا کیا نسبت
ذرّہ کو مہر سے کیا رتبہ ہے
کچھ بھی ذرّے کا بھلا رتبہ ہے
قیس اک طفلِ دبستانِ جنوں
اور وہ استاد زباندانِ جنوں
اس سے جب بزم غم آرائی ہو
عشق کو مرتبہ افزائی ہو
غم میں ایک جان اسی کے باعث
درد کو شان اسی کے باعث
فخر الفت کو اسی کے دم سے

یاس و غم و اندوہ خجالت

جاں شکنی کچھ نزع کی حالت

طور یہ ظاہر مرنے کے سارے

چار مہینے یوں ہی گزارے

کیسے مہینے عمر دو عالم

روز قیامت جس کا ہر اِک دم

بخت نے کیا کیا کچھ نہ کیا پھر

چرخ نے تازہ داغ دیا پھر

یعنی وہ رشکِ مہر درخشاں

آئی میرے دوست کے مہماں

اور یہ مجکو بھی خبر آئی

جان تمنا دوڑ کر آئی

مجکو بھی دل کی بات جو بھائی

محرم راز اک جلد بلائی

اس کو اسی دم اس جا بھیجا

حال دل اپنا کہلا بھیجا

سنتے ہی نام عاشق بے کس

کہنے لگے کس ناز سے بس بس

بار دگر یہ نام نہ لینا

رنج پیہم مجکو نہ دینا

ناز وحشت کو اسی کے دم سے

جب کسی صورت اس محبوب سے وہ مل نہ سکے تو آہ وفغاں کرتے کرتے اپنی جان دینے کا ارادہ کرلیا اور دوستوں سے یہ وصیت کردی کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو میرے محبوب کی گلی سے لے جانا تا کہ وہ بھی باخبر ہو جائے یہ وصیت کر کے وہ عاشق اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر تمام لوگ حیراں و پریشان رہ جاتے ہیں۔ لوگ عاشق کی میت پر خوب آہ وبکا کرتے ہیں۔ پھر لاش لے کر جب معشوق کی گلی سے گزرتے ہیں تو یہ دیکھ کر وہ بھی افسوس کرتی ہے۔ دل پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ بالا خانے سے گر جاتی ہے اور گرتے ہی مرجاتی ہے۔ اس طرح سچی محبت تاثیر دکھاتی ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہہ کے یہ کھینچی اِک آہ جاں سوز
جل گیا جوں دل ہنگامہ فروز
جان سینے سے گئی درد کے ساتھ
ہو گیا سرد دمِ سرد کے ساتھ
دیکھو نیرنگ محبت کا حال
اہل محفل ہوئے حیراں کمال
واہ اے عشق اسے جاں سے کھویا
بات کہنے میں جہاں سے کھویا
دوست داروں نے بُرا حال کیا
سارے یاروں نے بُرا حال کیا
کوئی سرگرم فغانِ جانسوز
نالہ ہنگامہ محشر افروز
کسی کے لب پہ میں مرجاتا کاش

کسی کے چہرے پہ ناخن کی خراش

کسی کی آہ کرے خوں باری
کسی کے چشم سے دریا جاری
آخر اس طرح بہ احوال خراب
لے چلے نعش اٹھاکر احباب
الغرض پہونچے جب اس شکل سے واں
جس جگہ تھا بت کافر کا مکاں
وہ گلی جس سے تماشا گہہ تھی
جلوہ گر غرفہ میں وہ ناگہہ تھی
دیکھ اس حال کو افسوس آیا
گر پڑی دل جو ذرا گھبرا یا
گرتے ہی مر گئی بس وہ دل گیر
جذب الفت نے دکھائی تاثیر

مومنؔ کے محبوب پر مومنؔ کی موت کا ایسا اثر تمام لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔لوگ اسے سچی محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔غرض زندگی میں دومحبت کرنے والے جب نہیں مل پاتے ہیں تو مرنے کے بعد دونوں ضرورملیں گے۔اس طرح کے خیالات دل میں گھر کرتے ہیں۔یہ بات سوکوس تک پھیل جاتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح شیریں کے لئے فرہاد نے اپنی جان دی تھی۔اسی طرح ان کی محبت بھی ہے۔اس طرح لیلیٰ مجنوں کے قصے کی یاد بھی دہرائی جاتی ہے۔غرض لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد یا کوئی عاشق یا معشوق تمام کو محبت کی تاثیر قریب کھینچ لاتی ہے۔اور بالآخر بچھڑے ہوئے مل ہی جاتے ہیں۔اس طرح یہ مثنوی اپنے اختتام کو پہنچ

جاتی ہے۔

مومن خان مومن کی مثنوی ''تف آتشیں'' بھی ایک کامیاب مثنوی ہے۔اس مثنوی میں بھی موصوف نے اپنے عشق ومحبت کی کہانی درج کی ہے۔مثنوی کے ابتدائی حصے میں انہوں نے ایک بت طناز کے ہجر کا کرب بیان کیا ہے وہ محبوب کی جدائی میں بے چین و مضطرب نظر آتے ہیں عاشق مہجور کے متعلق لمبا چوڑا بیان درج کیا گیا ہے۔اس کام میں موصوف نے کل ۵٦/اشعار رقم کئے ہیں۔اس کے بعد دل کو بہلایا گیا ہے۔ہجر کی یاد سے چھوٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ رحم کی آس کب تک کریں۔اس غم کو کب تک ضبط کر کے رکھا جائے دل کی تسلی اوراس کیفیت سے باہر نکلنے کے سلسلے میں موصوف کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

تابہ کجا خاموش رہوں میں

حال دل اپنا کچھ نہ کہوں میں

رحم کی اس کے آس کہاں تک

راز نہاں کا پاس کہاں تک

ضبط کہاں تک جی پہ ہی ہے

صبر کہاں تک اپنے بھی جی ہے

جان کو کوئی کب تک کھودے

اب تو کہیں گے ہو وے سو ہو وے

رخصت نام و ننگ ہے اب تو

قافیہ اپنا تنگ ہے اب تو

اب تو کدورت دل کی نکالیں

خاک کہاں ہر بات یہ ڈالیں

اب تو لحاظ اس کا نہ کریں گے

شکوہ بے باکانہ کریں گے

کھولتے ہیں اب رازِ نہانی
شوخ بھی دیکھے شوخ بیانی
نالۂ جانکاہ آئے ہے لب تک
درد فزا آہ آئے ہے لب تک
قصہ عشق کا آغاز ہوا ہے
بسملہ مدّہ آہ رسا ہے
تازہ حدیث عاشق غم کش
شکوۂ جور و تاب ستم کش

اس طرح مومنؔ اپنے نئے عشق کا قصہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور اپنے دل کو ستم کش کہتے ہیں اور اپنے محبوب کو معشوق کو ستم گر نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی عاشق مزاجی کے تعلق سے تمام باتیں واضح کرتے ہیں اور خود کو ایک عاشق مزاج کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میرے شوق نہاں سے ساری دنیا واقف ہے۔ جہاں بھی دیکھو میرے عشق کا ہی چرچا ہوتا ہے اور میں بدنام زمانہ ہو کر ہی نام کماتا ہوں۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ اس کام میں مجھے بہت تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور ایسے میں جی کو اپنے فن یعنی شعر وسخن سے بہلاتا ہوں۔ وہ قصہ کا آغاز یہ کہتے ہوئے کرتے ہیں کہ۔

تازہ کھلا گل باغ طرب میں
ربط ہوا گل خندہ و لب میں
ہو گئی یاری دل سے خوشی کی
ٹھہری تبسم سے بھی ہنسی کی

تازہ گل کا کھلنا اور خوشی کی دل سے یاری ہونا یہ تمام باتیں اس وجہ سے ہوئی ہیں کیونکہ ان کے کسی دوست کے گھر میں شادی کی تقریب ہو رہی ہے اور اس تقریب میں وہ مہتمم کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں اور اس وجہ کر ان کا زنان خانہ میں بھی بے روک ٹوک آنا جانا ہو رہا ہے۔اسی زنان خانے کی ایک خاتون کی آواز انہیں دیوانہ بنا دیتی ہے اور وہ اس آواز والی خاتون کو اپنا دل دے بیٹھتے ہیں۔ان کی یہ ہمیشہ کی عادت رہی ہے کہ کوئی حسینہ ان سے ہنس کر بات کر لے تو وہ اسے اپنا دل پھینک کر دے دیتے ہیں۔یعنی یہ ایک دل پھینک عاشق ہیں۔اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شادی اٹھی اِک گھر میں شتابی
اس میں ہوئی یہ خانہ خرابی
تھی جو وہ جو بزمِ جان و دل آرا
میں بھی تھا وہاں محفل آرا
کارکن و مختار وہاں میں
مہتمم ہر کار وہاں میں
اندر باہر سوز فزائی
تھی متعدد بزم آرائی
سوئے ہر اِک اپنا گزر ہو
مجکو پکاریں کام جدھر ہو
اپنا گزر جوں صاحب خانہ
نادر رنگیں بزم زمانہ
پردے سے اک آواز خوش آئی
جس نے یہ چپ ہے مجکو لگائی

وصف کی اس کے تاب کہاں ہے
رنگِ بیاں کی لال زباں ہے
لفظ نہ تھے مربوط سدا سے
سوزِ ادا سے نطق ادا سے
کیا کہوں اس کی سحر بیانی
لفظ کئی اور لاکھ معانی
لفظ نہ تھے اک تازہ فسوں تھے
جس کے موکل عشق و جنوں تھے
چھیڑ کی باتیں جادوئے بابل
جس سے تمسخر ہو ہی گیا دل
گرچہ سخن کا ہوش کہاں تھا
ایک مجیب ناز و فغاں تھا
ہم سخنی پر طور دگرے
بات ادھر سے نالہ اُدھر سے
آہ نے کتنی تیز اثری کی
پردہ نشیں نے پردہ دری کی
چلمن اٹھاکے وہیں گرادی
ایک جھلک سی اپنی دکھا دی

اس طرح مومنؔ اپنے محبوب کی نامکمل جھلک دیکھ کر قرباں ہوجاتے ہیں اور جب تک یہ محفل تقریب رہتی ہے وہ تاک جھانک کرتے رہتے ہیں اور اس معشوقہ کی جھلک پانے کے متمنی نظر آتے ہیں لیکن ملاقات نہیں

ہوتی ہے۔ ہاں خواب میں ضرور اس معشوقہ کو دیکھتے ہیں ۔ باتیں کرتے ہیں ۔ ملنے ملانے کی بات ہوتی ہے۔ روز ملتے بھی ہیں اور اگلے روز ملنے کا وعدہ بھی ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

سب کی نیند اس فکر میں جاوے
خواب میں بھی تا کوئی آوے
آمد و شد کیا ہووے فسانہ
رات کا آنا روز کا جانا
جی کی تباہی کہیے کہاں تک
صبر آوے قید یہاں تک
خیر پھر اب اے جان ملیں گے
جیتے رہے تو آن ملیں گے
یاں ہی گر آئیں گے اب کی
تم سے بھی ہم ملیں گے اب کی
وہ تو گئے یہ کہہ کر اُدھر کو
تا قلق آیا دیکھنے گھر کو

اس طرح مومنؔ کی حسرت دل میں رہ گئی۔ ان کی تمنا بر نہ آئی آخر کار سب لوگ اپنے اپنے گھر کو واپس چلے گئے۔ مومنؔ لاکھ کوششوں کے بعد بھی ملنے کی صورت نہ نکال سکے۔ وہ اداس و رنجیدہ رہ گئے۔ آخر کار وہ خوش آواز اپنے گھر کو لوٹ گئی۔ سارے خواب ادھورے ہی ہے۔ مومنؔ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ چار مہینے اسی طرح جدائی میں گزارنے پڑے پھر مومنؔ کو خبر ملی کہ وہی خوش آواز محبوبہ ان کے دوست کے یہاں مہمان ہوئی ہے۔ انہوں نے کسی عورت کے ذریعہ پیغام و سلام کا راستہ نکالنا چاہا لیکن جواب منفی ملا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کیا رہی ہے ہم کو تیری احتیاج

ان تمام اشعار میں صرف ہائے ہو، ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔صرف چوتھی مثنوی کے قصے کو انجام تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔اور پانچویں مثنوی چوتھی مثنوی سے ہی مربوط ہے غرض چوتھی مثنوی کو ہی لمبا کیا گیا ہے۔اور محبوب کی بے التفاتی پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔اور اپنی طرف سے بھی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

دردِ دل کا چارہ یاس انگیز ہے
نرگسِ بیمار کو پرہیز ہے
ہائے ہو یوسف لباس بے تمیز
بوئے پیراہن رکھے مجھ سے عزیز
کچھ نہیں کھلتی ہے وجہ احتراز
پاکدامن وہ ہے تو میں پاکباز
ایسے عاشق سے حذر بے فائدہ
پاس عصمت اس قدر بے فائدہ
کیا ہے آخر فتویٰ اہلِ جمال
گر نہیں معشوق عاشق پر جلال
مفتیانِ عشق لکھتے ہیں تمام
بو الہواس شوہر بھی ہو تو ہے حرام
ہیں براہین و دلائل بے جواب
لیکن اس سے کہہ سکے یہ کس کی تاب

اس طرح مومن اپنی صفائی بھی بیان کرتے ہیں اور محبوب کی طرف سے بے توجہی کی

پھر نہ سوالِ وصل کرے وہ
پھر نہ خیال وصل کرے وہ
اب نہ ملوں گی یاد رہے یہ
نام نہ لوں گی یاد رہے یہ

یہاں بھی مومنؔ کو نامرادی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ وہ کسی صورت ان کا نام تک سننا پسند نہیں کرتی ہے۔ اس طرح یہ دل لگانے کی کہانی بغیر کسی وصال کے ختم ہوجاتی ہے اور مومنؔ کی یہ ایک طرفہ محبت کامیاب نہیں ہوتی ہے۔ اس کے بعد مومنؔ حکایت کا عنوان لگا کر اپنے اضطراب دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اس حال دل کی کیفیت کے اظہار میں ستّر اشعار صفحہ قرطاس پر درج ہوجاتے ہیں۔ اس طرح چوتھی مثنوی میں کوئی دل پذیر واقعات رونما نہیں ہوتے ہیں۔ اس کہانی میں کوئی دلچسپ واقعہ بھی گرفت میں نہیں آتا ہے۔ صرف حدیث دل کی ترجمانی مومنؔ نے اپنے انداز میں پیش کر کے تاثر قائم کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اس کے بعد مومنؔ کی پانچویں مثنوی شروع ہوجاتی ہے۔ پانچویں مثنوی کے ابتدائیہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا اب نازِ بیجا کس لئے
چین ابرو بے محابا کس لئے
تند خوئی باعث آزار ہے
زہر قاتل تلخئی گفتار ہے
بے مزہ ہے شکر افشانی تری
بے نمک ہے سر کہ پیشانی تری
اے تنگ ظرف اس قدر بد خو نہ ہو
دل ہو کھٹا ترش ابرو نہ ہو
بے نیازی کا سبب اے بد مزاج

شکایت کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ اگر وہ پاک دامن ہے تو میں بھی پاکباز ہوں پھر مجھ سے ملنے میں احتراز کیسا ہے۔اس قدر عصمت کا خیال بے جا ہے۔محبت میں عاشق معشوق کا ملنا اصل دستور ہے۔ اور خود اس تعلق سے حل نکل آنے کی توقع بھی بے سود سمجھتے ہیں۔لیکن قسمت کو ان پر ترس آجاتا ہے۔ وہ خوش آواز محبوبہ خود ہی کسی قاصد کو بھیج کر رجوع کی خواہش ظاہر کرتی ہے اور ملاقات کی صورت پیدا کرتی ہے۔اس طرح مومنؔ کا سامنا اپنے محبوب سے آخر کار ہو ہی جاتا ہے۔لیکن جب سامنا ہوتا ہے تو کہانی کا یکا یک رخ بدل جاتا ہے۔مومنؔ تو صرف آواز پر ہی اپنا دل دے بیٹھتے تھے لیکن جب صورت دیکھتے ہیں تو حیران و پریشان رہ جاتے ہیں۔صورت ایسی کہ نظر جھیپ لینے کو دل چاہے۔جس کے تمام اعضاء کا بھی ذکر مومنؔ نے کیا ہے اور جس قدر ان اعضاء کی برائی ہو سکتی ہے بیان کی ہے۔اس کام میں تشبیہات کا انہوں بے دریغ استعمال کیا ہے۔مثنوی کے اس حصے میں کوئی لطف نہیں ہے بلکہ موصوف ابتذال و بد مذاقی کی حد تک چلے گئے ہیں۔اس طرح انہوں نے ایک بدصورت عورت کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

پاس سے دیکھا تو بس دیکھا نہ جائے
بہر نگاہ منفعل آنکھیں چرائے

غم سے جی چشم غلط بیں کا جلا
چشم بد دور ایک رشکِ صد بلا

دل ہوا سرد اختلاط گرم سے
بجھ گیا جی جوش آب شرم سے

لاف الفت کی ندامت ہائے ہائے
آپ اپنے پر قیامت ہائے ہائے

ابروئے بے مو سے ظاہر جلدیوں

زنگ خوردہ جیسے تیغ سیمگوں

یا نیام مخمل فرسودہ خواب
یا شکستہ کہنہ محراب خراب
شوخی مژگاں خرام نا شکیب
نرگس بیمار مرنے کے قریب
یوں سفیدی میں سیاہی کم نما
جو بیاض صبح صادق میں سہا
ہر نگاہ تیز تیغ بے اثر
غیرت تیر ہوائی ہر نظر
خانہ چشم ایک صحرائے خراب
آنکھ کے ڈھیلے کلوخ خودہ آب
گوشۂ چشم فسوں فتنہ گر
وہ مثلث جس کا ویرانی اثر
کان گل تھے لیک مرجھائے ہوئے
فصل بہمن کی ہوا کھائے ہوئے
لالہ پژمردہ وہ رنگین عذار
داغ چیچک داغ رشک نو بہار
ناک و مقراض قطع آرزو
منفعل تشبیہ سے زنبق کی بو

بو الہواس کا بوسہ لینا قہر تھا

وہ لب شیریں کا میٹھا زہر تھا

اس طرح موصوف نے ایک ایک عضو کی برائی میں زمین آسمان ایک کر دئے ہیں۔اس بدصورت عورت سے بھی وہ اختلاط قائم کرتے ہیں اوراس کے بعد اس سے انہیں نفرت ہو جاتی ہے۔جو بالکل عجیب سی بات ہے۔کہ اتنی بدصورت تھی تو اس کے ساتھ اختلاط کیوں کیا اس کی آواز انہیں کبھی دیوانہ کر دیتی تھی آج اس کی آواز انہیں سننا بھی گوارہ نہیں۔بہر کیف اسکے بعد مومنؔ پھر ایک نئے شکار کا ذکر کرتے ہیں۔ایک نئی مچھلی پھانستے ہیں۔اس کے ساتھ خوب مزے کرتے ہیں۔لیکن اس بات کی خبر جب اس بدصورت عورت،کو ہوتی ہے تب وہ بدصورت عورت مومنؔ کی اس نئی محبوبہ سے جا کر ملتی ہے اوران کی ساری ہوس نا کی کا قصہ سنا دیتی ہے۔اس کے بعد پھر وہ خوبصورت حسینہ بھی ان سے دوری بنا لیتی ہے۔اس طرح ان کے اس معاشقے کا کام تمام ہو جاتا ہے۔اس مثنوی کے اختتامیہ اشعار جس میں دونوں کے درمیان آخری جو گفتگو ہوتی ہے۔اور مومنؔ کس طرح اس مثنوی کا خاتمہ کرتے ہیں۔اور آگے پھر اللہ کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکلے گا۔غرض انہیں کوئی دوسرا محبوب ملے گا۔اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بات بگڑی سب بگڑنے سے ترے

بن گئی بے دھب بگڑنے سے ترے

تیرے غصے سے غضب آیا غضب

دم رکے ہے تیرے رکنے کے سبب

کون سی تقصیر کی حیراں ہوں

کیا کہا بد گو نے میں بھی تو سنوں

جو ہے بہتاں کا سبب معلوم ہے
حال میرا اس کا سب معلوم ہے

ہے خبر آخر تمہیں ہر راز کی
بات کیا اس شعبدہ پرداز کی

یہ نہیں جو کچھ کہا مت مانیئے
مدعی کا قول باطل جانئے

لائقِ جور و جفا ہے وہ زمیں
مفتری فتنہ بلا ہے وہ زمیں

آؤ مل جائیں کہ دم ہے ناک میں
اس کدورت کو ملائیں خاک میں

اس ستم گر کو ستائیں خوب سا
ہنس کے آپس میں رلائیں خوب سا

گرمیٔ صحبت ہو اس کے رو برو
گاہ میں اس کو جلاؤں گاہ تو

شاعر کے تمام کلام معیاری نہیں ہوتے ۔ اس لحاظ سے مومن کی اگر توبہ قبول ہوگئی تو وہ صرف ایک مثنوی جہادیہ کی بدولت وہ تمام مرتبہ پا سکتے ہیں ۔مثنوی جہادیہ کی ابتداء کس قدر پاکیزہ افکار سے ہوتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

پلا مجکو ساقی شراب طہور
کہ اعضا شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا
کہ آجائے بس نشہ اسلام کا

برنگ مے ایماں کو آجائے جوش
نہ اپنا رہے نہ دنیا کا ہوش

عنادِ نہفتہ کو ظاہر کروں
دمِ تیغ سے قتل کافر کروں

بے تشنہ کامی سبو در سبو
پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو

مومن کا جذبہ دیں اپنے پاکیزہ خیالات سے مزین و آراستہ ہے۔ انہیں اللہ کی راہ میں خود کو قربان کر جانے کا جذبہ تحریک دے رہا ہے۔ایمان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ دین اسلام کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھے یا اس پر کوئی حرف آئے تو ایمان والے کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اس کا دفع کرے اور اس راہ

سنگ دل ہیں ان کو کیوں کر آئے رحم
کس پر آیا ہے کہ تجھ پر آئے رحم

مدعا بے دیں دعا سے چاہئے
چاہئے جو کچھ خدا سے چاہئے

ضبطِ آہ و نالہ و فریاد کر
بھول جا سب کچھ خدا کو یاد کر

پھر تماشائے نیاز و ناز دیکھ
انتقامِ تفرقہ پرداز دیکھ

رحم کن بر حالِ زارِ خویشتن
با خدا بسیار کارِ خویشتن

''آہ وزاری مظلوم'' مومنؔ چھٹی مثنوی ہے۔اس مثنوی کا آغاز موصوف نے دعائیہ انداز میں کیا ہے۔اور اللہ سے اپنے تمام مسائل وآلام کے حل کرنے اور حدیث دل کی کیفیت کو خوشگوار کرنے کی دعا کی ہے اور گذشتہ تمام محبوباؤں کی یاد سے چھٹکارا پانے میں مدد طلب کی ہے۔گویا خدا کو بھی اپنے حق میں اور اپنے مقصد میں مدد کرنے کا رویہ اختیار کیا ہے۔جس سے ان کی آئندہ عشق ومحبت پروان چڑھ سکے جو بالکل ایک عجیب سی بات ہے۔دعا کے تعلق سے عجیب سی تشکیک والی کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔جو بظاہر ان کا ایک نیا پینترا معلوم ہوتا ہے۔اس مثنوی کے ابتدائی

تیرے بندے پہ بیداد صنم ہے

نہیں زنہار شایانِ غیوری

غرور اس بت کا میری ناصبوری

جلالِ غنچہ پرور جوش میں آئے

تلافی کچھ میری خواری کی ہوجائے

یہ دن دکھائے ہاں قدرت نمائی

کہ صبح وصل ہو شامِ جدائی

کریں تزئین تو تشریف اسلام

دل و جاں سے ہو وہ زیبا صنم رام

نکالے عرض ایماں مطلب اپنا

کروں آخر اسے ہم مذہب اپنا

پڑھے کلمہ مرا وہ نا مسلماں

مبارکباد دیں کیا کیا مسلماں

اس طرح مومن کی سوچ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ عشق بازی میں خدا کو بھی شریک مدد کرلیتے ہیں اور اپنے مقصد براری کو ہر قیمت میں حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جوان کی نہایت گھٹیا سوچ ہے۔اس کے بعد پھر آغاز داستان ہوتا ہے دراصل اس مثنوی کا سارا قصہ اپنے محبوب سے غائبانہ باتیں کرنے پر مشتمل ہے۔اس عشقیہ قصہ میں جب محبوبہ کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ کیا دیکھتی ہے کہ یہ ساری باتیں جو اس کے اور محبوب کے درمیان ہو رہی تھیں وہ خواب میں ہو رہی تھیں۔ ان باتوں کا اس محبوبہ پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عاشق کی خبر لینے نکل پڑتی ہے۔اور جب اس کے گھر کی طرف جاتی ہے اور وہاں جاکر اپنے عاشق کے متعلق دریافت کرتی ہے تو لوگ حیرت کی نظر سے اسے دیکھتے

خیالِ باطل اور اتنی درستی

اسی حالت میں گزرے جب کئی سال

کہ تھے مثلِ زماں تغیر احوال

زبس مطلوب نازش تھا طلب گار

بنی سو خود فروشی پر خریدار

نہ آیا صبر بے دیدارِ مشتاق

نہ ٹھہری جان و طاقت ہوگئی طاق

کی آخر مشورت اِک ہم نشیں سے

کہ اٹھتا ہے دھواں جان حزیں سے

جلایا شوق وصل تفتہ جاں نے

کیا خاک آتشِ سوزِ نہاں نے

انہیں فکروں میں سر گرداں ہوں دن رات

کہ اس وحشی سے کیونکر ہو ملاقات

ذرا دیکھوں تو کیا ہے اس کی صورت

نہ کر دے خاک تاثیر کدورت

اس طرح جو محبوبہ نے اپنے ایک راز دار سے مشورہ کیا اور اس دیوانہ کی تمام باتیں بتائیں تو اس راز دار دوست نے اسے جو مشورہ دیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کہا اس نے کہ اے سرمایۂ ناز

فدا تیرے ستم پر سب کے انداز

بلا تیری مرے اندوہ و غم میں

پریشاں گفتگو کرنے کو باہم

یہ فکرِ باطل آشفتہ سری کی

بلا لائی ہوئی ہے کس پری کی

سنی جب اُڑتے اُڑتے یہ حکایت

ہوئی وہ سادہ رو حیراں نہایت

کہ میرا جلوہ دیکھا کیونکر اس نے

کہاں سے سینک لی چشم تر اس نے

ہوا بے پردہ کب حسنِ نقابی

کہاں ایسی جفا پر بے حجابی

زبس تھا اعتمادِ دلبر بائی

نہ سمجھی تہمت آشفتہ رائی

یقیں جانا کہ سن کر میرے انداز

ہوا ہوگا شہیدِ خنجر ناز

قصب لذت اٹھانے کا بندھا دھیان

کھڑے ہونے لگے ہربات پر کان

بڑھے جانکاہی روزِ نہانی

جتائے روز عجز ناتوانی

شکستِ رنگ نقش روئے سادہ

نزاکت لحظہ لحظہ ہو زیادہ

رہی آخر نہ چالاکی نہ چستی

ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو تمہارے عشق میں اس قدر دیوانہ ہو گیا تھا کہ کل اپنے گھر آیا اور آخر اپنی ناکامئی محبت کی وجہ سے جان بحق ہو گیا۔ وہ تو تم سے غائبانہ محبت کرتا تھا۔ تمہیں اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ تمہاری محبت میں اپنا ہوش وحواس گنوا چکا تھا۔ یہ سن کر وہ محبوبہ بھی عاشق کی قبر پر چلی جاتی ہے۔ اور یہاں ایک مافوق الفطرت واقعہ رونما ہوتا ہے کہ قبر شق ہو جاتی ہے۔ یعنی قبر میں شگاف پڑ جاتے ہیں وہ اندر داخل ہو کر لاش کو گلے سے لگا لیتی ہے۔ اس طرح مثنوی ختم ہو جاتی ہے اور مومنؔ کی مثنوی میں محبوبہ زندہ رہتی ہے۔ اور عاشق جاں بحق ہو جاتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ قصہ کے ابتداء سے اختتام تک کے متفرق اشعار نقل کر دئے جائیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کہ تھا اس شہر میں اِک خانہ ویراں
جنوں تعلیم فرمائے اسیراں

جواں سال و کہن پیر محبت
سراپا اس کا تصویر محبت

عیاں صورت سے دل کی شعلہ باری
ہیولیٰ میں زیادہ جزو ناری

جو دیکھے اس کی فطرت کے تب و تاب
کہے اپنے کو آپ ابلیس کذّاب

نہ چھوڑے دل لگانے کی تمنا
قیامت ناز اٹھانے کی تمنا

احبا کو شکایت بلکہ سو بیر
کہ ہم کو جانتا ہے بدگماں غیر

ہوئے اِک روز آخر سب فراہم

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

الٰہی نالۂ اخگر فشاں دے

فغانِ شعلہ ریز و خونچکاں دے

عنایت کر مجھے آتش زبانی

کہ لب تک لا سکوں سوز نہانی

دے اتنی گرمی طرز تکلم

کہ ہو عرق عرق برقِ تبسم

اگر لافِ ورع ہو درد و پندار

بناوے وہ رگِ گردن کو زنار

وفور خود پرستی چشم بددور

شیوع بت پرستی دل سے منظور

بہم ربطِ رقیباں کا خیالات

رواجِ شرک میں مصروف دن رات

وہ بت دیتا ہے طعنہ کس ادا سے

کہ اب تم چاہتے ہو کیا خدا سے

گزر اس گھر میں جو ہے رشک جنت

ملا معشوق مجھ سا حور طلعت

غلط جلوہ ہے میرا شعلہ طور

جہنم میں گئی ہے بلا کی حور

ہوا رحمت کو کیا کہہ کیا ستم ہے

مومنؔ اتنی بے قراری کس لئے
جوش مایو سا نہ زاری کس لیئے

نا اُمیدی اس قدر کس واسطے
شیونِ شام و سحر کس واسطے

آیۂ لا تقنطو تو ہو گی یاد
قول حق پر کیوں نہیں ہے اعتماد

ساتھ دل کے کھو دیا کیا دین بھی
نذر اُس بت کے کیا کیا دین بھی

رحمت حق سے ہے کیوں مایوس تو
کافر ایسا ہوگیا افسوس تو

نالہائے نارسا سے فائدہ
ان تبوں کی التجا سے فائدہ

جو سنا ہے وہ نہیں آتا یقیں
گرچہ ہوں بے ہوش پر اتنا نہیں

میں کہاں افسوس کہا کس کی مجال
انتقام چشم جادو کا خیال

ابتدا سے منکر تسخیر ہوں
عاملِ افغان بے تاثیر ہوں

تاب و طاقت اپنی روزِ عشق ہے
گر عزیمت ہے تو سوزِ عشق ہے

جو کیا تھا وہ الٹ جاتا ہے اگر
جان دیتے تم مرے ہر بات پر

جس فسوں گرنے کیا ہے یہ فساد
سمجھو اس کی بات کا کیا اعتماد

کہ وہ کیا میں پری کو لاؤں دم میں

نکال اپنی ہوس ہائے نہانی

تیرے قربان عیش جاودانی

ذرا دھر کان حرفِ دل نشیں پر

کہ کر بیداد جانِ نازنیں پر

کہاں تک دور بنی ہے کہاں تو

بلا لے شوق سے اس کو یہاں تو

وہ گو بدنام ہے پر چھپ کے آنا

کوئی گر جان لے تو میں نے جانا

مرے کہنے پہ چل مت ہاتھ سے جا

نکالے پاؤں کیوں اندازِ بے جا

ہنر مندی رہے تو کیوں کھلے عیب

کہ وہ ستار ہے جو عالم الغیب

اس طرح مومنؔ کو بلایا جاتا ہے اور اس کام کے لئے وہی راز دار قاصد کی صورت میں مومنؔ تک جاتی ہے اور اسی محبوبہ کے گھر تک آنے کی دعوت دیتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وہ مجنوں جو نیا پیدا ہوا ہے

مجھی پر کہتے ہیں شیدا ہوا ہے

ذرا تکلیف کر اس نوجواں تک

کسی ڈھب سے اسے لے آ یہاں تک

کہ منع محشر آرائی کروں میں

کہ تھا گستاخ شوقِ ہمکناری
ہوا بے ہوش چھاتی سے لگا کر
بنا تصویر جانِ تازہ پا کر
کہا اے درد مند چشم بیمار
ترا درماں ہے عیسیٰ سے بھی دشوار
کہ وہ سرکش ہے جس کا تو ہے پامال
نہیں سنتی کسی دل خستہ کا حال
عداوت ذکر سے عشاق کے ہے
تنفّر نام سے مشتاق کے ہے

یہ ساری باتیں خوابوں خیالوں میں ہو رہی تھیں۔ جب آنکھ کھلی تو ساری بات سمجھ میں آئی۔ اس طرح وہ اپنے رویے پر بہت شرمندہ ہوئی اور دل ہی دل میں بے چین ہونے لگی اور اس کے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ آخر ماجرہ کیا ہے چل کر دیکھا جائے۔ اس طرح وہ محبوبہ عاشق صادق کے گھر تک اور پھر قبر تک پہنچتی ہے۔ اب اس تعلق سے آخری حصے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہ بس اب تو نہیں کچھ بد گمانی
یقیں آئی وفا و جانفشانی
سحر چونکی جو دلِ بیتاب دیکھا
بس آنکھیں کھل گئیں وہ خواب دیکھا
چلے آتے تھے آنسو چشم تر میں
کہ وہ ہے ماجرہ شب کا نظر میں

اور پھر گھر پہنچتی ہے اور قبر تک جاتی ہے۔ اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

علاج درد رسوائی کروں میں
مرے کہنے کو شاید مان جائے
عبث ہے جان فشانی جان جائے
غرض یہ دل نشیں فتنہ اٹھا یا
کہ اس خود رفتہ کو مہماں بلایا
نیا ڈھب اور سوجھا امتحاں کا
کہ سر خط ہے ضمیرِ نکتہ داں کا
وہ جس دم آکے بیٹھا اس مکاں میں
نہ تھی تاب سکوں تاب و تواں میں
غضب ہے اس بلا کا کیا ٹھکانا
پری خانہ میں دیوانے کا آنا
تظلم فرق معنی کے سبب تھا
لباس کاغذی بے وجہ کب تھا
وہ صورت دیکھتے ہی اُڑ گیا رنگ
دکھا یا جوش وحشت نے نیا رنگ
عیاں رخ سے ہوئی دل کی کدورت
تغیر رنگ نے کردی یہ صورت
نہ ٹھہرا دل ذرا کتنا سنبھالا
ہوا بے تاب تر جتنا سنبھالا
ادب سے اٹھ کے وہ تصویر اتاری

کہا دل میں جو سن کر اس نے افسوس
کہ ایسا عاشق اور مرجائے مایوس
چلی تربت پہ اس کی جذب دل سے
چلے کیا پیش دردِ جاں گسل سے
کسی حیلہ سے اس کو بھی لیا ساتھ
کہ ساتھ آئے تو جانے کیا کیا ساتھ
ہوئی جب شمع تربت وہ دل افروز
کہا یہ کھینچ کر اِک آہ جاں سوز
کہ مجھ بن کس طرح آرام آیا
یہ کیا خواب عدم میں چین آیا
لپٹ کر گور سے رونے لگی بس
وہ خاک تفتہ دل ہونے لگی بس
طپاں ایسا دل مشتاق بے صبر
کہ شق اس زلزلہ سے ہو گی قبر
گلے سے لگ کے اس آرام جاں کے
نکالے حوصلہ جانِ طپاں کے
یہ مرنا کاہے کو جینے سے کم ہے
کہ خواب تازہ پہ خواب عدم ہے

اس کے بعد اس مثنوی کا خاتمہ کرنے میں موصوف نے ۳۵ر اشعار اپنے متعلق مختلف موضوعات پر رقم کر دیے ہیں۔

مثنوی جہادیہ بھی مومنؔ کی ایک کامیاب مثنوی ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے مذہب و عقیدہ کے موافق افکار وخیالات کی ترجمانی پیش کی ہے۔ مومنؔ کا تعلق وہابی تحریک سے گہرا رہا ہے۔ اسی لئے انہیں سیّد احمد بریلوی، جو شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ ان سے مومنؔ کی گہری وابستگی تھی۔ ان سے وہ بیعت تھے۔ ان بزرگوں کی صحبت انہیں حاصل تھی اس جہادیہ مثنوی میں موصوف کا رنگ و آہنگ مختلف ہے اور اس میں مذہبی افکار وخیالات کی ترجمانی نہایت سلیقہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ مثنوی بھی موصوف کی بہترین مثنوی میں شمار کی جاتی ہے۔ مومنؔ نے اپنی آخری عمر میں تمام بُری باتوں سے توبہ کر لی تھی اور روزہ نماز کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔

مومنؔ ایک مثنوی کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ ناتمام مثنوی ہے۔ جس مثنوی کی ابتدا حمد پاک سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس مثنوی میں نعت پاک بھی ہے۔ بعد میں وصال محبوب کی دعا اور تمنا۔ اس لئے عبادت بریلوی اور دیگر نقاد کا قیاس ہے کہ اس مثنوی کے دونوں اجزاء کو ملا کر ایک مثنوی مکمل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک بیان ملاحظہ فرمائیں :

> ''اسی طرح یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ مومنؔ نے ایک مثنوی محض حمد کے لئے لکھی ہوگی۔ دونوں اجزاء کو ملا لیا جائے تو ۳۰۸ ر اشعار کی ایک مسلسل اور مکمل مثنوی بن جاتی ہے۔ جس میں ابتداء میں نعت اور پھر مناجات عاشقانہ ہے۔ یہ مثنوی باقاعدہ مقطع پر ختم ہوتی ہے۔ جب مومنؔ نے نام نہاد ناتمام مثنوی کے بعد دوسری مثنویاں لکھیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس مثنوی کو ناتمام چھوڑتے۔ دراصل دونوں اجزاء ایک ہی مثنوی کے ہیں۔ اہل مطبع کو غلط فہمی ہوئی اور ہمارے اکثر نقاد غور کئے بغیر ان کی تائید کرتے رہے۔
> حال میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کلیاتِ مومنؔ مرتب کر کے شائع کی تو اسے ایک مکمل مثنوی مان کر بقیہ مثنوی کے عنوان سے درج کیا۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں، مصنفہ ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۴۱۴)

مومن نے جتنی بھی مثنویاں کہی ہیں تمام مواد کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ فکری اعتبار سے یہ مثنویاں قابلِ قدر ہیں۔ ان مثنویوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمان ہیں۔ بس اسی نقطۂ نظر سے ان مثنویوں کو امتیاز وانفراد حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مومن کی مثنویوں میں ان کی غزلوں کی طرح تغزل بدرجہ اتم موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ مومن کی مثنویوں میں ان کی شخصیت بے نقاب ہوئی ہے۔ اور انہوں نے اپنی مثنویوں کو خودنوشت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی مثنویاں اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کیونکہ ان میں اس عہد کی مثنویوں کی طرح ماورائے فطرت قصے اور کہانیاں نہیں ہیں، نہ ان میں مافوق الفطرت کردار پیش گئے ہیں۔ نہ ان میں جادو، ٹونا والے واقعات ہیں۔ عرض ان کی مثنویوں میں طلسمات کی کہانیاں بھی نہیں ہیں۔ ان مثنویوں میں اخلاقی قدروں کا فقدان ضرور ہے۔ اس سلسلے میں مولوی امداد امام اثر کی رائے ملاحظہ فرمائیں :

''ان (مومن) کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ جو خس برابر بھی مفید معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فائدہ عقبیٰ مرتب ہو۔ اکثر مضامین عشقیہ ہیں مگر وہ بھی ایسے ہیں۔ جن سے یا کوچہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسے ہیں کہ سوا نوجوانانِ غیر مقید کے ان کا گزر کسی اور کے دماغ میں ہو ہی نہیں سکتا۔ المختصر فقیر کی دانست میں مومن خاں کی کوئی مثنوی مفیدِ بنی آدم نظر نہیں آتی ہے۔''

(کاشف الحقائق، جلد دوم: امداد امام اثر، ص ۳۳۳)

بہر کیف اخلاقی نقطۂ نظر سے مومن کی مثنویاں کم درجہ رکھتی ہیں لیکن بقول اثر عقبیٰ کے اعتبار سے مومن کی مثنوی جہادیہ پیش کی جا سکتی ہے۔ جسے امداد امام اثر نے شاید نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔ مومن کی مثنوی جہادیہ کو چھوڑ کر تمام مثنویاں بے کار، بے فیض سہی لیکن ایک مثنوی جہادیہ ہی اگر دین ودنیا میں قبولیت حاصل کرلے تو دین ودنیا دونوں ان کی سنور سکتی ہے۔ اور کسی

حبیب ہیں اور اس سلسلے سے ان سے خدا بھی راضی ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک
کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لا شریک

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیب حبیب خدا وند ہے
خدا وند اس سے رضامند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز
نہ جاں آفریں سے کرو جان عزیز

کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر
کہ آجانے بیٹھے ہوئے اپنے گھر

تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے

سر امتحانِ رسول خدا

نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف
علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف

رہے حشر تک زندہ و نیک ذات
ہے کفار کی موت اس کی حیات

خدائے مجاہد بنایا اسے
سر قتل کفار آیا اسے

دم اس دست بازو پہ دیوے اجل
لب تیغ کے بوسے لیوے اجل

مومنؔ نے اپنے پیرومرشد سید احمد کی شہادت کو علیؓ، حسینؓ و حسنؓ کی شہادت کے زمرے میں رکھا ہے۔ ان کی شخصیت دین اسلام کے لئے معتبر سمجھی جاتی ہے۔ اللہ والوں میں ان کا رتبہ بلند گردانا جاتا ہے۔ ان کی شہادت در اصل ان کے عمر و جاداں ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح موصوف نے ان کی مجاہدانہ شخصیت کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اور اس جماعت میں خود کے بھی شامل ہونے پر بھی فخر کا احساس کیا ہے۔ اور انہیں یقین ہے کہ اللہ کی رحمت ایسے لوگوں پر برستی ہے۔ اور ان کے وسیلے سے ان گروہ میں شامل تمام لوگ اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے تمام اہلِ ایمان سے یہ تلقین کی ہے کہ ان کے شریک مجمع ہوجائیں اور خدا کے سپاہی میں اپنا شمار کرلیں اور اللہ کی راہ میں قربانی کا جذبہ پیدا کریں۔ اس لئے کہ سید احمد کی ذات بابرکات خدا کے محبوب رسول اکرم کے وہ

میں اگر اس کی جان بھی چلی جائے تو کوئی افسوس کی بات نہیں بلکہ فخر کی بات ہے کہ مذہب کی سلامتی اور اس کے فروغ میں وہ کام آیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے رہنما اور پیشوا کے حوالے سے کامیابی کی منزل طے کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

بہت کوشش و جاں نثاری کروں
کہ شرع پیمبرؐ کو جاری کروں

دکھا دوں بس انجام الحاد کا
نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

نہ کیونکر ہوں اس کامیں ناشکیب
ظہور امام زماں ہے قریب

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا
جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

وہ نور مجسم وہ ظلِ الٰہ
کہ سایہ سے جس کے خجل مہر و ماہ

پھر موصوف نے اپنے پیرو مرشد سید احمد کی شہادت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور ان کی قربانی کو خدا کے دربار میں قبول ہونے کی بات کہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

زہے سید احمد قبول خدا

تنِ خستہ سے جاں کو جانے نہ دے

تو بہتر یہی ہے کہ جاں کام آئے
پسِ مرگ تربت میں آرام پائے

قیامت کو اٹھو تم با مراد
لب الحمد گو اور دل شاد شاد

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیات ابد ہے اس دم مرو

جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم
سزا وار گردن فرازی ہو تم

اس طرح موصوف نے اللہ کی راہ میں خود کو قربان ہونے کی تبلیغ کی ہے اور سمجھایا ہے کہ موت تو ہر انسان کو آتی ہے بہتر ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں قربان ہو جاؤ تو مرنے کے بعد بھی عیش و آرام کی زندگی میسر ہو جائے اور تمہیں حیات ابدی مل جائے اور اگر زندہ رہ گئے تو بھی تمہاری جیت ہے زندگی پھر تم غازی کہلاؤ گے اور روز قیامت تمہیں اسی وجہ سے سرفرازی بھی حاصل ہو جائے گی۔ الغرض موصوف نے اس مثنوی میں تمام پاکیزہ خیالات کی ترویج واشاعت کی ہے اور دین اسلام پر مر مٹنے کی تمنا ظاہر کی ہے۔ جو ہر اعتبار سے لائق تحسین وافتخار ہے۔ ایمان والوں کے لئے یہ نہایت مبارک موقع ہے جو حق پر قربان ہو جائیں۔ اس مثنوی میں مومنؔ کا ایمانی جذبہ اپنے عروج پر ہے۔ اور وہ ایک صوفی

محاکمہ

گذشتہ تمام ابواب کے تجزیے سے یہ واضح ہے کہ مومنؔ غزل گوشعرامیں امتیاز وانفراد حاصل کر چکے ہیں اوراس اعتبار سے ان کی غزل گوئی کلاسیکی غزل گوئی کی روایت کی پاسدار بھی ہے اورتجدیدی نقطۂ نظر کی حامل بھی ہے۔اس سلسلے میں پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس میں امیر خسرو سے لیکر موصوف کے ہم عصر شعراغالبؔ وغیرہ تمام شعرا کے کلام پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔اور کلاسیکی ادب کی جملہ خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام اوصاف کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔کلاسیکی غزل گوشاعروں میں امیر خسرو، حسن شوقی، قلی قطب شاہ، غواصی، عالی عادل شاہ، نصرتی، احمد گجراتی، سید میراں، خان ہاشمی، ملا خیالی، فیروز، محمود، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میرتقی میرؔ، میر دردؔ، مرزا رفیع سوداؔ، میر حسن، مرزا مظہر جانِ جاناں، میر عبدالحیٔ تاباں، نواب انعام اللہ خان یقین، میر اثر، میر سوز، آنند رام مخلص، قائم چاند پوری، مرزا جعفر علی حسرت، نظیر اکبر آبادی، غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خاں انشاء، راسخ عظیم آبادی، مرزا غالبؔ، ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفر، خواجہ حیدر علی آتش، حکیم مومن خان مومنؔ، مصطفےٰ خان شیفتہ، پنڈت دیا شنکر نسیم، داغ دہلوی، اکبر الہ آبادی، انیس اور دبیرؔ وغیرہ شعراء کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے اوران کی غزلوں کے اوصاف بھی گنائے گئے ہیں۔جس سے کلاسیکی غزل گوئی کی ایک قابلِ قدر فہرست مرتب ہوئی ہے اور کلاسیکی غزل گوئی کے حسن وقبح پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جبکہ مقالہ کی طوالت کے سبب کئی اہم شعرا کو نظرانداز بھی کیا گیا ہے اور کئی سہواً چھوٹ بھی گئے ہیں۔یہ بات تیقن کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح کا کوئی بھی جائزہ کسی صورت میں سو فی صدی مکمل نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں تمام شعراء کو شامل کرنا امر محال ہے پھر بھی مجھ سے جہاں تک ہوا ہے میں نے حتیٰ المقدور ان شعرا اوران کے کلام کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے باب میں مومنؔ کی غزل گوئی میں عصری معنویت تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جیسا کہ تمام اہلِ دانش جانتے ہیں کہ کسی بھی ادیب وشاعر یا تخلیق کار کی تخلیق میں اس کے عصر حاضر کا اثر بلا واسطہ یا

کتابیات

Bibliography

نمبر شمار	کتب و رسائل	مصنف/ مرتب	سنِ اشاعت
۱	کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید	طارق سعید	۱۹۹۱ء
۲	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۹۱ء
۳	آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	بشیر بدر	۱۹۸۱ء
۴	جدید اردو غزل کی روایت	غیر مطبوعہ (مقالہ)	
۵	نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۲۰۰۸ء
۶	اردو کے مشاہیر شعراء اور قومی یک جہتی	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۲۰۲۰ء
۷	سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' مظفر پور	مدیر: ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء
۸	اردو غزل کی نشو و نما	سیّد رفیق حسین	۱۹۵۵ء
۹	اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل	ڈاکٹر ممتاز الحق	۱۹۹۱ء
۱۰	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	وہاب اشرفی	۲۰۰۵ء
۱۱	تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	وہاب اشرفی	۲۰۰۵ء
۱۲	تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	وہاب اشرفی	۲۰۰۵ء
۱۳	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ اول)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء
۱۴	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ دوم)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء

۱۵	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ دوم)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء
۱۶	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ دوم)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء
۱۷	مومن خان مومنؔ	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۸۵ء
۱۸	کلیات مومنؔ	ڈاکٹر مسیح الزماں	۱۹۷۱ء
۱۹	نگار (پاکستان) سہ ماہی	نیاز فتح پوری	۱۹۶۴ء
۲۰	مطالعہ مومنؔ	ساحل احمد	۱۹۸۵ء
۲۱	مومن خان مومنؔ: ایک مطالعہ	شاہد ماہلی	۲۰۰۸ء
۲۲	کلیات مومنؔ	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۵۵ء
۲۳	دیوانِ مومنؔ	حفیظ قتیل	۱۹۶۰ء
۲۴	اردو غزل	ڈاکٹر کامل قریشی	۱۹۸۷ء
۲۵	مقدمہ شعروشاعری	ڈاکٹر وحید قریشی	۲۰۱۷ء
۲۶	جلوۂ خضر	صاحب گل رعنا	
۲۷	ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	
۲۸	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۲۰۰۴ء
۲۹	حیات مومنؔ	عرش گیاون	۱۹۲۸ء
۳۰	اورینٹل کالج میگزین (پاکستان)	کلب علی خاں	۱۹۵۹ء
۳۱	مومن خاں مومنؔ		
۳۲	حیات اور مطالعاتی ترجیحات	معید رشیدی	
۳۳	مومنؔ دہلوی	امیر حسن نورانی	۱۹۵۷ء
۳۴	حیات مومنؔ	ضمیر الدین احمد عرش گیاوی	

۳۵	مومن خان مومن		
۳۶	حیات وشاعری	پروفیسر نذیر احمد	۱۹۹۱ء
۳۷	مومن خان مومن: ایک مطالعہ	شاہد ماہلی	۲۰۰۸ء
۳۸	دیوان مومن مع شرح	ضیا احمد بدایونی	۱۹۶۲ء
۳۹	اردو مثنوی شمالی ہند میں	گیان چند جین	
۴۰	کاشف الحائق (حصہ دوم)	امداد امام اثر	
۴۱	دیوان مومن مع شرح	ضیا احمد بدایونی	۱۹۴۷ء
۴۲	دیوان مومن	ڈاکٹر انوار الحسن	۱۹۷۱ء
۴۳	دیوان مومن	تمکین کاظمی	۱۹۶۰ء
۴۴	دیوان مومن		۱۹۸۵ء
۴۵	انتخاب کلام مومن	نریش کمار شاد	
۴۶	انتخاب دیوان مومن	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۵۸ء
۴۷	کلیات مومن، ترقی ادب لاہور، حصہ اول	امتیاز علی تاج	۱۹۶۴ء
۴۸	کلیات مومن، ترقی ادب لاہور، حصہ دوم	امتیاز تاج	۱۹۶۴ء
۴۹	انشائے مومن	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۹۷۷ء
۵۰	انتخاب دواوین مومن	نسیم تسلیم	۱۹۷۳ء/۱۹۵۲ء
۵۱	انتخاب دیوان مومن	حامد حسن قادری	۱۹۵۷ء
۵۲	انتخاب کلام مومن	عبدالودود خان	۱۹۵۷ء
۵۳	انتخاب کلام مومن خان	سید حسن عسکری صاحب	۱۹۳۸ء
۵۴	انتخاب دیوان مومن	ظفر احمد صدیقی	۱۹۸۳ء

۵۵	میخانہ تغزل	پروفیسر عطاء الرحمن عطا کاکوی	۱۹۵۴ء
۵۶	مجموعہ قصائد مومنؔ	ضیاء احمد بدایونی	۱۹۲۵ء
۵۷	مومنؔ اور اس کی شاعری	ڈاکٹر نسرین اختر	۱۹۷۹ء
۵۸	مومنؔ حیات وشاعری	عبدالرحمن اصلاحی	۱۹۷۵ء/۱۹۶۰ء
۵۹	مومنؔ کے تہتّر نشتر	سرور مرزا پوری	
۶۰	منتخب غزلیں	اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنو	۱۹۹۹ء
۶۱	قصائد مومنؔ مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۶۰ء
۶۲	غالبؔ نامہ (مومنؔ نمبر)	مدیر: نذیر احمد	جولائی ۱۹۸۵ء
۶۳	ادب شناسی	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۲۰۱۵ء

Revised Synopsis for Ph.D. Degree

Faculty Of Humanities (URDU)

L.N. Mithila University, Kameshwar Nagar, Darbhanga

Name of Research Scholar : Md. Hanzalah

Name of Supervisor : Dr. Barkat Ali, HOD of Urdu, M.L.S.M. College, Darbhanga

1. **Title of Research Work:**

Approved Title - " KHAN MOMIN KI GHAZALGOI "

As per the direction of Research Board Meeting on 25.2.2013 (Letter Attached)

2. **Statement of Research Problem:**

Momin Kahn Momin (1800-1852) was one of the prominent Urdu Poets of 19th century. He might, easily, be distinguished between his two great contemporaries like Ghalib and Zauq. It is an established fact that when Momin composed the under-noted couplet:

Tum Meray Pas Hotay Ho Gaya
Jab Koi Dusra Naheen Hota

his great contemporary poet, Mirza Ghalib whole heartedly, praised it and as a token of affection offered his 'Diwan' (Collection of Ghazals) in lieu of this couplet.

This shows the poetic calibre and craft of Moimin. As he was having mastery of Mathematics, Astrology, Music and Chess, his poetic art is complicated and multidimensional interms of meaning. Besides 'taghazzul', he adopted a new style of expression with smart-set of words, simili, metaphor and 'ibham' (ambiguity).

Although, ghezal writing in Urdu is about one thousand years old, Momin's separate identity is still intact.

To develop own idea, the 'Kuliyat' of Momin will be studied in the context of his poetic art.

Lastly, the opinions of prominent critics will have to be constructed with the out-come of study of the Kuliyat for projecting the findings on different levels of Momin's verse.

7. Work Design:

This research work may be distributed in the follwoing interlinked chapters besides introduction & Bibliography:

Chapter 1 : Special Features of Classical Ghazals

Chapter 2 : Momin's Ghazals as Analysed Until Now

Chapter 3 : Content and Topics of Momin's Ghazals

Chapter 4 : Role of Simili, Metaphor, Terms of Mathematies, Astrology, Music and Chess in Momins Ghazals

Chapter 5 : Momin's Masnavi-a study

Conclusion

Bibliography.

Ali
29.6.13
Supervisor
Associate Prof
H.O.D. Urdu.
MLSM College.
Darbhanga.

Md. Hanzala
29.06.13
Research Scholar

To develop own idea, the 'Kuliyat' of Momin will be studied in the context of his poetic art.

Lastly, the opinions of prominent critics will have to be constructed with the out-come of study of the Kuliyat for projecting the findings on different levels of Momin's verse.

7. Work Design:

This research work may be distributed in the follwoing interlinked chapters besides introduction & Bibliography:

Chapter 1 : Special Features of Classical Ghazals

Chapter 2 : Momin's Ghazals as Analysed Until Now

Chapter 3 : Content and Topics of Momin's Ghazals

Chapter 4 : Role of Simili, Metaphor, Terms of Mathematics, Astrology, Music and Chess in Momins Ghazals

Chapter 5 : Momin's Masnavi-a study

Conclusion

Bibliography.

Ali 29.6.13
Supervisor
Associate Prof
H.O.D. Urdu
MLSM College.
Darbhanga.

Md. Hanzala 29.06.13
Research Scholar

سہ ماہی

مظفرپور

ساغرِ ادب

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سید آلِ ظفر

ساغرِ ادب

Vol. 2, Issue 04, Jan. to March 2020

مدیر: ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

RNI No. BIH URD/2019/78036
ISSN 2582 - 3612

Vol. : 2 , Issue : 04
Jan. to March 2020

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Dr. Syed Alay Zafar

ASSOCIATE PROFESSOR
UNIVERSITY Deptt. OF URDU
B.R.A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001
BIHAR (INDIA)

Edited, Printed, Published and Owned by Kahkashan Yasmin,
Printed at : Indian Arts offset, Basement of State Bank of India, Mahendru
[illegible] (Bihar) & Published From Husaina House,
[illegible] P.O. Ramna,Muzaffarpur - 842002 (Bihar)
Editor : Dr. Syed Alay Zafar Mob. : 94300 84261

ترتیب

گوشۂ ریسرچ اسکالرس

محمد حنظلہ

حکیم مومن خاں مومنؔ : ایک منفرد قصیدہ نگار شاعر

حکیم مومن خان مومنؔ (۱۸۰۰۔۱۸۵۱) اردو ادب میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی بیشتر صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے انہوں نے غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، قطعات اور معمیات وغیرہ میں اپنی جولان طبع کا ظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے ان کے فارسی اشعار کی تعداد بھی کافی ہے۔ لیکن اردو ادب میں ان کی شہرت و مقبولیت غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں ہے کہ دیگر اصناف شعری کسی درجہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ انہوں نے تمام اصناف سخن میں ایک منفرد رنگ امتیاز قائم رکھا ہے جو انہیں تمام اصناف سخن میں ایک معتبر مقام دلاتا ہے خصوصاً غزل گوئی کے بعد ان کا سب سے بہترین شعری کارنامہ ان کی قصیدہ گوئی ہے۔ موصوف نے صرف نو قصیدے کہے ہیں۔ جن میں پانچ دینی قصائد ہیں جو چار خلفائے راشدین پر ہیں اور ایک حضرت حسنؓ کی شان میں ہے۔ دو غیر مذہبی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان والی ٹونک دوسرا راجا جیت سنگھ برادر مہاراجا پٹیالہ کی مدح میں ہے۔ ایک حمدیہ قصیدہ [illegible] ،ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔

مومن خان مومنؔ کی قصیدہ نگاری ندرت فکر اور اسلوب بیان کی وجہ سے قدر و احترام کی حامل ہے۔ مومن کے قصائد میں خصوصاً تشبیب منفرد رنگ و آہنگ لئے ہوئے ہے۔ مذہبیت، حسن پرستی اور [illegible] اشتراک سے موصوف نے ایک الگ دنیا تعمیر کی ہے جس کی مثالیں دیگر شعراء کے قصائد میں نہیں [illegible] مومنؔ کی تشبیب میں طعن و طنز اور بذلہ سنجی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مومن اپنی طنز کے نشتر سے نہایت کاری ضرب لگائے ہیں کہ انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ مومنؔ کے قصائد میں اجزائے ترکیبی کا اہتمام نہایت [illegible] وخوبی سے ہوا ہے۔ ان کے قصائد روایت کا احترام بھی کرتے ہیں مضمون آفرینی، ندرت خیال، اسلوب بیان اور اسلوب بیان میں شان و شکوہ وغیرہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ چونکہ زیادہ تر قصائد [illegible] اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اخلاقی اعتبار سے ایثار و خلوص کے مرقع معلوم ہوتے ہیں۔ مومن کے قصائد کے سلسلے پروفیسر ضیا احمد بدایونی اپنے خیالات یوں بیان کرتے ہیں :

”مومن سے پہلے جس قدر شعراء گذرے ہیں قصیدے ہیں (بہ استثنائے سودا) مومن کا کوئی ہم سر نہیں۔ اگر چہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے۔ تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہو سکتا۔“

(قصائد مومن (مقدمہ) پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ص۔ ظ)

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی رائے کو من و عن قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غالبؔ، انشاء وغیرہ شعراء کے قصائد مومن کے قصائد سے کئی اعتبار سے اعلی ہیں۔ چونکہ اس مضمون میں تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے اس لئے سرسری طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومنؔ کے قصائد بھی لائق ستائش ہیں اور تغزلیت کے ساتھ اختراعی رنگ لئے ہوئے ہیں اس لئے قصیدہ نگاری کی روایت میں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مومنؔ کے قصائد کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومنؔ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمی اصلاحات اور صنائع بدائع کا ذخیرہ جمع کر دیا۔ اس سے مومن کی تبحر علمی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ چونکہ مومن ماہر طب، ماہر ریاضی و نجوم کے علاوہ قرآن و احادیث کا گہرا علم رکھتے تھے اس لئے ان کے اشعار میں تمام موضوعات سے تعلق رکھنے والے اشعار کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اسی وجہ کر ان کے قصائد میں پیچیدگی اور تکلف بھی پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ان کا دفاع کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں :

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشارات و تلمیحات اور علوم کی اصلاحات کے باعث مومن کے قصائد میں اغلاق پیدا ہو گیا۔ مگر اس میں ان کو خطاوار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چونکہ قصیدہ کبھی عوام کی چیز نہیں رہا بلکہ خواص تک محدود رہا ہے۔ اس لئے خواص کو پر پیچ اور کٹھن وادیوں کو طے کرنا ان علمی مصطلحات کو سمجھنا اور ان بعید تلمیحات پر عبور حاصل کرنا چنداں مشکل نہیں۔ پھر یہ مشکل پسندی، خیال بندی، الفاظ کا جوش، بیان کا خروش، یہ سب قصیدہ کی جان ہیں۔ جو لوگ مومنؔ کے کلام پر ان علمی اصطلاحات کے باعث اعتراض کرتے ہیں ان کو یہ اعتراض مومن کے بجائے خود قصیدہ پر کرنا چاہئے۔ قصیدہ دوسری اصناف سخن کے برعکس ایک مختلف مزاج لیکر شاہانہ ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ قصیدہ میں طمطراق شان و شکوہ اور اظہار علمیت نہ ہو تو وہ لباس قصیدہ کے جسم پر کبھی چست نہ ہو گا۔“

(مومن شخصیت اور فن مصنفہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص۔ ۲۱۶)

مندرجہ بالا مباحث اور حوالوں سے واضح ہے کہ مومن خان مومنؔ کی قصیدہ نگاری ایک امتیاز و

انفرد رکھتی ہے۔ انہیں بحیثیت قصیدہ نگار بھی ایک احسن مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ مومن کے قصیدہ میں بھی غزلوں کی سی تغزلیت، زبان میں سلاست و چاشنی، محاورات کی صفائی اور بے ساختگی ایک الگ تاثر مرتب کرتے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے قصائد سے تشبیب کے چند اشعار نمونتاً پیش کردئے جائیں تاکہ قصیدہ کے سلسلے میں ہوئی گفتگو اپنی دلیل حاصل کر سکے۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس   کہ جیسے صبح شبِ ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح فرح انگیز کو کوئے قمری   کہ جیسے فوج مظفر کو شور و غلغل کوس
نوائے طوطی شکر فشاں کی لذت سے   سماع و رقص میں اہلِ مذاق جو طاؤس
غبار صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط   بہار لالہ و گل سیمیائے عرض سموس
صفا سے وہ در و دیوار باغ کا عالم   کہ آشیانہ میں دشوار طائروں کو جلوس

ایک اور قصیدہ کی تشبیب ملاحظہ فرمائیں ۔

کوئی اس دور میں جئے کیونکر   ملک الموت ہے ہر ایک بشر
دار خواہوں کے شور سے دیکھو   چونکہ پڑتا ہے فتنۂ محشر
آئینہ نے بھی اس زمانے میں   تیغ کے سے نکالے ہیں جو ہر
آتشِ لعل سینۂ جاں سوز   آب نسیاں ہے ایک بد گوہر
جسکو دیکھو سو مایۂ بیدار   کیا ہوا گر نہیں ہے یسمیں زر

اب مدحیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

اے مسیح دم رواں پرور   زندگی بخش دینِ پیغمبرؐ
گرمی التفات سے تیری   خشک ہو عاصیوں کا دامن تر
ہے سراپا تو مہرۂ تر پاک   تجکو کیا نیس مار سے ہو ضرر
ہے ترے خار جیب کا قصہ   شرِ یانِ حسود کو نشتر
تو وہ سلطان کہ بار گنہ کا تیری   پشت کا شانہ ہے فلک منظر

اور اب آخری حصہ دعائیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

مومن اب کر دعا کہ سنتا ہے   تیری تقریر گوش دل سے اثر
جب تلک گردشِ سپہری ہے   انتسابِ حدوس نیکی و شر
تیرے احباب نیک بخت مدام   تیرے اعدا ہمیشہ قال اختر
جب تک اس تیرہ خاک داں میں ہے   کوئی گم کردہ رہ کوئی رہبر

تیرے حاصد ہوں غول صحرائی   تیرے پیرو ہو پیشوائے خضر
نیک خواہ اور خوبی دارین   بدسگال اب سے خوار تا محشر

قصائد مومن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو قصیدہ نگاری میں مومن کا مقام و مرتبہ بہت بلند نہیں لیکن بہت کم تر بھی نہیں ہے ۔ نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون میں قصیدہ نگار شاعروں کا سلسلہ سودا، ذوق، غالب، پھر مومن لکھا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ مومن کی قصیدہ نگاری ایک مقام و مرتبہ رکھتی ہے آخری میں نیاز فتح پوری کے جملے پر اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''بہر حال اس میں شک نہیں کہ فنی حیثیت سے مومن کے قصائد بھی کم اہمیت نہیں رکھتے اور اگر ہم قصائد کے معزلانہ حصوں کو بھی سامنے رکھیں جہاں وہ بے اختیارانہ ایک عاشق دلباز کی حیثیت سے سامنے آگیا ہے تو یہ اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔''

(مومن نمبر ''نگار'' پاکستان دسمبر ۱۹۶۴ء ص۔۲۴۱)

Md. Hanzala
Research Scholar
Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga

ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی

مظفرپور

ساغرِ ادب

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 1, Issue : 03
Oct. to Dec. 2019

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Dr. Syed Alay Zafar

Printed, Published and Owned by **Kahkashan Yasmin**, Printed at : Indian Arts offset, Basement of State Bank of India, Mahendru Ashok Raj Path, Patna : 800 006 (Bihar) & **Published From** Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura, P.O. Ramna, Muzaffarpur - 842002 (Bihar)
Editor : Dr. Syed Alay Zafar
Mob. : 94300 84261

ترتیب

ISSN :2582 -3612

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد حنظلہ

مومن خان مومن :غزل کا واقعیت پسند شاعر

مومن خان مومن اردو ادب میں ایک بلند و منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ مومن نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ دور کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ مومن کا دور عہد زریں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے معاصرین شعراء کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ جو کم و بیش غالب، ذوق، آزردہ، شیفتہ، صہبائی، غیش، عارف، درخشاں، علائی، سالک، بیتاب، برق، میر، شور، آزاد، تسکین، تشنہ، خزیں، شہرت، عزیز، تمکین، جوش، بسمل، جعفری، بیدل، شوق، داغ اور حشمت وغیرہ ہیں۔ مومن کا موازنہ، غالب، ذوق، میر اور سعدی و حافظ وغیرہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ مومن کو غالب اور شیفتہ جیسے شاعروں سے بھی داد و تحسین حاصل ہوئی ہے۔ اردو ادب میں ایک بڑی جماعت مومن کی شاعرانہ برتری کا اعتراف کرتی رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مومن سے پہلے کی شاعری ایک الگ راہ پر گامزن تھی۔ لیکن مومن نے اپنی شاعری میں خالص عشق و محبت کے تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاکر ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اس نئی راہ کے وہ تنہا مسافر نظر آتے ہیں۔ مومن کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں ان کا اعتراف غالب، شیفتہ، حالی اور آزاد کے علاوہ ناقد و محقق مولوی عبدالحیٔ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مولوی عبد السلام، نیاز فتح پوری، وقار احمد رضوی، نظیر صدیقی، سید امتیاز احمد اور عبد الباری آسی وغیرہ لوگوں نے بھی مومن کو انیسویں صدی کا کامیاب شاعر کہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان یوں رقمطراز ہیں :

> ''مومن خان مومن نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کے حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی ....مومن نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں، حسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنائے اور استعارے کے بادشاہ ہیں۔ اردو زبان کے اعلیٰ اور دل نشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔''
>
> (اردو غزل مصنفہ : ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص۔ ۹۹)

مومن اپنی غزل گوئی کی وجہ سے آج تک اردو ادب میں زندہ و تابندہ ہیں۔ ان کی شاعری پر بے تحاشا اعتراضات بھی ہوئے ہیں حتیٰ کہ انہیں چُما چاٹی والا شاعر کہہ کر بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے ان کی شاعری کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا اور دھیرے دھیرے ان کے مداحوں کی بھی ایک بڑی جماعت سامنے آگئی جنہوں نے ان کے کلام کی قدر و قیمت تعین کرنے میں عقیدت مندانہ رویہ اختیار کیا اور طرفداری بھی کی اور اس میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے کہہ دیا کہ انہوں نے ''غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کردیا'' جو درست معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر مجز سہسوانی کا یہ کہنا کہ مومن نے جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا، کچھ حد تک درست ہے۔ یا پھر نیاز فتح پوری کا یہ دعویٰ کرنا کہ مومن کو اپنے دیگر ہم عصروں میں جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ان کا رنگ تغزل ہے جو غیر معقولانہ چیز سے پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام بیانات کسی حد تک تمام ناقدین نے قبول کئے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں نے جو اس سلسلے میں مبالغہ آرائی کی ہے وہ بے دلیل اور لغوی باتیں ہیں۔ مومن کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ظہیر احمد نے جو خیالات رقم کئے ہیں وہ نہایت سنجیدہ اور مدلل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومن کی غزل کے اجزائے ترکیبی میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز بیان ہیں۔ باقی تمام خصوصیات ان میں سے کسی نہ کسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ مومن نے غزل کو محض تغزل تک محدود رکھا ہے، تصوف اخلاق، فلسفہ اور زندگی کے دوسرے مسائل کو غزل کے قریب نہیں آنے دیا۔ دائرہ کا محدود رکھنا مومن کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ کمزوری اس لئے کہ زندگی کا کینوس بہت وسیع ہے اور عشق اس کا صرف ایک شعبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی وسیع دنیا کے سامنے مومن کی دنیا بہت محدود نظر آتی ہے۔ قوت اس لئے کہ روح تغزل کے جو نمونے اور تجربے مومن کے کلام میں نظر آتے ہیں وہ دوسرے شعراء کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔''
>
> (مومن خان مومن مصنفہ : ظہیر احمد صدیقی، ص۔ ۴۱۔۴۲)

مومن خان مومن اپنے عہد کے ان چند شاعروں میں ہیں جنہیں اردو ادب میں اپنے انفرادو امتیاز سے اعلیٰ مقام عطا ہوا ہے۔ مومن کی غزل گوئی میں صداقت ہے۔ آپ بیتی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو پہلی مرتبہ واقعیت پسندی کا سبق پڑھایا ہے۔ انہوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر زندگی کی سچائیوں،

عشق کے نادر تجربات و مشاہدات کو برجستہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے غزل کے محبوب کو نسوانی پیکر عطا کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں موصوف کا محبوب کوئی خیالی پیکر نہیں ہے بلکہ ہماری طرح گوشت پوست والا انسان ہے بلکہ عورت ہے۔ اس نئی روش کے وہ بانی کہے جاتے ہیں اور اس نئے رویے نے اردو غزل کو اپنے محدود دائرہ سے نکلنے کی راہ ہموار کی ہے۔ یہی خوبی مومن کو اپنے تمام معاصرین شاعروں میں انفرادی و امتیازی شناخت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مومن کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا نہیں جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیران ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

اور مومن کا یہ شہرۂ آفاق شعر۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی اے غمزۂ غماز دیکھنا

مومن خان مومن نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں غزلیں کہیں ہیں چھوٹی بحروں میں وہ نسبتاً زیادہ دلسوز اشعار کہتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے ان کے کلام میں مکر شاعرانہ کی نشاندہی کی ہے۔ مومن کے کلام میں اس عنصر کی ہر جگہ نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن طوالت کا خوف پیش نظر ہے۔ نیاز فتح پوری کا یہ جملہ بھی بہت مشہور ہے کہ "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنا میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ "مجھے کلیات مومن دو اور باقی سب اٹھالو" اس جملے سے نیاز فتح پوری تمام شاعروں میں مومن کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اعتراف و اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ مومن کی غزل گوئی میں انفرادیت و امتیاز کا اعتراف مشہور و معروف ناقد کلیم الدین احمد نے بھی کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد کا ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے تاکہ مومن کی غزل گوئی میں امتیازات کا یقین ہو جائے اور بحیثیت غزل گو ان کے مقام و مرتبہ پر مہر توثیق ثبت ہو جائے۔ کلیم الدین احمد کے اقتباس پر میں اپنی بات ختم ہرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

"مومن کے عشق کی نوعیت ان کے اشعار میں کھلی ہوئی ہے۔ مومن کسی پردہ نشیں کے عشق میں مبتلا تھے۔ وصل و ہجر کی کشمکش، امید و بیم کی تصویر کشی ہر جگہ ہے۔ ان کے جذبات صادق ہیں۔ وہ واردات قلبی کا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے بیان میں پاکیزگی اور شیرینی ہے۔ کہیں ابتذال کا پتہ نہیں.........ان شعروں میں تاثیر ہے۔ یہ سنتے ہی دماغ پر اثر اور دل میں گھر کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت ہے پھر طرز ادا دلکش ہے۔ حسین خیالات و جذبات کو حسین لفظوں اور ترکیبوں میں ادا کیا گیا ہے۔ جذبات تو وہی ہیں جو سارے اردو شعراء میں ملتے ہیں لیکن ان کا بیان یہاں مومن کے مخصوص انداز میں ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا حسن بڑھ جاتا ہے اور دلکش اسلوب کے ساتھ ہر شعر ترنم سے بھی معمور ہے۔"

اردو شاعری پر ایک نظر، مرتبہ : کلیم الدین احمد، ص۔۱۴۳۔۱۴۴)

Md. Hanzala
Research Scholar
Urdu Dept Lalit Narayan Mithila University
Darbhanga

Al-Mansoor Educational & Welfare Trust (Darbhanga)

One Day Research Scholar National Seminar

اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں اردو کے مسائل اور ان کا حل

Certificate

This Is To Certify That Mr. M.D. HANZALAH Of. Research Schola, L.N.M.U University Participated/ presented A Research Paper Entitled School, College aur University Mein Urdu ke Masael aur Hal In The National Seminar Held On 03 November 2018 at seminar hall, Millat College, Darbhanga

A. M. Tarzi	Mansoor Khushter	Ahsan
(Prof. A.M.Tarzi)	(Dr. Mansoor Khushter)	(Dr. Ahsan Alam)
Program President	Secretary Program	Convenor

One day National Seminar

on

18th June-2019

EKISWEEN SADI MEIN URDU KI ADABI SARGARMIYAN

(SUBA BIHAR KE HAWALE SE)

اکیسویں صدی میں اردو کی ادبی سرگرمیاں

(صوبہ بہار کے حوالے سے)

ORGANIZED BY: BAZM-E-FAIZ

Dept. of Urdu, L.N.M.U. Darbhanga

This is to Certify that Dr./Mr./Ms. MD. HANZALAH (Research Scholar L.N. Mithila University Darbhanga)

Participated in the seminar on the topic Qadeem Darbhanga me Urdu Ghazal Ekisween Sadi men

we wish to place on record our deep sense of appreciation for contribution to deliberations in the Seminar

Dr. Md. Aftab Ashraf
Convenor, HoD Urdu
M.L.S.M. College Darbhanga

Prof. Nabi Ahmad
Chief Guest
Ex- HoD Urdu
J.P. University, Chhapra

Dr. S.M. Rizwanullah
Chairman
HoD, P.G. Dept. of Urdu
L.N.M.U. Darbhanga

مومن خاں مومن کی غزل گوئی

(3166)

تحقیقی مقالہ

برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اُردو)

ایل۔این۔متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ

سنہ ۲۰۲۰ء

مقالہ نگار :

محمد حنظلہ

ریسرچ اسکالر

ایل۔این۔متھلا یونیورسیٹی

دربھنگہ (بہار)

نگراں :

ڈاکٹر برکت علی

سابق صدر، شعبۂ اُردو

ایم۔ایل۔ایس۔ایم۔کالج

دربھنگہ (بہار)

Momin Khan Momin Ki Ghazalgoi

Md. Hanzalah

Ph.D.Thesis

باب پنجم

مومن کی مثنویاں : ایک مطالعہ

Momin's Masnavi-A Study

مومنؔ کی مثنویاں : ایک مطالعہ

مومنؔ نے غزل، قصیدہ، رباعیات وقطعات، معمیات اور واسوخت وغیرہ اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری کی شروعات مثنوی سے ہوئی تھی۔ ان کی حالات زندگی کے مطالعہ سے واضح ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی مثنوی شکایت ستم سولہ سترہ برس کی عمر میں لکھ ڈالی تھی۔ انہوں نے کل بارہ مثنویاں لکھی ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے :

(۱) شکایت ستم ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۶ء ۵۹۲/اشعار

(۲) قصۂ غم ۱۲۳۵ھ ۱۸۲۰ء ۵۳۴/اشعار

(۳) قول غمیں ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء ۴۴۰/اشعار

(۴) تف آتشیں ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء ۵۵۳/اشعار

(۵) مثنوی در ماتم حکیم غلام نبی خاں (والد مومن) ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء گیارہ اشعار

(۶) نکاح یار جانی کی تاریخ ۱۲۴۲ء ۱۸۲۷ء ۲۷/اشعار

(۷) حنین مغموم ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء ۵۶۲/اشعار

(۸) آہ وزاریٔ مظلوم ۱۲۴۶ء ۱۸۳۱ء ۵۵۳/اشعار

(۹) مناجات عاشقانہ.................................۳۰۸/اشعار

(۱۰) مثنوی جہادیہ.................................۶۰/اشعار

(۱۱) نامۂ مومنِ جان باز بہ جانب محبوبہ دل نواز ۳۹/اشعار

(۱۲) نامہ بہ سوز وگداز بہ سمت معشوقۂ طنّاز ۳۲/اشعار

تمام مثنویوں میں ابیات کی تعداد ۳۴۹۸/اشعار ہو جاتی ہیں۔ اس میں دس مثنویاں مومنؔ کی عشقیہ

زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک مثنوی مذہبی نوعیت کی ہے اور ایک مثنوی اپنے والد کی وفات کے تعلق سے قطعاتِ تاریخ کے ضمن میں ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومنؔ کی تمام مثنویاں ان کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔

مومنؔ کی مثنویاں ان کی غزل کی طرح حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مومنؔ کی مثنویاں ان کے عشق و محبت کی روداد پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے سطور بالا میں کہا ہے کہ موصوف کی دس مثنویاں اسی قبیل کی ہیں۔ جن میں عشق و محبت کی داستان بیان ہوئی ہے۔ جس طرح مومنؔ کی غزلیں حقیقت کا رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ان کی مثنویاں بھی حقیقت بیانی کی مرقع نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد گیان چند جین کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''اردو شاعری میں عشق کا تصور عام طور پر بڑا مثالی رہا ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں کے کردار کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثنویوں میں بھی عشق کا معیار غزلوں ہی سے لیا گیا ہے۔ لیکن بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں جو مبالغہ یا مثالیت سے پاک ہیں۔ اس نوع میں مومنؔ کے کارنامے سرفہرست ہیں۔ ان کے تجربات عشق سوفی صدی ایسے ہیں۔ جو گوشت پوست کے انسانوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اردو کے مثنوی نگاروں میں مومنؔ سب سے بڑے حقیقت نگار ہیں۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں: گیان چند جین، ص ۳۹۹)

مومن خان مومنؔ کی مثنویوں کا وہی موضوع ہے جو ان کی غزلوں کا موضوع ہے۔ ان کی غزلوں میں جو حدیث دل کی ترجمانی ہے وہی ان کی مثنویوں کا بھی رنگ و آہنگ ہے۔ غزلوں میں جو واقعات اشارے کنائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں وہی باتیں واضح اور مفصل طور پر بیان ہوئی ہیں۔ مومنؔ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مثنویوں میں مروجہ رجحان سے الگ ہٹ کر داخلیت پر زور دیا ہے۔ ساتھ ہی

ساتھ مثنوی کی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں اور غزل کی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں میں مومن نے اپنا امتیاز قائم رکھا ہے۔ مومن کے غزل کی تغزلیت مومن کی مثنویوں میں بھی موجود ہے۔ مومن کے جذبات و خیالات مثنویوں میں بغیر کسی پردہ داری کے بیان ہوئے ہیں۔ یہی مثنوی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ جذبات و خیالات کے تمام جزیات اس صنف میں واضح ہوجاتے ہیں۔ اس میں بیچ کے واقعات کو حذف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ مومن نے اپنی غزلوں میں محذوفات معنی پیش کئے ہیں۔ مثنوی میں تمام اصناف سخن جو اردو میں رائج ہیں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور تسلسل کے ساتھ واقعات بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن مومن کی مثنویوں میں واقعات کے تسلسل کا فقدان ہے۔ مومن نے مثنوی کے اجزائے ترکیبی کو نظر انداز کر کے صرف اپنی حدیث دل اور واردات قلبی کو شعری پیکر میں درج کیا ہے۔ اس لئے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مومن کی مثنویاں فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں عطا محمد کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''مومن نے اپنی شخصیت کا مکمل اظہار اپنی مثنویوں میں کیا ہے۔ وہ خالص تغزل جواب تک مومن سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے پہلے نشانات ان کی مثنویوں میں ملتے ہیں۔ ان مثنویوں کو پڑھ کر ایک بات تو صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مومن نے یہ مثنویاں چھپنے کے لئے نہیں کہی تھیں بلکہ یہ تو ایک طرح کا ان کا خودنوشت تذکرہ ہے جسے انہوں نے از راہ شوق مرتب کیا ہے۔ ان مثنویوں کو کہتے وقت ان کے پیش نظر نہ کوئی مثنوی تھی کہ کہانی۔ اسی لئے ان مثنویوں میں نہ تو کوئی مثنوی کی خوبی ملتی ہے اور نہ قصہ گوئی کی، نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ افسانے کا مقام عروج، نہ ان کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ ابتدا اس لئے نہیں کہ ساقی سے ایک جرعہ طلب کرنے کے بعد مثنوی میں فوراً عشق کی واردات کا ذکر آجاتا ہے، اور انتہا

اس لئے نہیں کہ سوا ایک آدھ جگہ کے محبوب اس محبت کو نباہتا ہے۔ نہ عاشق

۔ان کہانیوں کا سر پیر ندارد ہے۔ یہ یکا یک شروع ہو جاتی ہیں اور یکا یک

ختم ہو جاتی ہیں۔ فی الاصل ان میں چند خوبصورت عورتوں کے ساتھ

معاشرت ومباشرت کا تذکرہ ہے۔''

(مطالعہ مومنؔ: مضمون نگار عطا محمد، مرتبہ ساحل احمد، ص ۱۴۸)

مومنؔ کی مثنویاں میر حسنؔ اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کی طرح مثنوی کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔لیکن مومنؔ کی مثنویوں میں وہ پامال روایتی عشق ومحبت کے قصے بھی رقم نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کی مثنویاں حقیقی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں الگ ہوتی ہیں اور افسانے کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ یہاں کوئی شہزادہ نہیں ہے۔ محبوب بھی کوئی ماورائے فطرت نہیں ہے بلکہ گوشت پوست والا انسان ہے جو زمین پر چلتا ہے اور اپنی قوت انسانی سے محدود دائرہ اثر میں فطری عادات وحرکات سے پیش رفت کرتا ہے۔ مافوق الفطرت عادات کے کردار کی جھلک اس میں کہیں نہیں ہے۔ مومنؔ کی مثنویوں پر اس عہد کے رجحانات ورویوں کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔ زمانے کے تیزی سے بدل رہے حالات سے اقدار ومعیار میں نمایاں فرق محسوس کئے جا رہے تھے۔ جو موصوف کی مثنویوں میں بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی مثنویوں میں صرف ایک مثنوی ''شکایت ستم'' کو چھوڑ کر تمام مثنویوں میں محبوب کی محبت ایثار وقربانی اور وفا شعاری کا میلان مفقود ہے۔

بہر کیف مثنوی کی ان فنی کمیوں کا دفاع کرتے ہوئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

''مثنوی کے بارے میں بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ مثنوی بغیر پلاٹ کے بھی ممکن ہوسکتی ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں جو خیال پرورش پا رہا ہے وہی پلاٹ ہوتا ہے۔ صرف ہم یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس میں تسلسل ہو اور واقعات ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح جکڑے ہوئے ہوں۔ اور انداز بیان میں حسن ہو ورنہ ان میں اثر نہ ہوگا

اور سپاٹ پن پیدا ہو جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ پلاٹ اہم ہے مگر اس کی اہمیت اتنی نہیں ہوتی جتنی کردار کی۔ چاہئے یہ کہ شاعر کردار کو واقعات پر اتنا حاوی کردے کہ پلاٹ کی حیثیت ثانوی رہ جائے۔ اس کے علاوہ شاعر کا ایک خاص مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے..............اس کے پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر میں باہم اس قدر ربط وضبط ہو کہ ایک دوسرے کے بغیر سمجھنا دشوار ہو۔ اس کے ساتھ اس میں واقعہ نگاری کا ایک خاص مقام ہے۔ جذبات انسانی کی تصویر کشی، ماحول کی عکاسی، باہمی تعلقات کا اظہار یہ وہ مراحل ہیں جن کے بغیر مثنوی کا پایہ تکمیل کو پہنچنا ممکن نہیں۔''

(مومنؔ شخصیت اور فن، مصنفہ پرفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص ۲۲۱/۲۲۲)

مومنؔ کی مثنویاں اپنے اندر عصری میلانات رکھتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ جاگیردارانہ نظام ختم ہو رہے تھے اور مزدور محنت کش کا بول بالا ہو رہا تھا۔ اقدار و معیار یکسر بدلتے جا رہے تھے۔ ایسے دور میں جب سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی تمام رجحانات میں انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ اخلاقی اقدار بھی پامال ہو رہے تھے۔ ان تمام حالات کا اثر شاعری پر اور شاعر پر بھی ہونا واجب تھا۔ لیکن مومنؔ کی تعلیم و ترتیب ایسے دینی ماحول میں ہوئی تھی کہ زمانہ کا اثر ان کی شخصیت پر اور ان کی شاعری پر جزوی طور پر پڑا۔ مومنؔ اپنی مثنویوں میں ایک حد تک عریانی کو راہ دیتے ہیں لیکن متقدمین کی نسبت کم۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد کیفی چڑیا کوئی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ پر جو لوگ یہ الزام رکھتے ہیں کہ ان کی مثنویاں، متانت سے گری ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے شاید حضرت جامی کی ''مثنوی ''یوسف زلیخا'' امیر خسرو کی ''مجنوں لیلیٰ'' اور نظامی کی ''لیلیٰ مجنوں'' شیریں خسرو میں شب زناۃ اور شب وصال کے بیان نہیں دیکھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایسے مواقع کے جذبات بیان کرنا اپنا کمال سمجھتا ہے، معانی و بیان کے ماہرین کا قول ہے کہ جو بیان حسن قدرت، واقعہ اور فطری جذبات کے مناسب ہوتا ہے۔ اسی قدر اثر انداز فطرت ہوتا ہے۔

''مقامات بدیع الزماں ہمدانی'' میں خصوصیت کے ساتھ ایک ''مقالہ'' اسی بیان میں ہے۔ بڑے بڑے محتاط شاعر اس صنف میں آکر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ''مومنؔ'' کی سادگی دیکھئے کہ وہ اپنے واقعات اور واردات اپنی زبان سے کم وکاست بیان کردیتے ہیں، کوئی واقعہ کہیں اگر متانت سے گر جاتا ہے تو واقعہ کی نوعیت ہے شاعر کا کیا قصور ہے۔''

(نگار (پاکستان) مومنؔ نمبر، مضمون نگار کیفی چڑیا کوٹی، ص ۲۱۳)

مومنؔ کی مثنویاں ان کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ ان کے یہاں عشق ومحبت کی خالص ہوس پرستی نہیں ہے بلکہ ایک عاشق مزاج اوباش پسند انسان کی فطری ضرورتوں کی تکمیل کا مرقع ہے۔ مومنؔ کی زندگی میں عشق ومحبت ایک محدود وقت میں رونما ہوتا ہے اور پھر اپنی عمر کی درازی ختم ہوتے ہی نئے محبوبہ کو تلاش لیتا ہے۔ مومنؔ کی یہی فطرت انہیں مباشرت کی طرف راغب کرتی ہے ان مثنوی میں عریاں اشعار اور اس کیفیت کے اظہار میں جو اشعار تخلیق ہوتے ہیں وہ اخلاقی اعتبار سے کم تر ہوتے ہیں۔ لیکن مثنویوں میں تمام شاعروں کے یہاں یہی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ پیشتر شاعروں یا مثنوی نگاروں کی مثنویوں میں عریاں اشعار، سطحی اشعار مل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرش گیاوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''ہاں بعض معترض کا جواب دینا جنہوں نے چھوٹا منھ بڑی بات کہی ہے، ضرور ہے۔ یعنی وہ لکھتے ہیں کہ یہ مثنویاں عریاں احوال سے بھری ہوئی ہیں اور ان کا اثر اخلاق پر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ مثنوی

''خواب وخیال'' مصنفہ میر اثر برادر خواجہ میر درؔد یا ان مثنویوں سے بھی زیادہ خراب ہیں، جن کے اشعار میں یہ مصرع بھی داخل ہے کہ ع

ساری کھٹیا لہو لہان ہوئی

(فیصلہ) مثنوی عمیق مصنف نے احوال خاص میں لکھی ہے۔ دوسری مثنویاں جن میں اپنے کو مخاطب تو کیا ہے مگر واقعی زمانہ کے شوقینوں اور نوجوانوں کے حالات سے وابستہ ہیں کیونکہ مومنؔ کو کسی مورخ نے آوارہٗ روزگار نہیں لکھا اور اسی صورت میں تم سمجھو کہ نہ سمجھو مگر وہ عشق کا ڈرامہ جو خیالی ہے نتیجہ سے خالی نہیں۔ نیز ان کے دامن اتقا پر تمہارے لگائے داغ نہیں لگ سکتا۔ مومنؔ کی ان مثنویوں تک جذبات عشق مجازی کو مدنظر رکھ کے میر حسنؔ کی مثنوی جس میں خلاف یقین دیو اور پری کے قصے ہیں ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔''

(حیات مومنؔ: ضمیرالدین احمد عرش گیاوی، ص ۱۰۵)

مومنؔ کی مثنویوں کے متعلق اس طرح کے اعتراضات اور اس کا جواب مختلف ناقدین کی آرا میں موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو مثنوی کی روایت میں تقریباً تمام مثنویاں ایسی ہیں جن میں شاعر نے کردار کے جذبات و حرکات کو عریانی اور سطحیت کے حمام میں ننگا کھڑا کر دیا ہے۔ اور یہ تمام باتیں اس زمانے کی عصری حسیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ یعنی اس عہد میں سماجی، معاشی، اقداری اور معیاری تصورات شکست و ریخت کے شکار ہو گئے تھے۔ یعنی تمام لوگوں کی دو صورتیں واضح طور پر ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ ایک سماج کے سفید پوش لوگ کی دوسری تصویر انہیں لوگوں کی سیاہ پوش کی بھی تھی۔ اس طرح دکھاوا کچھ اور تھا اور کردار کچھ اور تھے۔ اس سلسلے میں عطا محمد کا ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں :

''یہ زمانہ شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے سامنے ہتھیار

ڈال رہا تھا۔ پرانے رؤساء اور شرفا نئے رؤساء اور شرفا کے سامنے
دوزانوں ہو کر بیٹھنا سیکھ رہے تھے۔ اور اپنی ذلت و غربت سے گھبرا گھبرا
کر ''ہائے شرافت نسل'' اور ''ہائے شرافت خاندان'' کا نعرہ لگا رہے تھے۔
اقتصادیات کے ڈھانچے پگھل کر نئے ڈھلنے والے تھے۔ جب یہ حال ہو تو
بھلا عشق کا کہاں گزارا۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں کے یہاں غم جاناں پر
غم روزگار حاوی آتا دکھائی دیتا ہے۔ جب اپنی ہی استقامت مشتبہ ہو تو غم
جاناں کی استقامت معلوم!.......... مگر مومنؔ خان میں اتنی قوت نہ تھی۔ وہ
ان متزلزل بنیادوں پر کھڑے خود بھی کانپ رہے تھے۔ چنانچہ عشق کافور ہو
گیا۔ اور ہوس ہی ہوس رہ گئی۔ اور یہ ہوس بھی وقت کی تیز رفتار تبدیلیوں
سے قدم نہ ملا سکنے کی وجہ سے کچھ اس درجہ پتلا پن اختیار کر گئی اور اس قدر
عارضی ہو کر رہ گئی۔''

(مطالعہ مومنؔ، مرتبہ ساحل احمد مضمون نگار: عطا محمد ص ۱۴۹)

مومنؔ کی شاعری میں یہی عصری کشاکش کے پس منظر ان کے افکار و تصورات کے گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے مزاج میں عشق بازی اور اوباش پسندی نے گھر کرلیا۔ اس لئے وہ دل لگانے کو ایک مشغلہ وقت تصور کرتے ہیں اور ہر مرتبہ دل لگا کر اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور پھر آگے کے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ جہاں انہیں پھر دوسرے، پھر تیسرے اور پھر چوتھے سے دل لگانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لئے وہ کسی ایک حسین کی زلف میں گرفتار نہیں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے عشق میں طہارت و پاکیزگی، استقامت و پائیداری اور گہرائی و گیرائی عنقا نظر آتی ہیں۔ لیکن مومنؔ ان تصورات و خیالات کو بالکل حقیقت و واقعیت کے پیرائے میں بغیر کسی آمیزش کے شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی مثنویوں سے حقیقت کا رنگ، ان کی شخصیت کا پرتو اور جمالیاتی پہلو مترشح ہوتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا امتیاز

وانفرادبھی ٹھہرتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی مثنویوں میں مثنوی کا عام انداز نہیں ہے۔انہوں نے اس صنف کے مقصد مقتضیات کو سامنے میں رکھ کر برتنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ انہوں نے تو اس کو اپنی آپ بیتی بیان کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ تو گویا نظمیں ہیں۔جن میں مومنؔ کی نجی زندگی کے نشیب وفراز کی اصلیت اور حقیقت سے بھر پور تصویریں ہیں۔ اس لئے ان میں وہ بے لاگ خارجیت نہیں جس کا ہونا مثنوی کی صنف کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔مومنؔ کی نجی زندگی کے نشیب وفراز کی کہانیوں نے ان مثنویوں کو خارجیت کے بجائے خاصی حد تک داخلیت کے قریب کردیا ہے۔ چنانچہ داخلی آہنگ ان پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔اور یہی سبب ہے کہ ان مثنویوں میں سوز وگداز کے عناصر سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ان میں کہانی اور پلاٹ کی کوئی دلچسپی نہیں، کردار نگاری بھی یہاں لطف کا کوئی سامان پیدا نہیں کرتی، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کو بھی ان میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ لیکن ان میں محسوسات کے بیان نے ایک ایسا گداز پیدا کر دیا ہے۔جس سے ولاس کی طرف کھینچتے ہیں۔اور مومنؔ نے چونکہ ان میں اپنے تجربات کو پیش کیا ہے اس لئے ان میں ہر جگہ اصلیت کی چاندنی چھٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پھر ان میں اظہار کی جو سادگی، بیان کی جو روانی اور طرز ادا کی جو طرحداری ہے۔اس نے ان مثنویوں کو ایک ایسی بلندی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ جہاں سوائے مومنؔ کے کسی اور کا پرواز کرنا ممکن نہیں۔مومنؔ نے ان مثنویوں کی تخلیق کر کے مثنوی کے فن کے حدود توڑ

دئے ہیں اور اس فن کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ لیکن یہ بات
عجب نہیں ہے کیونکہ ان سے قبل میرؔ بھی ایسا ہی کر چکے تھے۔ ان مثنویوں
میں دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ مومنؔ نے اس صنف کے ذریعے اپنے اوپر
بیتی ہوئی باتوں کو کس خوبی سے بیان کر دیا ہے۔ تغزل مومنؔ کے مزاج کا
لازمی جزو تھا۔ چنانچہ تغزل کی بنیادی خصوصیات بڑی حد تک ان کی ان
مثنویوں میں بھی نظر آتی ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے۔ مثنوی کی صنف میں
ان کے اس میلان کو ایک نیا تجربہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔''

(کلیات مومنؔ مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۵۵/۵۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مومنؔ کی مثنویوں کی تمام خصوصیات کو نشانِ زد کر دیا ہے اور اس کے امتیاز و انفراد کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گیان چند جین نے مومنؔ کو حقیقت نگار شاعر انہیں مثنویوں کی بنیاد پر کہا ہے۔ اس لئے مومنؔ تمام اصناف شاعری میں ایک حقیقت نگار شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ اور ان کے فطری میلان میں تغزل کا رنگ اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ وہ جس صنف میں بھی طبع آزمائی کریں یہ عنصر ان اصناف میں کم و بیش داخل ہو ہی جاتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی تمام مفروضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مومنؔ کی مثنویوں کا جائزہ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔

مومنؔ کی مثنوی ''شکایت ستم'' میں داخلیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اس مثنوی میں ابتدا سے آخر تک واقعیت کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ بطور خاص زبان و بیان، سلاست و روانی اور الفاظ و تراکیب کے نشست و برخاست نہایت برجستہ و برمحل نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ جذبات کی ترسیل نہایت عمدہ ہے۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ سطور میں بحث ہوئی ہے کہ جذبات کی پیکر تراشی میں کہیں کہیں عریانی اور سطحی خیالات الفاظ کے پیکر میں ڈھل گئے ہیں۔ جو جذبات کا بولہوسانہ اظہار معلوم ہوتا ہے۔ بہر کیف اس بحث سے قطع نظر مومنؔ کی یہ مثنوی ان کی تمام مثنویوں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے پہلے

اپنے دل کی کشمکش ، بے چینی اور درد دل اور عشق کی حرماں نصیبی کا ذکر ابتدائی اشعار میں کیا ہے۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا دے چک آب آتش رنگ
گرم و سرد زمانہ سے ہوں تنگ

نالۂ آتشیں ہے تف پرور
کرۂ زمہریر ہے دم سرد

جوش صیف و شتا سے حال نہیں
اس ہوا میں کہ اعتدال نہیں

مے طبیبِ روان محزوں ہے
خم بادہ خُم فلاطوں ہے

یہ اگر التفات فرما ہو
بادِ صرصر دَم مسیحا ہو

گرم تدبیر کر ذری ہو جائے
تپ غم نار عنصری ہوجائے

چارہ سازی کرے جو بعدِ ہلاک
بنے خاک شفا مزار کی خاک

گر عرق ریز فکرِ درماں ہو
گریہ ماتم آبِ حیواں ہو

اس سے ممکن علاج عاشق ہے
گرم و ترہم مزاج عاشق ہے

کھودے یہ رشک شربتِ اعجاز
نزلہ اشک چشم اہلِ نیاز

کیا کہوں اس کی چارہ فرمائی
ہے یہ تریاک زہر تنہائی

مثنوی ''شکایت ستم'' کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اپنے غم کا علاج چاہتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اپنے عشق کا افسانہ جو میں نے اب تک چھپا رکھا تھا۔ اسے اب بیان کردوں اور جوش و مستی میں آکر وہ اپنے عشق کی داستان شروع کردیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ جب نو برس کے تھے تب اس عشق کی ابتدا ہوئی تھی اور یہ غم ان کا کم سے کم سات برس پرانا تھا۔ جس وقت موصوف نے مثنوی لکھی اس وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ برس تھی۔ اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

تھے برس ہم شمارۂ افلاک
کہ ہوا پائمال صورت خاک

کھو دیا چین اے مہہ رو نے
شب سیہ کی ہلال ابرو نے

خنجرِ غمزہ نے ہلاک کیا
نرگسِ سرمہ سانے خاک کیا

اور اس کا بھی مجھ پر دل آیا
کھو کے دل میں نے جان کو پایا

دشنہ تھے زخم بار دونوں کے
ہوئے سینہ فگار دونوں کے

صبر و آزمائش وثبات چلے
آپ سے دونوں ساتھ ساتھ چلے

مومن کولڑکپن میں ہی کسی حسین دل نشیں سے عشق ہوگیا دونوں ایک دوسرے سے عہد و پیاں کرنے لگے۔ یہ عشق جیسے ایک کھیل تھا۔ دونوں کواٹھارہ سال یعنی سن بلوغت سے پہلے ہی یہ مرض لگ گیا اب انہیں پڑھا

سبق یاد نہیں رہتا تھا کچھ خیالوں خیالوں میں لطف محبت کی بات یاد کرتے اور خوش ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ تمام کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اس عشق کی خبر لوگوں کو ہوگئی اب ملنا جلنا بھی ختم ہو گیا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شہرۂ عاشقانہ ہونے لگا
حال میرا فسانہ ہونے لگا

گھہ گئے جو وصال ہوتا تھا
وہ بھی جی کا وبال ہوتا تھا

اس طرح دونوں کے عشق کے قصے زمانے میں بیان ہونے لگے۔ اب کیا تھا غم ہجر میں جلنا قسمت کو نصیب ہوا۔ جدائی کے دو سال اسی طرح گذر گئے لیکن قسمت نے کروٹ بدلی اور سوئی قسمت جاگ اٹھی۔ کسی کی شادی کی تقریب میں وہ ماہ رو پھر آئی دونوں کا ملنا جلنا شروع ہوا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہوئی شادی ہمارے یاں یکبار
آئی مہماں وہ دولت بیدار

شرکت محفل سراپا زیب
اس کے آنے کی ہو گئی تقریب

ایک خالی مکان میں آکر
مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر

کیا ملاقات رشک تنہائی
دم بدم تازہ حسرت افزائی

دونوں جانب سے نالہ و فریاد
شکوہ جورو طعنۂ بیدار

گرد دل سے اُڑیں زمیں کے ہوش
نالۂ آسماں فگن کا جوش

لیکن یہ وصال کب تک، جدائی تو ہونا ہی تھا۔ یعنی محبوب کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔ یہ ہاتھ ملتے رہ گئے، وہ چلی گئی۔ اس طرح تمام خوشیاں کافور ہو گئیں۔ اب جدائی میں جان گھلنے لگی۔ مومنؔ کے محبوب کو سب سے زیادہ جدائی کا غم ہوا تھا۔ اس کو جدائی کا صدمہ پہنچا اور وہ بیمار ہو گئی۔ بستر مرگ پر لیٹی رہی۔ ایک ایسا بھی وقت آیا کہ اسی دردِ محبت نے اس کی جان لے لی اور وہ خدا کو پیاری ہو گئی۔ یہ خبر ایک روز مومنؔ کو بھی مل گئی۔ ادھر مومنؔ کا بھی حال بُرا ہو گیا۔ اس تعلق کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سینۂ کو بی سے دل فگار ہوا
تیر حسرت جگر کے پار ہوا

دم اٹکتے اٹکتے ٹوٹ گیا
سر پٹکتے پٹکتے پھوٹ گیا

جی کو رشک زمین خاک کیا
خواہش مرگ نے ہلاک کیا

موت پر نکلے آرزو کا دم
یہ بنی دم پہ پر نہ بگڑا دم

نالہ آخر فسوں ہوا دل کو
رکتے رکتے جنوں ہوا دل کو

مومنؔ اپنے معشوق کے غم میں اپنے جاں کو کھلانے لگے اور شدید بیمار ہو گئے دل کا دورہ پڑنے لگا۔لوگوں نے بہت علاج کرایا رفتہ رفتہ بیماری جاتی رہی صرف کمزوری رہ گئی۔مومنؔ کی زندگی میں یہ ان کی پہلی محبت تھی اس لئے شاید ظہیر احمد صدیقی اس مثنوی کے داستان کو مومنؔ کا سچا عشق تصور کرتے ہیں اور یہ قیاس از بعید نہیں ہے کہ انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے اسی محبوب کی موت پر لکھا ہے۔حالانکہ کئی لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ مرثیہ صاحب جی امتہ الفاطمہ کی موت پر مومنؔ نے لکھا ہے۔لیکن اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی ،حتیٰ کہ محققین امتہ الفاطمہ کے متعلق خاموش ہیں سیّد امتیاز احمد نے اپنے مضمون میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ مرثیہ مومنؔ کی پہلی محبوبہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔کیونکہ ان کی پہلی محبت سچی تھی مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مجھکو نہ اپنے ساتھ عدم میں لے گیا
ہر دم شکایتِ نفس نار سا ہے آج

آواز ہائے ہائے کی آتی ہے متصل
گردوں طلسم گنبد ماتم سرا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے
کیا جانے اس زلف پریشاں کو کیا ہوا

پیتی ہے اپنا خونِ دل افسوس سے حنا
اس دشت رشک پنجۂ جرجاں کو کیا ہوا

شبنم کو پھر ہے جانبِ خورشید التفات
شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا

منقولہ بالا مرثیہ میں جذبات کی شدّت اپنے اوج پر ہے۔ اظہار میں خلوص و بے ساختگی بھی ہے۔ غرض فکری اعتبار سے مومنؔ کا یہ مرثیہ قابلِ قدر بھی ہے اور واقعیاتی رنگ بھی لئے ہوئے ہے۔ بہر کیف مومنؔ کی پہلی محبوبہ کے انتقال کے بعد مومنؔ نے اپنے دل کو سمجھایا اور دھیرے دھیرے صحت یاب ہو ہی رہے تھے کہ ایک روز اچانک انہیں غش آ گیا جب آنکھ کھلی تو ایک نازنیں کے زانوں پر سر رکھے ہوئے تھے بس کیا تھا۔ پھر اس کو اپنا دل دے بیٹھے اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

دیکھ زانوں پر اس کے سر اپنا
تھا دماغ آسماں پر اپنا

جان سی آگئی کہ تھا سر شار
آب حیواں سے جام زانوئے یار

کیا کہوں پرسشِ نگاہِ کرم
چشم سے غمزہ داد خواہ ستم

غرض یہ کہ ڈوبتے کو سہارا مل گیا۔طبیعت بالکل بشاش ہوگئی۔دونوں میں عشق ومحبت کے عہد وپیاں ہوگئے۔دونوں کا ملنا جلنا تنہائیوں میں چلنے لگا۔یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلا ایک روز یہ راز بھی فاش ہوگیا کسی نے دونوں کو ایک ساتھ بوس وکنار کرتے دیکھ لیا اور تمام لوگوں میں یہ بات مشتہر ہوگئی۔گھر پر بھی انہیں کافی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔چند روز تک تعلق منقطع رہا لیکن ایک روز پھر دونوں تنہائی میں مل گئے۔دونوں میں بات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ آدھی رات کے قریب چپکے سے اٹھ کر محبوبہ کے مکان پر آجایا کریں اور پھر چند گھنٹوں کے بعد لوٹ جایا کریں۔کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ایک روز چاندنی رات میں جب مومنؔ آئے اور آکر لوٹ گئے لیکن اس ملاقات سے مومنؔ کے دل کو تشفی نہ ہوئی، دل کی بے قراری نہ تھمی اور پھر دوبارہ اس طرف کا رخ کیا۔گھر میں داخل ہونے سے پہلے ایک ضعیفہ نے دیکھ لیا اور اس نے ٹوک بھی دیا کہ یہ دونوں کیسے شریر ہیں۔ہمیں تو نیند نہیں آتی یہ ہر رات چین کرتے ہیں۔صبح ہونے دو کیا فتنہ اٹھاتی ہوں۔مومنؔ الٹے پاؤں بھاگے پھر محبوبہ کے گھر کا رخ نہ کیا۔غنیمت یہ ہوئی کہ اس ضعیفہ نے صرف دھمکا کر چھوڑ دیا کسی سے نہ کہا۔

ایک روز اتفاقاً وہ محبوبہ مومنؔ کو بام پر نظر آگئی۔مومنؔ نے ملنے کی کوشش کی لیکن اس نے منع کر دیا کہ تم نے مجھے رسوا کر دیا اب ادھر کا رخ نہ کرو۔جاؤ کہیں اور جاکر عشق بازی کرو۔وہ یہ سن کر لوٹ آئے اور دوسال تک جدائی کا صدمہ جھیلتے رہے۔ایک روز پھر وہ بام پر نظر آئی۔مومنؔ چپکے سے چھت پر چلے گئے اور انہوں نے اسے زبردستی گلے سے لگالیا۔پہلے تو وہ تھوڑا تلملائی مگر پھر فوراً راضی بھی ہو گئی اور نوبت وصل تک پہنچ گئی۔

جب کبھی وہ اکیلی ہوتی تو ایک رازدار بڑھیا کے معرفت مومنؔ کو بلوالیتی ۔ ایک روز جب وہ بڑھیا بلانے آئی تو مومنؔ دیوان خانہ بند کر کے فکر شعر میں غوطہ زن تھے ۔ اس لئے انہوں نے کہلوایا کہ تم چلو میں پیچھے سے آرہا ہوں ۔ لیکن اس خادمہ نے پتہ نہیں جا کر کیا کہہ دیا کہ اس کے بعد رشتہ ہی منقطع ہو گیا۔

مومنؔ نے جو اس خادمہ کے تعلق سے شعر کہے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

جا کے اس سے کہا کہ اے نادان
بے خبر کس طرف ہے تیرا دھیان

تو ہے اس کے لئے حزن و ملول
وہ ہیں عیش و نشاط میں مشغول

اب وہ کھل کھیلے کب ہیں تجھ پر بند
دیکھ کر مجھکو کر لیا در بند

رخنہ در سے میں نے جب جھانکا
اور عالم نظر پڑا واں کا

اک پری وش نہ تجھ سے غیرت حور
پاس بیٹھی تھی ان کے اب سے دور

میری آواز سن نہ آئے نکل
وہیں سے بولے آؤں گا تو چل

جوں ہی یہ حرف تابلب آیا
گئی وہ ہاتھ سے غضب آیا

بات کہنے میں اس نے کام کیا
قصہ دوستی تمام کیا

مومنؔ نے پھر دوبارہ اس محبوب سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش ہوگئی اور پھر موصوف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب مومنؔ نے اس کی طرف سے اس قدر بے توجہی دیکھی تو انہیں بھی اپنے آپ پر شرم آنے لگی اور بالآخر انہوں نے بھی ارادہ کرلیا کہ اب اس سے نہ مل کر اس کا انتقام لوں گا۔ اس طرح یہ مثنوی بھی ختم ہوجاتی ہے اور مومنؔ کی عشق کی کہانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مومنؔ نے اپنی مثنویوں میں دو دو تین تین معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی میں مومنؔ کی عمر سترہ بتائی گئی ہے۔

''قصہ غم''، مومنؔ کی دوسری مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں مومنؔ کا انداز ذرا مختلف ہے۔ اس مثنوی میں وہ بظاہر ہیرو نہیں ہیں بلکہ ایک راوی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل اس مثنوی کا ہیرو ان کا دوست ہے اور دوست ہونے کی وجہ سے وہ اس کے متعلق تمام باتیں جانتے ہیں اور ان تمام مراحلوں کا ذکر کرتے ہیں جو مثنوی کی کہانی میں پیش آتے ہیں۔

مومنؔ اس مثنوی کی ابتدا کرنے سے پہلے ایک لمبی چوڑی تمہید باندھتے ہیں اور امید کرتے ہیں اس مرتبہ انہیں معشوق وفادار ملے۔ جو ان کا ساتھ ہمیشہ دے ورنہ دل لگانے کے بعد عشق میں طرح طرح کی

صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اگر بے وفا محبوب مل جائے تو ہجر میں جان کھلانی پڑتی ہے۔ یہ تمام افکار و خیالات ان کے تصوراتی ہیں جن میں انہوں نے سینکڑوں اشعار صفحہ قرطاس پر رقم کردئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے تمہیدی اشعار پیش کردئے جائیں۔ جس سے قاری بھی محظوظ ہوسکے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کج دارو مریز کب تلک یوں
بس جام میں بھر شراب گلگوں

پھر لب سے مرے اسے لگادے
ساغر کوئی متصل پلادے

ساقی ہیں یہ روز ہائے گلگشت
ہے غیرت باغ ہر برو دشت

اب دور فلک سے دل ہوا شاد
ہے نام حمل کا مہر آباد

ہیں جلوۂ نو بہار کے دن
بد مستی بادہ خوار کے دن

تزئین سمن کے ہیں یہ ایام
گلگشت چمن کے ہیں یہ ایام

کیا رنگ چمن بہار پر ہے
کالم گل و لالہ زار پر ہے

یہ داغ وہ آتشِ جہاں سوز
اِک جس کا شرر ہو آسماں سوز

یہ عشق ہے رنج جاودانی
ممکن ہی نہیں نجات پانی

گو آپ کہیں نہیں دیا دل
پر دیکھے ہیں عاشقانِ کامل

گر سنئے تو کچھ بیاں کروں میں
اِک راز نہاں عیاں کروں میں

ہیں چند فغاں عاشقانہ
آلودہ درد ہے فسانہ

ہے قصد دوستانِ صادق

ناز صنم و نیاز عاشق

کیا حال عجیب و دل نشیں ہے

افسانہ درد آفریں ہے

اس کے بعد اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ جس میں سب سے پہلے ہیرو کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس ہیرو کا نام بھی اتفاق سے مومن ہی ہے۔ جس کی کہانی شاعر یعنی مومن خود سنا رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ ہیرو شاعر کا دوست ہے۔ اس لئے اس کے مزاج سے وہ واقفیت رکھتے ہیں اور شاعر کا دوست کہیں دل لگا بیٹھا ہے۔ اس عشق میں وہ اس قدر دیوانہ ہوگیا ہے کہ آبادی گھر وغیرہ چھوڑ کر جنگل کی طرف چلا جاتا ہے لیکن اس بات کی خبر شاعر کو نہیں ہے۔ ایک عرصے تک دونوں ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں لیکن اتفاقاً شاعر جب جنگل میں پکنک کی غرض سے جاتا ہے تو اسے وہاں اس کا دوست نظر آ جاتا ہے۔ یہ اپنے محبوب کے فراق میں جنگل میں گزر بسر کر رہا ہے۔ یہ فراق زدہ نوجواں عالم تصور میں محبوبہ سے شکایت کر رہا ہے کہ پہلے تو تم محبت کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھی وصال کا وعدہ وفا کیا کرتی تھی اب کیوں بے وجہ تم مجھ سے ناراض ہوگئی ہو۔ اس عاشق کی محبوبہ ایک طوائف ہے یا بازاری عورت ہے۔ اس کی بے وفائی سے عاشق کا بھی برا حال ہے۔ اسے اپنے پرائے کسی کی تمیز نہیں ہے۔ ضعف رقابت کی وجہ کر حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے۔ لیکن عاشق اپنے معشوق سے وصل کی باتیں یاد کر رہا ہے اور اسے دہرا رہا ہے۔ اس دلچسپ واقعات کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ جس میں مباشرت اور مباشرت کی تیاریوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ حصہ مثنوی کا نہایت سادہ اور دلچسپ اور پر اثر بھی ہے۔ اس کے بعد وہ موجودہ صعوبتوں اور ہجر کے کیفیات کا دردانگیز واقعہ بھی بیان کرتا ہے۔ لوگ رنج وغم کے واقعات سنتے سنتے تھک چکے ہیں اور کہانی کو روک دیتے ہیں۔

اس مثنوی کا کچھ حصہ نہایت عریاں اور سطحیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اسی مثنوی کی وجہ سے مومن کو

چوماچاٹی کا شاعر بھی کہا گیا ہے۔اس مثنوی کی عریانیت مومن کو ایک ہوس پرست اور اوباش پسند شاعر کی صف میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ اس مثنوی کا طرز بیان اسے میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' اور مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' سے مماثلت پیدا کرتا ہے۔ان مثنویوں میں بھی بوس وکنار اور وصل کے بیان حد سے تجاوز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بہرکیف اس مثنوی کے اختتامیہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کیا جرم ہوا معاف کیجئے
دل میری طرف سے صاف کیجئے

پھر بہر خدا تمہارے قرباں
ہو جایئے ویسے ہی مری جاں

پھر خلوت خاص میں بلا لو
دل کی مری حسرتیں نکالو

پھر مل کے شراب ناب پیجئے
پھر وصل سے کامیاب کیجئے

اب مجھ میں نہیں ہے تاب و فرقت
کب تک سہوں عذاب فرقت

بیتابی دل سے لب ہے بے جان
ہوں کوئی گھڑی کا دم کا مہمان

اب مرنے میں میرے کیا ہے باقی
فانی ہیں سبھی خدا ہے باقی

اس طرح غرض بہک رہا تھا
کچھ جوش جنوں میں بک رہا تھا

اس جوش میں اور جوش آیا

بیہوش کو طرفہ ہوش آیا

پھر درد زباں انا الصنم ہے

منصور سے مرتبہ نہ کم ہے

بس مومنؔ دل گداز خاموش

اب طاق ہوئی ہے طاقت جوش

باقی نہیں اب توہم میں حالت

ہے اور ہی درد و غم میں حالت

جاری ہے ہر ایک چشم سے خوں

تھے شعر کہ نالہ ہائے موزوں

اس قصہ غم نے جی کھپایا

اس سوز نہاں نے دل جلایا

کر ڈالا کباب سامعیں کو

آگے نہیں تاب سامعیں کو

ہر حرف ترا شرر فشاں ہے

ہے آگ کا شعلہ یازباں ہے

زیں باش زسوز سینہ مخروش

چوں شمع خموش باش خاموش

''قول غمیں''، مومنؔ کی ایک بہترین مثنوی ہے۔ یہ مثنوی مومنؔ کی شاہکار مثنوی گردانی جاتی ہے اس مثنوی کی ابتدا میں تمہیدی اشعار کے طور پر موصوف نے اپنے پرانے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ محبت

میں انہوں نے کیسے کیسے زخم کھائے ہیں۔ جدائی میں، بے وفائی میں کیسے دن گن گن کر گزارے ہیں۔ عشق و محبت میں تمام گزرے ہوئے واردات کی یاد دہانی کی گئی ہے اور اس کام میں ۹۶ ر چھیانویں اشعار درج کئے ہیں۔ تمام اشعار میں ایسی ہی گزری ہوئی تمام باتوں کو یاد کیا ہے۔ اس حصے کے ابتدائی اور اختتامی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا زہر پلا دے مجکو
شربت مرگ چکھا دے مجکو
یاں سیہہ مستی حرماں یہ نگاہ
دے وہ مے یعنی کف مار سیاہ
تلخی یاس عبادت کب تک
حسرت ذوق شہادت کب تک
کیا ذرا سودۂ الماس نہیں
سم ہلاہل تیرے کچھ پاس نہیں

آتش شوق کی حدت نہ رہی
نا توانی کی وہ شدت نہ رہی
زخم کاری ہوئے آخر نا کام
آگیا جوش طپش کو آرام
سخت جانی کا گلہ دل پر شاق
حسرتِ وصل نہ اندوہ فراق
نہ سبک سر میں گراں جانی سے

گر پشیماں تو پشیمانی سے

نالہ و آہ فغاں کچھ نہ رہا

رنج کا نام و نشاں کچھ نہ رہا

اب شب و روز مسرت کا خروش

انبساط و طرب و عیش کا جوش

یادوں میں ہنسنے کا غُل آٹھ پہر

وقت لب خندۂ گل آٹھ پہر

زمزمہ ساز برنگ بلبل

نغمۂ پرواز برنگ بلبل

نغمہ سنجی و خوش الحانی بس

شعر گوئی و غزل خوانی بس

رات دن ہنسنے ہنسانے کی بات

یاروں سے ملنے میں صرفِ اوقات

آشناؤں میں سدا گھر میں کہاں

گہہ وہاں گاہ وہاں گاہ وہاں

منقولہ بالا تمہیدی اشعار کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔عرض کرتے ہیں کہ ایک روز مومنؔ اپنے کسی دوست کے یہاں جارہے تھے۔راستے میں چاروں طرف کا نظارہ کرتے ہوئے ان کی نظر چاروں طرف بھٹک رہی تھی۔اچانک ان کی نظر کسی بالا خانے پر چلمن کے پیچھے کسی شوخ حسینہ سے ٹکرا جاتی ہے۔دونوں کی نظر جب ملتی ہے تو وہ مسکرادیتی ہے۔پہلے تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ ان کا وہم تھا۔پھر کہیں میری جان جوکھم میں نہ پھنس جائے۔پھر جبراً،قہراً قصد کیا اور اس شوخ حسینہ تک پہنچے،وہاں کا منظر ہی عجیب نکلا۔وہاں دور

عیش ونشاط گرم تھا۔اس شوق حسینہ کے لب سے مزاحیہ باتیں نکل رہی تھیں۔انہیں بھی یہ دیکھ کر لطف آنے لگا۔ ان کا دل جوافسردہ تھاشاد کام ہونے لگا۔اس طرح وہاں کا ماحول بھانے لگا۔لبوں پر مسکراہٹ آنے لگی۔وہاں دل بستگی کا سامان مہیا دیکھ کر اسے دل دے بیٹھے۔اس طرح روز وہاں آنا جانا شروع ہوگیا۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دن جاتے تھے یار کے پاس
یارو غمخوارو وفادار کے پاس
راہ میں طرفہ تماشا دیکھا
غرفہ وبام دل آرا دیکھا
آگے اس غُرفے کے چلمن ہے پڑی
پس چلمن کوئی عورت ہے کھڑی

محو نظارۂ رنگ بازار
ناگہاں ہوگئی وہ مجھ سے دوچار
کہ وہ چلمن کا ذرا تھا پردہ
گرچہ تھا پردہ پہ کیا تھا پردہ
ہوئے آپس میں نظارے کیا کیا
کئے ابرو سے اشارے کیا کیا
ترجماں چشم و نظر مطلب سے
کچھ تبسم بھی نمایاں لب سے
اور میں حیران و سراپا حیرت

کیا کہوں میں کہ مجھے کیا حیرت

کہ الٰہی یہ تماشا کیا ہے

گر سرِ خود ہے تو ڈر کس کا ہے

کیوں نہیں چلمن اٹھا دیتی ہے یہ

کیوں نہیں گھر میں بلا لیتی ہے یہ

اور جو تابع ہے تو کیوں باک نہیں

کیا سبب ہے کہ خطرناک نہیں

جی میں آیا کہ تجسس کیجئے

کسی ڈھب بھید یہاں کا لیجئے

پھر ڈرا میں کہ کچھ آفت تو نہ آئے

دل کے ہمراہ کہیں جان نہ جائے

ایک روز اتفاق سے مومنؔ وہاں تشریف فرماں تھے کہ اچانک کسی مہمان کے آنے کی خبر ملی۔ اس لئے پردہ کی خاطر وہ وہاں سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال آیا کہ ان کا وہاں رہنا شاید مناسب نہ ہو۔ اس کے بعد مومنؔ دوبارہ کچھ روز بعد جب تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ نو وارد مہمان خاتون بیمار ہے۔ بس کیا تھا یہ حکیم تھے ہی انہیں مریضہ کو دکھایا گیا۔ بس مومنؔ نے جو اس مریضہ کا نبض پکڑا خود اس کے عشق میں بیمار ہو گئے۔ نازنین مہمان نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مریضہ کا مومنؔ نے نبض کیا پکڑا۔ گویا ایک نیا حادثہ رونما ہو گیا۔ اس ہاتھ پکڑنے کو مومنؔ نے اس قدر بیان کیا ہے کہ اس تعلق سے غزلوں میں بھی کتنے اشعار کہہ دئے ہیں اس مثنوی کے درمیان میں بھی انہوں نے اس واقعہ کے ترجمان اشعار کہے ہیں۔ جو ایک مکمل غزل کی صورت میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کیا لگایا دست دل آرام سے ہاتھ

دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

کس کے ہاتھوں سے لگا تھا کہ جدا
نہیں ہوتا دل ناکام سے ہاتھ

پختہ مغزانِ جنوں سے ہوں میں
کیوں اٹھاؤں طمع خام سے ہاتھ

ہاتھ دیتے تو ہو اب ہاتھ میں پر
کان پر رکھئے گا پھر نام سے ہاتھ

دھوئے شبنم سے نہ ہوگا ہم رنگ
مہر کا دست گل اندام سے ہاتھ

کیا کہوں آہ بقولِ مومنؔ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

یہی وہ محبوبہ تھی جن کا نام امۃ الفاطمہ بہ متخلص صاحب جی بتایا جاتا ہے۔ اس طرح مومنؔ نے اسے اپنا محبوب بنالیا۔ دوسرے لوگ مومنؔ کو دیکھ کر مذاق اُڑانے لگے۔ خیرکسی طرح مومنؔ نے فضا ہموار کی اور وہاں کی محفل میں آنا جانا جاری رکھا۔ ایک روز تنہائی میں موقع پا کر اظہار عشق کر دیا۔ اس نے بھی اقرار عشق کیا۔ دونوں کے دلوں میں عشق کی آگ لگ چکی تھی۔ لیکن قدرت کو دونوں کا ملنا منظور نہ تھا۔ اس محبوب سے بوس و

کنار کی لذت مومن اٹھا نہ سکے۔ وصال کی کوئی صورت نہ نکلی تھی کہ اچانک کسی نے خبر دی کہ نازنین مہمان کے جانے کا حکم صادر ہو گیا ہے۔ مومن ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس موقع پر انہوں نے فرطِ غم میں جو اشعار کہے ملاحظہ فرمائیں۔

اِک جواں تھا بہ الم خو کردہ
شور وحشت کا نمک پروردہ
حکم بے ربط دہِ ملک جنوں
افسر داغ بسر چوں مجنوں
کیا کہا گر یہ کہا کچھ نہ کیا
نہ رہا مرتبہ اس کا نہ رہا
قیس کو اس سے بھلا کیا نسبت
ایک شاہ ایک گدا کیا نسبت
ذرّہ کو مہر سے کیا رتبہ ہے
کچھ بھی ذرّے کا بھلا رتبہ ہے
قیس اک طفلِ دبستانِ جنوں
اور وہ استاد زباندانِ جنوں
اس سے جب بزم غم آرائی ہو
عشق کو مرتبہ افزائی ہو
غم میں ایک جان اسی کے باعث
درد کو شان اسی کے باعث
فخر الفت کو اسی کے دم سے

یاس و غم و اندوہ خجالت
جاں شکنی کچھ نزع کی حالت
طور یہ ظاہر مرنے کے سارے
چار مہینے یوں ہی گزارے
کیسے مہینے عمر دو عالم
روز قیامت جس کا ہر اِک دم
بخت نے کیا کیا کچھ نہ کیا پھر
چرخ نے تازہ داغ دیا پھر
یعنی وہ رشکِ مہرِ درخشاں
آئی میرے دوست کے مہماں
اور یہ مجکو بھی خبر آئی
جان تمنا دوڑ کر آئی
مجکو بھی دل کی بات جو بھائی
محرم راز اک جلد بلائی
اس کو اسی دم اس جا بھیجا
حال دل اپنا کہلا بھیجا
سنتے ہی نام عاشق بے کس
کہنے لگے کس ناز سے بس بس
بار دگر یہ نام نہ لینا
رنج پیہم مجکو نہ دینا

ناز وحشت کو اسی کے دم سے

جب کسی صورت اس محبوب سے وہ مل نہ سکے تو آہ وفغاں کرتے کرتے اپنی جان دینے کا ارادہ کرلیا اور دوستوں سے یہ وصیت کردی کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو میرے محبوب کی گلی سے لے جانا تاکہ وہ بھی باخبر ہوجائے یہ وصیت کر کے وہ عاشق اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر تمام لوگ حیراں و پریشان رہ جاتے ہیں۔لوگ عاشق کی میت پر خوب آہ وبکا کرتے ہیں۔ پھر لاش لے کر جب معشوق کی گلی سے گزرتے ہیں تو یہ دیکھ کر وہ بھی افسوس کرتی ہے۔دل پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ بالاخانے سے گرجاتی ہے اور گرتے ہی مرجاتی ہے۔اس طرح سچی محبت تاثیر دکھاتی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہہ کے یہ کھینچی اِک آہ جاں سوز
جل گیا جوں دل ہنگامہ فروز
جان سینے سے گئی درد کے ساتھ
ہو گیا سرد دمِ سرد کے ساتھ
دیکھو نیرنگ محبت کا حال
اہل محفل ہوئے حیراں کمال
واہ اے عشق اسے جاں سے کھویا
بات کہنے میں جہاں سے کھویا
دوست داروں نے بُرا حال کیا
سارے یاروں نے بُرا حال کیا
کوئی سرگرم فغانِ جانسوز
نالہ ہنگامہ محشر افروز
کسی کے لب پہ میں مرجاتا کاش

کسی کے چہرے پہ ناخن کی خراش

کسی کی آہ کرے خوں باری
کسی کے چشم سے دریا جاری
آخر اس طرح بہ احوال خراب
لے چلے نعش اٹھا کر احباب
الغرض پہونچے جب اس شکل سے واں
جس جگہ تھا بت کافر کا مکاں
وہ گلی جس سے تماشا گہہ تھی
جلوہ گر غرفہ میں وہ ناگہہ تھی
دیکھ اس حال کو افسوس آیا
گر پڑی دل جو ذرا گھبرا یا
گرتے ہی مر گئی بس وہ دل گیر
جذب الفت نے دکھائی تاثیر

مومن کے محبوب پر مومن کی موت کا ایسا اثر تمام لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔لوگ اسے سچی محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔غرض زندگی میں دو محبت کرنے والے جب نہیں مل پاتے ہیں تو مرنے کے بعد دونوں ضرور ملیں گے۔اس طرح کے خیالات دل میں گھر کرتے ہیں۔یہ بات سوکوس تک پھیل جاتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح شیریں کے لئے فرہاد نے اپنی جان دی تھی۔اسی طرح ان کی محبت بھی ہے۔اس طرح لیلیٰ مجنوں کے قصے کی یاد بھی دہرائی جاتی ہے۔غرض لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد یا کوئی عاشق یا معشوق تمام کو محبت کی تاثیر قریب کھینچ لاتی ہے۔اور بالآخر بچھڑے ہوئے مل ہی جاتے ہیں۔اس طرح یہ مثنوی اپنے اختتام کو پہنچ

جاتی ہے۔

مومن خان مومن کی مثنوی ''تف آتشیں'' بھی ایک کامیاب مثنوی ہے۔اس مثنوی میں بھی موصوف نے اپنے عشق ومحبت کی کہانی درج کی ہے۔مثنوی کے ابتدائی حصے میں انہوں نے ایک بت طناز کے ہجر کا کرب بیان کیا ہے وہ محبوب کی جدائی میں بے چین ومضطرب نظر آتے ہیں عاشق مہجور کے متعلق لمبا چوڑا بیان درج کیا گیا ہے۔اس کام میں موصوف نے کل ۵۶/اشعار رقم کئے ہیں۔اس کے بعد دل کو بہلایا گیا ہے۔ہجر کی یاد سے چھوٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ رحم کی آس کب تک کریں۔اس غم کو کب تک ضبط کر کے رکھا جائے دل کی تسلی اور اس کیفیت سے باہر نکلنے کے سلسلے میں موصوف کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

تابہ کجا خاموش رہوں میں
حال دل اپنا کچھ نہ کہوں میں
رحم کی اس کے آس کہاں تک
راز نہاں کا پاس کہاں تک
ضبط کہاں تک جی پہ ہی ہے
صبر کہاں تک اپنے بھی جی ہے
جان کو کوئی کب تک کھودے
اب تو کہیں گے ہو وے سو ہو وے
رخصت نام و ننگ ہے اب تو
قافیہ اپنا تنگ ہے اب تو
اب تو کدورت دل کی نکالیں
خاک کہاں ہر بات یہ ڈالیں
اب تو لحاظ اس کا نہ کریں گے

شکوہ بے باکانہ کریں گے

کھولتے ہیں اب رازِ نہانی
شوخ بھی دیکھے شوخ بیانی
نالۂ جانکاہ آئے ہے لب تک
درد فزا آہ آئے ہے لب تک
قصہ عشق کا آغاز ہوا ہے
بسملہ مدّہ آہ رسا ہے
تازہ حدیث عاشق غم کش
شکوۂ جور و تاب ستم کش

اس طرح مومنؔ اپنے نئے عشق کا قصہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور اپنے دل کو ستم کش کہتے ہیں اور اپنے محبوب کو معشوق کو ستم گر نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی عاشق مزاجی کے تعلق سے تمام باتیں واضح کرتے ہیں اور خود کو ایک عاشق مزاج کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میرے شوق نہاں سے ساری دنیا واقف ہے۔ جہاں بھی دیکھو میرے عشق کا ہی چرچا ہوتا ہے اور میں بدنام زمانہ ہو کر ہی نام کما تا ہوں۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ اس کام میں مجھے بہت تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور ایسے میں جی کو اپنے فن یعنی شعر وسخن سے بہلاتا ہوں۔ وہ قصہ کا آغاز یہ کہتے ہوئے کرتے ہیں کہ۔

تازہ کھلا گل باغ طرب میں
ربط ہوا گل خندہ و لب میں
ہو گئی یاری دل سے خوشی کی
ٹھہری تبسم سے بھی ہنسی کی

تازہ گل کا کھلنا اور خوشی کی دل سے یاری ہونا یہ تمام باتیں اس وجہ سے ہوئی ہیں کیونکہ ان کے کسی دوست کے گھر میں شادی کی تقریب ہو رہی ہے اور اس تقریب میں وہ مہتمم کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھار ہے ہیں اور اس وجہ کر ان کا زنان خانہ میں بھی بے روک ٹوک آنا جانا ہو رہا ہے۔ اسی زنان خانے کی ایک خاتون کی آواز انہیں دیوانہ بنا دیتی ہے اور وہ اس آواز والی خاتون کو اپنا دل دے بیٹھتے ہیں۔ ان کی یہ ہمیشہ کی عادت رہی ہے کہ کوئی حسینہ ان سے ہنس کر بات کر لے تو وہ اسے اپنا دل پھینک کر دے دیتے ہیں۔ یعنی یہ ایک دل پھینک عاشق ہیں۔ اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شادی اٹھی اِک گھر میں شتابی
اس میں ہوئی یہ خانہ خرابی
تھی جو وہ جو بزمِ جان و دل آرا
میں بھی تھا وہاں محفل آرا
کارکن و مختار وہاں میں
مہتمم ہر کار وہاں میں
اندر باہر سوز فزائی
تھی متعدد بزم آرائی
سوئے ہر اِک اپنا گزر ہو
مجکو پکاریں کام جدھر ہو
اپنا گزر جوں صاحب خانہ
نادر رنگیں بزم زمانہ
پردے سے اک آواز خوش آئی
جس نے یہ چپ ہے مجکو لگائی

وصف کی اس کے تاب کہاں ہے
رنگِ بیاں کی لال زباں ہے
لفظ نہ تھے مربوط سدا سے
سوزِ ادا سے نطق ادا سے
کیا کہوں اس کی سحر بیانی
لفظ کئی اور لاکھ معانی
لفظ نہ تھے اک تازہ فسوں تھے
جس کے موکل عشق و جنوں تھے
چھیڑ کی باتیں جادوئے بابل
جس سے تمسخر ہو ہی گیا دل
گرچہ سخن کا ہوش کہاں تھا
ایک مجیب ناز و فغاں تھا
ہم سخنی پر طور دگرے
بات ادھر سے نالہ اُدھر سے
آہ نے کتنی تیز اثری کی
پردہ نشیں نے پردہ دری کی
چلمن اٹھاکے وہیں گرادی
ایک جھلک سی اپنی دکھا دی

اس طرح مومنؔ اپنے محبوب کی نامکمل جھلک دیکھ کر قرباں ہو جاتے ہیں اور جب تک یہ محفل تقریب رہتی ہے وہ تاک جھانک کرتے رہتے ہیں اور اس معشوقہ کی جھلک پانے کے متمنی نظر آتے ہیں لیکن ملاقات نہیں

ہوتی ہے۔ ہاں خواب میں ضرور اس معشوقہ کو دیکھتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ ملنے ملانے کی بات ہوتی ہے۔ روز ملتے بھی ہیں اور اگلے روز ملنے کا وعدہ بھی ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

سب کی نیند اس فکر میں جاوے
خواب میں بھی تا کوئی آوے
آمد و شد کیا ہووے فسانہ
رات کا آنا روز کا جانا
جی کی تباہی کہیے کہاں تک
صبر آوے قید یہاں تک
خیر پھر اب اے جان ملیں گے
جیتے رہے تو آن ملیں گے
یاں ہی گر آئیں گے اب کی
تم سے بھی ہم ملیں گے اب کی
وہ تو گئے یہ کہہ کر اُدھر کو
تا قلق آیا دیکھنے گھر کو

اس طرح مومنؔ کی حسرت دل میں رہ گئی۔ ان کی تمنا بر نہ آئی آخر کار سب لوگ اپنے اپنے گھر کو واپس چلے گئے۔ مومنؔ لاکھ کوششوں کے بعد بھی ملنے کی صورت نہ نکال سکے۔ وہ اداس و رنجیدہ رہ گئے۔ آخر کار وہ خوش آواز اپنے گھر کو لوٹ گئی۔ سارے خواب ادھورے ہی ہے۔ مومنؔ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ چار مہینے اسی طرح جدائی میں گزارنے پڑے پھر مومنؔ کو خبر ملی کہ وہی خوش آواز محبوبہ ان کے دوست کے یہاں مہمان ہوئی ہے۔ انہوں نے کسی عورت کے ذریعہ پیغام و سلام کا راستہ نکالنا چاہا لیکن جواب منفی ملا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کیا رہی ہے ہم کو تیری احتیاج

ان تمام اشعار میں صرف ہائے ہو، ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔صرف چوتھی مثنوی کے قصے کو انجام تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔اور پانچویں مثنوی چوتھی مثنوی سے ہی مربوط ہے غرض چوتھی مثنوی کو ہی لمبا کیا گیا ہے۔اور محبوب کی بے التفاتی پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔اور اپنی طرف سے بھی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

دردِ دل کا چارہ یاس انگیز ہے
نرگسِ بیمار کو پرہیز ہے
ہائے ہو یوسف لباس بے تمیز
بوئے پیراہن رکھے مجھ سے عزیز
کچھ نہیں کھلتی ہے وجہ احتراز
پاکدامن وہ ہے تو میں پاکباز
ایسے عاشق سے حذر بے فائدہ
پاس عصمت اس قدر بے فائدہ
کیا ہے آخر فتویٰ اہلِ جمال
گر نہیں معشوق عاشق پر جلال
مفتیانِ عشق لکھتے ہیں تمام
بو الہواس شوہر بھی ہو تو ہے حرام
ہیں براہین و دلائل بے جواب
لیکن اس سے کہہ سکے یہ کس کی تاب

اس طرح مومنؔ اپنی صفائی بھی بیان کرتے ہیں اور محبوب کی طرف سے بے توجہی کی

پھر نہ سوالِ وصل کرے وہ
پھر نہ خیال وصل کرے وہ
اب نہ ملوں گی یاد رہے یہ
نام نہ لوں گی یاد رہے یہ

یہاں بھی مومنؔ کو نامرادی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ وہ کسی صورت ان کا نام تک سننا پسند نہیں کرتی ہے۔ اس طرح یہ دل لگانے کی کہانی بغیر کسی وصال کے ختم ہو جاتی ہے اور مومنؔ کی یہ ایک طرفہ محبت کامیاب نہیں ہوتی ہے۔ اس کے بعد مومنؔ حکایت کا عنوان لگا کر اپنے اضطراب دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اس حال دل کی کیفیت کے اظہار میں ستّر اشعار صفحہ قرطاس پر درج ہو جاتے ہیں۔ اس طرح چوتھی مثنوی میں کوئی دل پذیر واقعات رونما نہیں ہوتے ہیں۔ اس کہانی میں کوئی دلچسپ واقعہ بھی گرفت میں نہیں آتا ہے۔ صرف حدیث دل کی ترجمانی مومنؔ نے اپنے انداز میں پیش کر کے تاثر قائم کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اس کے بعد مومنؔ کی پانچویں مثنوی شروع ہو جاتی ہے۔ پانچویں مثنوی کے ابتدائیہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ساقیا اب نازِ بیجا کس لئے
چین ابرو بے محابا کس لئے
تند خوئی باعث آزار ہے
زہر قاتل تلخئی گفتار ہے
بے مزہ ہے شکر افشانی تری
بے نمک ہے سر کہ پیشانی تری
اے تنک ظرف اس قدر بد خو نہ ہو
دل ہو کھٹا ترش ابرو نہ ہو
بے نیازی کا سبب اے بد مزاج

شکایت کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ اگر وہ پاک دامن ہے تو میں بھی پاکباز ہوں پھر مجھ سے ملنے میں احتراز کیسا ہے۔اس قدر عصمت کا خیال بے جا ہے۔محبت میں عاشق معشوق کا ملنا اصل دستور ہے۔ اور خود اس تعلق سے حل نکل آنے کی توقع بھی بے سود سمجھتے ہیں۔لیکن قسمت کو ان پر ترس آجاتا ہے۔ وہ خوش آواز محبوبہ خود ہی کسی قاصد کو بھیج کر رجوع کی خواہش ظاہر کرتی ہے اور ملاقات کی صورت پیدا کرتی ہے۔اس طرح مومنؔ کا سامنا اپنے محبوب سے آخر کار ہو ہی جاتا ہے۔لیکن جب سامنا ہوتا ہے تو کہانی کا یکایک رخ بدل جاتا ہے۔مومنؔ تو صرف آواز پر ہی اپنا دل دے بیٹھتے تھے لیکن جب صورت دیکھتے ہیں تو حیران و پریشان رہ جاتے ہیں۔صورت ایسی کہ نظر چھپ لینے کو دل چاہے۔جس کے تمام اعضاء کا بھی ذکر مومنؔ نے کیا ہے اور جس قدر ان اعضاء کی برائی ہو سکتی ہے بیان کی ہے۔اس کام میں تشبیہات کا انہوں بے دریغ استعمال کیا ہے۔مثنوی کے اس حصے میں کوئی لطف نہیں ہے بلکہ موصوف ابتذال و بد مذاقی کی حد تک چلے گئے ہیں۔اس طرح انہوں نے ایک بدصورت عورت کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

پاس سے دیکھا تو بس دیکھا نہ جائے
بہر نگاہ منفعل آنکھیں چرائے

غم سے جی چشم غلط بیں کا جلا
چشم بد دور ایک رشکِ صد بلا

دل ہوا سرد اختلاط گرم سے
بجھ گیا جی جوش آب شرم سے

لاف الفت کی ندامت ہائے ہائے
آپ اپنے پر قیامت ہائے ہائے

ابروئے بے مو سے ظاہر جلدیوں

زنگ خوردہ جیسے تیغ سیمگوں

یا نیام مخمل فرسودہ خواب
یا شکستہ کہنہ محراب خراب
شوخی مژگاں خرام نا شکیب
نرگس بیمار مرنے کے قریب
یوں سفیدی میں سیاہی کم نما
جو بیاض صبح صادق میں سہا
ہر نگاہ تیز تیغ بے اثر
غیرت تیر ہوائی ہر نظر
خانہ چشم ایک صحرائے خراب
آنکھ کے ڈھیلے کلوخ خودہ آب
گوشۂ چشم فسوں فتنہ گر
وہ مثلث جس کا ویرانی اثر
کان گل تھے لیک مرجھائے ہوئے
فضل بہمن کی ہوا کھائے ہوئے
لالہ پژمردہ وہ رنگین عذار
داغ چیچک داغ رشک نو بہار
ناک و مقراض قطع آرزو
منفعل تشبیہ سے زنبق کی بو

بو الہواس کا بوسہ لینا قہر تھا
وہ لب شیریں کا میٹھا زہر تھا

اس طرح موصوف نے ایک ایک عضو کی برائی میں زمین آسمان ایک کر دئے ہیں۔ اس بدصورت عورت سے بھی وہ اختلاط قائم کرتے ہیں اور اس کے بعد اس سے انہیں نفرت ہو جاتی ہے۔ جو بالکل عجیب سی بات ہے۔ کہ اتنی بدصورت تھی تو اس کے ساتھ اختلاط کیوں کیا اس کی آواز انہیں کبھی دیوانہ کر دیتی تھی آج اس کی آواز انہیں سننا بھی گوارہ نہیں۔ بہر کیف اسکے بعد مومن پھر ایک نئے شکار کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک نئ مچھلی بھانستے ہیں۔ اس کے ساتھ خوب مزے کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کی خبر جب اس بدصورت عورت، کو ہوتی ہے تب وہ بدصورت عورت مومن کی اس نئ محبوبہ سے جا کر ملتی ہے اور ان کی ساری ہوس نا کی کا قصہ سنا دیتی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ خوبصورت حسینہ بھی ان سے دوری بنا لیتی ہے۔ اس طرح ان کے اس معاشقے کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ اس مثنوی کے اختتامیہ اشعار جس میں دونوں کے درمیان آخری جو گفتگو ہوتی ہے۔ اور مومن کس طرح اس مثنوی کا خاتمہ کرتے ہیں۔ اور آگے پھر اللہ کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکلے گا۔ غرض انہیں کوئی دوسرا محبوب ملے گا۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بات بگڑی سب بگڑنے سے ترے
بن گئی بے ڈھب بگڑنے سے ترے

تیرے غصے سے غضب آیا غضب
دم رکے ہے تیرے رکنے کے سبب

کون سی تقصیر کی حیراں ہوں
کیا کہا بد گو نے میں بھی تو سنوں

جو ہے بہتاں کا سبب معلوم ہے
حال میرا اس کا سب معلوم ہے

ہے خبر آخر تمہیں ہر راز کی
بات کیا اس شعبدہ پرداز کی

یہ نہیں جو کچھ کہا مت مانیئے
مدعی کا قول باطل جانئے

لائقِ جور و جفا ہے وہ زمیں
مفتری فتنہ بلا ہے وہ زمیں

آؤ مل جائیں کہ دم ہے ناک میں
اس کدورت کو ملائیں خاک میں

اس ستم گر کو ستائیں خوب سا
ہنس کے آپس میں رلائیں خوب سا

گرمیٔ صحبت ہو اس کے رو برو
گاہ میں اس کو جلاؤں گاہ تو

شاعر کے تمام کلام معیاری نہیں ہوتے ۔ اس لحاظ سے مومنؔ کی اگر توبہ قبول ہوگئی تو وہ صرف ایک مثنوی جہادیہ کی بدولت وہ تمام مرتبہ پا سکتے ہیں ۔مثنوی جہادیہ کی ابتداء کس قدر پاکیزہ افکار سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

پلا مجکو ساقی شراب طہور
کہ اعضا شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا
کہ آجائے بس نشہ اسلام کا

برنگ مے ایماں کو آجائے جوش
نہ اپنا رہے نہ دنیا کا ہوش

عنادِ نہفتہ کو ظاہر کروں
دمِ تیغ سے قتل کافر کروں

بے تشنہ کامی سبو در سبو
پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو

مومنؔ کا جذبہ دیں اپنے پاکیزہ خیالات سے مزین و آراستہ ہے۔ انہیں اللہ کی راہ میں خود کو قربان کر جانے کا جذبہ تحریک دے رہا ہے۔ ایمان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ دین اسلام کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھے یا اس پر کوئی حرف آئے تو ایمان والے کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اس کا دفع کرے اور اس راہ

سنگ دل ہیں ان کو کیوں کر آئے رحم
کس پر آیا ہے کہ تجھ پر آئے رحم

مدعا بے دیں دعا سے چاہئے
چاہئے جو کچھ خدا سے چاہئے

ضبطِ آہ و نالہ و فریاد کر
بھول جا سب کچھ خدا کو یاد کر

پھر تماشائے نیاز و ناز دیکھ
انتقامِ تفرقہ پرداز دیکھ

رحم کن بر حال زارِ خویشتن
با خدا بسیار کارِ خویشتن

''آہ وزاری مظلوم'' مومنؔ چھٹی مثنوی ہے۔اس مثنوی کا آغاز موصوف نے دعائیہ انداز میں کیا ہے۔اور اللہ سے اپنے تمام مسائل وآلام کے حل کرنے اور حدیث دل کی کیفیت کو خوشگوار کرنے کی دعا کی ہے اور گذشتہ تمام محبوباؤں کی یاد سے چھٹکارا پانے میں مدد طلب کی ہے۔گویا خدا کو بھی اپنے حق میں اور اپنے مقصد میں مدد کرنے کا رویہ اختیار کیا ہے۔جس سے ان کی آئندہ عشق ومحبت پروان چڑھ سکے جو بالکل ایک عجیب سی بات ہے۔دعا کے تعلق سے عجیب سی تشکیک والی کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔جو بظاہر ان کا ایک نیا پینترا معلوم ہوتا ہے۔اس مثنوی کے ابتدائی

تیرے بندے پہ بیداد صنم ہے
نہیں زنہار شایانِ غیوری
غرور اس بت کا میری ناصبوری
جلالِ غنچہ پرور جوش میں آئے
تلافی کچھ میری خواری کی ہوجائے
یہ دن دکھائے ہاں قدرت نمائی
کہ صبح وصل ہو شامِ جدائی
کریں تزئین تو تشریف اسلام
دل و جاں سے ہو وہ زیبا صنم رام
نکالے عرض ایماں مطلب اپنا
کروں آخر اسے ہم مذہب اپنا
پڑھے کلمہ مرا وہ نا مسلماں
مبارکباد دیں کیا کیا مسلماں

اس طرح مومن کی سوچ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ عشق بازی میں خدا کو بھی شریک مدد کرلیتے ہیں اور اپنے مقصد براری کو ہر قیمت میں حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جوان کی نہایت گھٹیا سوچ ہے۔ اس کے بعد پھر آغاز داستان ہوتا ہے دراصل اس مثنوی کا سارا قصہ اپنے محبوب سے غائبانہ باتیں کرنے پر مشتمل ہے۔ اس عشقیہ قصہ میں جب محبوبہ کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ کیا دیکھتی ہے کہ یہ ساری باتیں جو اس کے اور محبوب کے درمیان ہورہی تھیں وہ خواب میں ہورہی تھیں۔ ان باتوں کا اس محبوبہ پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عاشق کی خبر لینے نکل پڑتی ہے۔ اور جب اس کے گھر کی طرف جاتی ہے اور وہاں جاکر اپنے عاشق کے متعلق دریافت کرتی ہے تو لوگ حیرت کی نظر سے اسے دیکھتے

خیالِ باطل اور اتنی درستی

اسی حالت میں گزرے جب کئی سال

کہ تھے مثلِ زماں تغیر احوال

زبس مطلوب نازش تھا طلب گار

بنی سو خود فروشی پر خریدار

نہ آیا صبر بے دیدارِ مشتاق

نہ ٹھہری جان و طاقت ہوگئی طاق

کی آخر مشورت اِک ہم نشیں سے

کہ اٹھتا ہے دھواں جان حزیں سے

جلایا شوق وصل تفتہ جاں نے

کیا خاک آتشِ سوزِ نہاں نے

انہیں فکروں میں سر گرداں ہوں دن رات

کہ اس وحشی سے کیونکر ہو ملاقات

ذرا دیکھوں تو کیا ہے اس کی صورت

نہ کر دے خاک تاثیر کدورت

اس طرح جومحبوبہ نے اپنے ایک راز دار سے مشورہ کیا اور اس دیوانہ کی تمام باتیں بتائیں تو اس راز دار دوست نے اسے جومشورہ دیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کہا اس نے کہ اے سرمایۂ ناز

فدا تیرے ستم پر سب کے انداز

بلا تیری مرے اندوہ و غم میں

پریشاں گفتگو کرنے کو باہم

یہ فکرِ باطل آشفتہ سری کی

بلا لائی ہوئی ہے کس پری کی

سنی جب اُڑتے اُڑتے یہ حکایت

ہوئی وہ سادہ رو حیراں نہایت

کہ میرا جلوہ دیکھا کیونکر اس نے

کہاں سے سینک لی چشم تر اس نے

ہوا بے پردہ کب حسنِ نقابی

کہاں ایسی جفا پر بے حجابی

زبس تھا اعتمادِ دلبر بائی

نہ سمجھی تہمت آشفتہ رائی

یقیں جانا کہ سن کر میرے انداز

ہوا ہوگا شہیدِ خنجر ناز

قصب لذت اٹھانے کا بندھا دھیان

کھڑے ہونے لگے ہر بات پر کان

بڑھے جانکا ہی روزِ نہانی

جتائے روز عجز نا توانی

شکستِ رنگ نقش روئے سادہ

نزاکت لحظہ لحظہ ہو زیادہ

رہی آخر نہ چالاکی نہ چستی

ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو تمہارے عشق میں اس قدر دیوانہ ہو گیا تھا کہ کل اپنے گھر آیا اور آخر اپنی نا کامئی محبت کی وجہ سے جان بحق ہو گیا۔ وہ تو تم سے غائبانہ محبت کرتا تھا۔ تمہیں اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ تمہاری محبت میں اپنا ہوش وحواس گنوا چکا تھا۔ یہ سن کر وہ محبوبہ بھی عاشق کی قبر پر چلی جاتی ہے۔ اور یہاں ایک مافوق الفطرت واقعہ رونما ہوتا ہے کہ قبر شق ہو جاتی ہے۔ یعنی قبر میں شگاف پر جاتے ہیں وہ اندر داخل ہو کر لاش کو گلے سے لگا لیتی ہے۔ اس طرح مثنوی ختم ہو جاتی ہے اور مومنؔ کی مثنوی میں محبوبہ زندہ رہتی ہے۔ اور عاشق جاں بحق ہو جاتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ قصہ کے ابتداء سے اختتام تک کے متفرق اشعار نقل کر دیئے جائیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کہ تھا اس شہر میں اِک خانہ ویراں
جنوں تعلیم فرمائے اسیراں

جواں سال و کہن پیر محبت
سراپا اس کا تصویر محبت

عیاں صورت سے دل کی شعلہ باری
ہیولیٰ میں زیادہ جزو ناری

جو دیکھے اس کی فطرت کے تب و تاب
کہے اپنے کو آپ ابلیس کذّاب

نہ چھوڑے دل لگانے کی تمنا
قیامت ناز اٹھانے کی تمنا

احبا کو شکایت بلکہ سو بیر
کہ ہم کو جانتا ہے بدگماں غیر

ہوئے اِک روز آخر سب فراہم

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

الٰہی نالۂ اخگر فشاں دے

فغانِ شعلہ ریز و خونچکاں دے

عنایت کر مجھے آتش زبانی

کہ لب تک لا سکوں سوز نہانی

دے اتنی گرمی طرز تکلم

کہ ہو عرق عرق برقِ تبسم

اگر لافِ ورع ہو درد و پندار

بناوے وہ رگِ گردن کو زنار

وفور خود پرستی چشم بددور

شیوع بت پرستی دل سے منظور

بہم ربطِ رقیباں کا خیالات

رواجِ شرک میں مصروف دن رات

وہ بت دیتا ہے طعنہ کس ادا سے

کہ اب تم چاہتے ہو کیا خدا سے

گزر اس گھر میں جو ہے رشک جنت

ملا معشوق مجھ سا حور طلعت

غلط جلوہ ہے میرا شعلہ طور

جہنم میں گئی ہے بلا کی حور

ہوا رحمت کو کیا کہہ کیا ستم ہے

مومنؔ اتنی بے قراری کس لئے
جوش مایو سا نہ زاری کس لیئے

نا اُمیدی اس قدر کس واسطے
شیونِ شام و سحر کس واسطے

آییۂ لا تقنتو تو ہو گی یاد
قول حق پر کیوں نہیں ہے اعتماد

ساتھ دل کے کھو دیا کیا دین بھی
نذر اُس بت کے کیا کیا دین بھی

رحمت حق سے ہے کیوں مایوس تو
کافر ایسا ہوگیا افسوس تو

نالہائے نارسا سے فائدہ
ان تبوں کی التجا سے فائدہ

جو سنا ہے وہ نہیں آتا یقیں
گرچہ ہوں بے ہوش پر اتنا نہیں

میں کہاں افسوس کہا کس کی مجال
انتقام چشم جادو کا خیال

ابتدا سے منکر تسخیر ہوں
عاملِ افغان بے تاثیر ہوں

تاب و طاقت اپنی روزِ عشق ہے
گر عزیمت ہے تو سوزِ عشق ہے

جو کیا تھا وہ الٹ جاتا ہے اگر
جان دیتے تم مرے ہر بات پر

جس فسوں گرنے کیا ہے یہ فساد
سمجھو اس کی بات کا کیا اعتماد

کہ وہ کیا میں پری کو لاؤں دم میں

نکال اپنی ہوس ہائے نہانی

تیرے قربان عیش جاودانی

ذرا دھر کان حرفِ دل نشیں پر

کہ کر بیداد جانِ نازنیں پر

کہاں تک دور بنی ہے کہاں تو

بلا لے شوق سے اس کو یہاں تو

وہ گو بدنام ہے پر چھپ کے آنا

کوئی گر جان لے تو میں نے جانا

مرے کہنے پہ چل مت ہاتھ سے جا

نکالے پاؤں کیوں اندازِ بے جا

ہنر مندی رہے تو کیوں کھلے عیب

کہ وہ ستّار ہے جو عالم الغیب

اس طرح مومنؔ کو بلایا جاتا ہے اور اس کام کے لئے وہی راز دار قاصد کی صورت میں مومنؔ تک جاتی ہے اور اسی محبوبہ کے گھر تک آنے کی دعوت دیتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وہ مجنوں جو نیا پیدا ہوا ہے

مجھی پر کہتے ہیں شیدا ہوا ہے

ذرا تکلیف کر اس نوجواں تک

کسی ڈھب سے اسے لے آ یہاں تک

کہ منع محشر آرائی کروں میں

کہ تھا گستاخ شوقِ ہمکناری

ہوا بے ہوش چھاتی سے لگا کر

بنا تصویر جانِ تازہ پا کر

کہا اے درد مند چشم بیمار

ترا درماں ہے عیسیٰ سے بھی دشوار

کہ وہ سرکش ہے جس کا تو ہے پامال

نہیں سنتی کسی دل خستہ کا حال

عداوت ذکر سے عشاق کے ہے

تنفّر نام سے مشتاق کے ہے

یہ ساری باتیں خوابوں خیالوں میں ہو رہی تھیں۔ جب آنکھ کھلی تو ساری بات سمجھ میں آئی۔ اس طرح وہ اپنے رویے پر بہت شرمندہ ہوئی اور دل ہی دل میں بے چین ہونے لگی اور اس کے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ آخر ماجرہ کیا ہے چل کر دیکھا جائے۔ اس طرح وہ محبوبہ عاشق صادق کے گھر تک اور پھر قبر تک پہنچتی ہے۔

اب اس تعلق سے آخری حصے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہ بس اب تو نہیں کچھ بد گمانی

یقیں آئی وفا و جانفشانی

سحر چونکی جو دلِ بیتاب دیکھا

بس آنکھیں کھل گئیں وہ خواب دیکھا

چلے آتے تھے آنسو چشم تر میں

کہ وہ ہے ماجرہ شب کا نظر میں

اور پھر گھر پہنچتی ہے اور قبر تک جاتی ہے۔ اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

علاج درد رسوائی کروں میں

مرے کہنے کو شاید مان جائے

عبث ہے جان فشانی جان جائے

غرض یہ دل نشیں فتنہ اٹھا یا

کہ اس خود رفتہ کو مہماں بلایا

نیا ڈھب اور سوجھا امتحاں کا

کہ سر خط ہے ضمیرِ نکتہ داں کا

وہ جس دم آکے بیٹھا اس مکاں میں

نہ تھی تاب سکوں تاب و تواں میں

غضب ہے اس بلا کا کیا ٹھکانا

پری خانہ میں دیوانے کا آنا

تظلم فرق معنی کے سبب تھا

لباس کاغذی بے وجہ کب تھا

وہ صورت دیکھتے ہی اُڑ گیا رنگ

دکھا یا جوش وحشت نے نیا رنگ

عیاں رخ سے ہوئی دل کی کدورت

تغیر رنگ نے کردی یہ صورت

نہ ٹھہرا دل ذرا کتنا سنبھالا

ہوا بے تاب تر جتنا سنبھالا

ادب سے اٹھ کے وہ تصویر اتاری

کہا دل میں جو سن کر اس نے افسوس

کہ ایسا عاشق اور مرجائے مایوس

چلی تربت پہ اس کی جذب دل سے

چلے کیا پیش دردِ جاں گسل سے

کسی حیلہ سے اس کو بھی لیا ساتھ

کہ ساتھ آئے تو جانے کیا کیا ساتھ

ہوئی جب شمع تربت وہ دل افروز

کہا یہ کھینچ کر اِک آہ جاں سوز

کہ مجھ بن کس طرح آرام آیا

یہ کیا خواب عدم میں چین آیا

لپٹ کر گور سے رونے لگی بس

وہ خاک تفتہ دل ہونے لگی بس

طپاں ایسا دل مشتاق بے صبر

کہ شق اس زلزلہ سے ہو گئی قبر

گلے سے لگ کے اس آرام جاں کے

نکالے حوصلہ جانِ طپاں کے

یہ مرنا کاہے کو جینے سے کم ہے

کہ خواب تازہ پہ خواب عدم ہے

اس کے بعد اس مثنوی کا خاتمہ کرنے میں موصوف نے ۳۵/ اشعار اپنے متعلق مختلف موضوعات پر رقم کر دیے ہیں۔

مثنوی جہادیہ بھی مومنؔ کی ایک کامیاب مثنوی ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے مذہب و عقیدہ کے موافق افکار وخیالات کی ترجمانی پیش کی ہے۔ مومنؔ کا تعلق وہابی تحریک سے گہرا رہا ہے۔ اسی لئے انہیں سیّد احمد بریلوی، جو شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ ان سے مومنؔ کی گہری وابستگی تھی۔ ان سے وہ بیعت تھے۔ ان بزرگوں کی صحبت انہیں حاصل تھی اس جہادیہ مثنوی میں موصوف کا رنگ و آہنگ مختلف ہے اور اس میں مذہبی افکار وخیالات کی ترجمانی نہایت سلیقہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ مثنوی بھی موصوف کی بہترین مثنوی میں شمار کی جاتی ہے۔ مومنؔ نے اپنی آخری عمر میں تمام بُری باتوں سے توبہ کر لی تھی اور روزہ نماز کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔

مومنؔ ایک مثنوی کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ ناتمام مثنوی ہے۔ جس مثنوی کی ابتدا حمد پاک سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس مثنوی میں نعت پاک بھی ہے۔ بعد میں وصال محبوب کی دعا اور تمنا۔ اس لئے عبادت بریلوی اور دیگر نقاد کا قیاس ہے کہ اس مثنوی کے دونوں اجزاء کو ملا کر ایک مثنوی مکمل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک بیان ملاحظہ فرمائیں :

> ''اسی طرح یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ مومنؔ نے ایک مثنوی محض حمد کے لئے لکھی ہوگی۔ دونوں اجزاء کو ملا لیا جائے تو ۳۰۸ اشعار کی ایک مسلسل اور مکمل مثنوی بن جاتی ہے۔ جس میں ابتداء میں نعت اور پھر مناجات عاشقانہ ہے۔ یہ مثنوی باقاعدہ مقطع پر ختم ہوتی ہے۔ جب مومنؔ نے نام نہاد تمام مثنوی کے بعد دوسری مثنویاں لکھیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس مثنوی کو ناتمام چھوڑتے۔ دراصل دونوں اجزاء ایک ہی مثنوی کے ہیں۔ اہل مطبع کو غلط فہمی ہوئی اور ہمارے اکثر نقاد غور کئے بغیر ان کی تائید کرتے رہے۔
> حال میں داکٹر عبادت بریلوی نے کلیاتِ مومنؔ مرتب کر کے شائع کی تو اسے ایک مکمل مثنوی مان کر بقیہ مثنوی کے عنوان سے درج کیا۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں، مصنفہ ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۴۱۴)

مومن نے جتنی بھی مثنویاں کہی ہیں تمام مواد کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ فکری اعتبار سے یہ مثنویاں قابلِ قدر ہیں۔ ان مثنویوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمان ہیں۔ بس اسی نقطہ نظر سے ان مثنویوں کو امتیاز وانفراد حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مومن کی مثنویوں میں ان کی غزلوں کی طرح تغزل بدرجہ اتم موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ مومن کی مثنویوں میں ان کی شخصیت بے نقاب ہوئی ہے۔ اورانہوں نے اپنی مثنویوں کو خودنوشت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی مثنویاں اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کیونکہ ان میں اس عہد کی مثنویوں کی طرح ماورائے فطرت قصے اور کہانیاں نہیں ہیں، نہ ان میں مافوق الفطرت کردار پیش گئے ہیں۔ نہ ان میں جادو، ٹونا والے واقعات ہیں۔ عرض ان کی مثنویوں میں طلسمات کی کہانیاں بھی نہیں ہیں۔ ان مثنویوں میں اخلاقی قدروں کا فقدان ضرور ہے۔ اس سلسلے میں مولوی امداد امام اثر کی رائے ملاحظہ فرمائیں :

''ان (مومن) کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ جو خس برابر بھی مفید معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فائدہ عقبیٰ مرتب ہو۔ اکثر مضامین عشقیہ ہیں مگر وہ بھی ایسے ہیں۔ جن سے یا کوچہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسے ہیں کہ سوانو جوانانِ غیر مقید کے ان کا گزر کسی اور کے دماغ میں ہو ہی نہیں سکتا۔ المختصر فقیر کی دانست میں مومن خاں کی کوئی مثنوی مفیدِ بنی آدم نظر نہیں آتی ہے۔''

(کاشف الحقائق، جلد دوم: امداد امام اثر، ص ۳۳۳)

بہر کیف اخلاقی نقطہ نظر سے مومن کی مثنویاں کم درجہ رکھتی ہیں لیکن بقول اثر عقبیٰ کے اعتبار سے مومن کی مثنوی جہادیہ پیش کی جاسکتی ہے۔ جسے امداد امام اثر نے شاید نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔ مومن کی مثنوی جہادیہ کو چھوڑ کر تمام مثنویاں بے کار، بے فیض سہی لیکن ایک مثنوی جہادیہ ہی اگر دین ودنیا میں قبولیت حاصل کرلے تو دین ودنیا دونوں ان کی سنور سکتی ہے۔ اور کسی

حبیب ہیں اور اس سلسلے سے ان سے خدا بھی راضی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک
کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لا شریک

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیب حبیب خدا وند ہے
خدا وند اس سے رضامند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز
نہ جاں آفریں سے کرو جان عزیز

کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر
کہ آجانے بیٹھے ہوئے اپنے گھر

تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے

سر امتحانِ رسول خدا

نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف
علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف

رہے حشر تک زندہ و نیک ذات
ہے کفار کی موت اس کی حیات

خدائے مجاہد بنایا اسے
سر قتل کفار آیا اسے

دم اس دست بازو پہ دیوے اجل
لب تیغ کے بوسے لیوے اجل

مومنؔ نے اپنے پیر و مرشد سید احمد کی شہادت کو علیؓ، حسینؓ و حسنؓ کی شہادت کے زمرے میں رکھا ہے۔ ان کی شخصیت دین اسلام کے لئے معتبر سمجھی جاتی ہے۔ اللہ والوں میں ان کا رتبہ بلند گردانا جاتا ہے۔ ان کی شہادت در اصل ان کے عمرو جاداں ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح موصوف نے ان کی مجاہدانہ شخصیت کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اور اس جماعت میں خود کے بھی شامل ہونے پر بھی فخر کا احساس کیا ہے۔ اور انہیں یقین ہے کہ اللہ کی رحمت ایسے لوگوں پر برستی ہے۔ اور ان کے وسیلے سے ان گروہ میں شامل تمام لوگ اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے تمام اہلِ ایمان سے یہ تلقین کی ہے کہ ان کے شریک مجمع ہوجائیں اور خدا کے سپاہی میں اپنا شمار کرلیں اور اللہ کی راہ میں قربانی کا جذبہ پیدا کریں۔ اس لئے کہ سید احمد کی ذات بابرکات خدا کے محبوب رسول اکرم کے وہ

میں اگراس کی جان بھی چلی جائے تو کوئی افسوس کی بات نہیں بلکہ فخر کی بات ہے کہ مذہب کی سلامتی اور اس کے فروغ میں وہ کام آیا۔اس سلسلے میں وہ اپنے رہنما اور پیشوا کے حوالے سے کامیابی کی منزل طے کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔اس سلسلے کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

بہت کوشش و جاں نثاری کروں
کہ شرع پیمبرؐ کو جاری کروں

دکھا دوں بس انجام الحاد کا
نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

نہ کیونکر ہوں اس کامیں ناشکیب
ظہور امام زماں ہے قریب

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا
جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

وہ نور مجسم وہ ظلِ الٰہ
کہ سایہ سے جس کے خجل مہر و ماہ

پھر موصوف نے اپنے پیرومرشد سید احمد کی شہادت کا ذکر بھی کیا ہے۔اور ان کی قربانی کو خدا کے دربار میں قبول ہونے کی بات کہی ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

زہے سید احمد قبول خدا

تنِ خستہ سے جاں کو جانے نہ دے

تو بہتر یہی ہے کہ جاں کام آئے
پسِ مرگ تربت میں آرام پائے

قیامت کو اٹھو تم با مراد
لب الحمد گو اور دل شاد شاد

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیات ابد ہے اس دم مرو

جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم
سزا وار گردن فرازی ہو تم

اس طرح موصوف نے اللہ کی راہ میں خود کو قربان ہونے کی تبلیغ کی ہے اور سمجھایا ہے کہ موت تو ہر انسان کو آتی ہے بہتر ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں قربان ہو جاؤ تو مرنے کے بعد بھی عیش و آرام کی زندگی میسر ہو جائے اور تمہیں حیات ابدی مل جائے اور اگر زندہ رہ گئے تو بھی تمہاری جیت ہے زندگی پھر تم غازی کہلاؤ گے اور روز قیامت تمہیں اسی وجہ سے سرفرازی بھی حاصل ہو جائے گی۔ الغرض موصوف نے اس مثنوی میں تمام پاکیزہ خیالات کی ترویج و اشاعت کی ہے اور دین اسلام پر مر مٹنے کی تمنا ظاہر کی ہے۔ جو ہر اعتبار سے لائق تحسین و افتخار ہے۔ ایمان والوں کے لئے یہ نہایت مبارک موقع ہے جو حق پر قربان ہو جائیں۔ اس مثنوی میں مومنؔ کا ایمانی جذبہ اپنے عروج پر ہے۔ اور وہ ایک صوفی

محاکمہ

گذشتہ تمام ابواب کے تجزیے سے یہ واضح ہے کہ مومنؔ غزل گوشعرا میں امتیاز و انفراد حاصل کر چکے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی غزل گوئی کلاسیکی غزل گوئی کی روایت کی پاسدار بھی ہے اور تجدیدی نقطۂ نظر کی حامل بھی ہے۔ اس سلسلے میں پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں امیر خسرو سے لیکر موصوف کے ہم عصر شعرا غالبؔ وغیرہ تمام شعرا کے کلام پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور کلاسیکی ادب کی جملہ خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام اوصاف کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ کلاسیکی غزل گوشاعروں میں امیر خسرو، حسن شوقی، قلی قطب شاہ، غواصی، عالی عادل شاہ، نصرتی، احمد گجراتی، سید میراں، خان ہاشمی، ملا خیالی، فیروز، محمود، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میرؔ، میر دردؔ، مرزا رفیع سوداؔ، میر حسن، مرزا مظہر جانِ جاناں، میر عبدالحی تاباں، نواب انعام اللہ خان یقین، میر اثر، میر سوز، آنند رام مخلص، قائم چاند پوری، مرزا جعفر علی حسرت، نظیر اکبر آبادی، غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خاں انشاء، راسخ عظیم آبادی، مرزا غالبؔ، ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفر، خواجہ حیدر علی آتش، حکیم مومن خان مومنؔ، مصطفےٰ خان شیفتہ، پنڈت دیا شنکر نسیم، داغ دہلوی، اکبر الہ آبادی، انیس اور دبیرؔ وغیرہ شعراء کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی غزلوں کے اوصاف بھی گنائے گئے ہیں۔ جس سے کلاسیکی غزل گوئی کی ایک قابلِ قدر فہرست مرتب ہوئی ہے اور کلاسیکی غزل گوئی کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جبکہ مقالہ کی طوالت کے سبب کئی اہم شعرا کو نظر انداز بھی کیا گیا ہے اور کئی سہواً چھوٹ بھی گئے ہیں۔ یہ بات تیقن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس طرح کا کوئی بھی جائزہ کسی صورت میں سو فی صدی مکمل نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں تمام شعراء کو شامل کرنا امر محال ہے پھر بھی مجھ سے جہاں تک ہوا ہے میں نے حتیٰ المقدور ان شعرا اور ان کے کلام کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے باب میں مومنؔ کی غزل گوئی میں عصری معنویت تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ تمام اہلِ دانش جانتے ہیں کہ کسی بھی ادیب و شاعر یا تخلیق کار کی تخلیق میں اس کے عصر حاضر کا اثر بلا واسطہ یا

محاکمہ

Conclusion

اعمال کے بلند ترین مقام پر بیٹھاتی ہے۔ جہاں موصوف کی دیگر مثنویاں ان اقدار سے خالی ہیں۔ وہیں اس مثنوی میں موصوف نے اقدار کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ مومنؔ کی شخصیت کے تضاد کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ایک اقتباس پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

''حسن پرستی لذت پسندی اور شاہد بازی کے ساتھ انہیں مذہب سے بھی دلچسپی تھی ۔ کیونکہ انہوں نے اپنے ماحول میں افراد کو مذہب سے گہری دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی لئے کبھی بھی مذہب سے بیگانہ نہ ہوسکے۔ بلکہ ان کی مذہبیت نے تو اس حد تک ترقی کی کہ وہ مولانا سید احمد بریلوی کے مرید ہونے اور باوجود زندگی کے ساری زندگی جہاد کا دم بھرتے اور شہادت کی آرزو کرتے رہے۔ اس رجحان نے مومنؔ کو مذہبی ہی نہیں بنایا بلکہ علم وعمل دونوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کی ۔ باعمل تو خیر وہ نہ ہوسکے کیونکہ اپنے طبقے کی بہت سی روایات ان کی راہوں میں حائل رہیں۔ لیکن علم کی ایک لگن ان کے اندر ضرور پیدا ہوئی جس نے ان کی شخصیت کو گہرائی سے دوچار کیا۔ یہ گہرائی فلسفیانہ گہرائی نہ سہی لیکن انسانی اور اخلاقی گہرائی ضرور تھی۔ مومنؔ کی شخصیت میں اس کی جھلک ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے وہ علم سے دل چسپی رکھنے کے باوجود عالم نہ ہوسکے۔ لیکن ان کے اعلیٰ درجہ کے انسان اور شاعر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی چیزیں تو ان کی شخصیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔''

(کلیاتِ مومنؔ، مقدمہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۱۲/۱۳)

المختصر مومنؔ کی مثنویاں اپنی خوبیوں اور کمیوں کے باوجود ایک اہم درجہ کی حامل ہیں۔ جنہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ملاد کے امام زماں سے مجھے

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں

مری جاں فدا ہو تری راہ میں

میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں

اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

موضوع اور مواد کے اعتبار سے گیان چند جین نے مومن کی مثنویوں کو مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کا نقش اول کہا ہے۔ مومن کی مثنویاں پلاٹ اور مرقع نگاری کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ لیکن کردار نگاری قدر بہتر ہے اس کا کردار مثالی نہیں ہے بلکہ وہ ایک عام درجہ کا اوسط انسان ہے اور اس کے اندر انسانوں والی تمام خوبیاں اور خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ مومن کی مثنویوں میں منظر طرازی بھی اوسط ہے۔ جذبات نگاری بہترین ہے مومن کو جذبات نگاری میں مہارت حاصل ہے۔ پوری مثنوی حزن وملال کی داستان نظر آتی ہے۔

مومن کی مثنویوں کا امتیاز ان کی اسلوب نگارش میں بھی ہے۔ چونکہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ زبان وبیان میں ماہرانہ کمال دکھاتے ہیں۔ روزمرہ کے الفاظ وتراکیب ان کی شاعری میں ایک تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت بیانی تو ان کا طرۂ امتیاز ہے ہی لیکن اسلوب بیان بھی نہایت بلند و ارفع ہے۔ انہیں خوبیوں کی وجہ سے مومن کی مثنویاں مثنوی کی روایت میں مختلف ومنفرد نظر آتی ہیں۔ یہی مومن کی مثنویوں کے لئے ایک خوش آئند بات ہے۔ لیکن مومن کی مثنوی ان تمام مباحث سے الگ ایک مختلف نوعیت اور موضوع رکھتی ہے۔ جس کی بنا پر انہیں ادب میں ایک الگ شناخت ملتی ہے۔ جو ان کی تمام مثنویوں سے برعکس ہے۔ مثنوی جہادیہ سے ان کی شخصیت پُروقار اور پُرکشش اور مایہ دار نظر آتی ہے۔ مثنوی جہادیہ پر تفصیلی گفتگو پچھلے صفحے پر آچکی ہے۔ اس طرح ان کی شخصیت کا یہ تضاد بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ مثنوی انہیں افکار و

بزرگ کی طرح اسلامی جذبات سے سرشار نظر آتے ہیں۔ یہ مثنوی موصوف کی شخصیت کو بلند و بالا کرتی ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ سب سے تابناک پہلو ہے۔ اس مثنوی میں ایسا لگتا ہے کہ وہ ایمان وایقان کے ایک بلند مینارہ کی طرح چاروں طرف اپنی روشنی سے دین اسلام کی تبلیغ واشاعت میں منہمک ہیں۔

اس مثنوی کے اختتامیہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

شراکت یہاں کی ہے طالع کا اوج
کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج

سعادت ہے جو جاں فشانی کرے
یہاں اور واں کامرانی کرے

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار
یہ تیرے کرم کا ہوں امید وار

تو اپنی عنایت سے توفیق دے
عروج شہید اور صدیق دے

کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے

بالواسطہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی افکار ونظریات کیا تھے اور ان افکار ونظریات کا متعلقہ شاعر کے کلام خصوصاً غزلوں پر کیا اثرات نمایاں ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے موصوف کی غزلوں کی معنویت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ شاعر نہایت حساس ہوتا ہے۔ اس لئے دیگر اصناف کے مقابلے میں شاعروں پر ان حالات کے اثرات زیادہ نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ غزل کی صنف ایسی صنف ہے جس میں باتیں تفصیل سے نہیں اشارے کنائے میں درج ہوتی ہیں اس لئے مومن کی غزلوں میں بھی اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مومن کی مثنویوں، قصیدوں، رباعیوں، واسوخت اور قطعات میں عصری رجحانات زیادہ واضح ہیں۔ لیکن جو عصری رجحانات ومیلانات موصوف کی دیگر صنفوں میں ہیں وہی غزلوں میں بھی مترشح ہوتے ہیں لیکن اشارے کنایئے میں۔ اس سلسلے میں مومن کی پیدائش کے وقت اور اس کے بعد کے تمام سیاسی سماجی، اقتصادی اور مذہبی احوال وکوائف کا جائزہ مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عبادت بریلوی کا ایک طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ اسی اقتباس سے چند سطور یہاں نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا:

> ''مومن اپنے زمانے کے مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔ ماحول نے ان کی شخصیت اور فن کی آبیاری میں بڑا حصہ لیا ہے۔ انیسویں صدی کی دلی جو بقول حالی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی یاد دلاتی ہے۔ مومن نے اسی کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ اس لئے اس ماحول کی تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں سمٹ کر یکجا ہوگئیں۔ ہر چند کہ اس زمانے میں مغلوں کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا اور سیاسی اعتبار سے اس زمانے کی زندگی ایک ایسے سیاسی انحطاط وزوال اور سماجی انتشار وافراتفری سے دوچار تھی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔''
>
> (عبادت بریلوی، ص ۷)

ظاہر ہے کہ غزل کی صنف میں عصری رجحانات ہوتے ہیں۔ اس لئے مومن کی غزلوں کی معنویت

اپنی جگہ مسلم ہے۔ مومن کی غزل اس اعتبار سے قدر و احترام کی حامل ہے۔ مومن کی شخصیت کی تعمیر میں تمام عوامل شامل ہیں۔ مومن ایک طرف رند غزل خواں ہیں، تو دوسری طرف مذہبی عقائد کے علم بردار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان بادشاہِ وقت کے درباروں سے بھی منسلک تھا۔ مومن کے والد شاہی طبیب و حکیم تھے۔ اس لئے ان کا شمار عزت دار گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان کے مزاج میں نازک خیالی بھی اسی وجہ کر نظر آتی ہے۔ مومن عاشق مزاج بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں لڑکپن میں ہی کسی سے عشق ہو گیا تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی مثنوی میں کیا ہے۔ عشق بازی ان کی زندگی کا ایک مشغلہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے ساری زندگی عشق بازی میں گزار دی۔ اس دور کے رجحانات و میلان کی پیداوار یہ خصوصیات انہیں روز نئے معاشقانہ قصے کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس سلسلے کے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''یہ زمانہ شکستِ و ریخت کا زمانہ تھا۔ جاگیرداری نظام سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے ہتھیار ڈال رہا تھا۔ پرانے رؤسا اور شرفا نئے رؤسا اور شرفاء کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھنا سیکھ رہے تھے۔ اور اپنی ذات و غربت سے گھبرا گھبرا کر ''ہائے شرافتِ نسل'' اور ہائے شرافت خاندان'' کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اقتصادیات کے ڈھانچے پگھل کر نئے ڈھلنے والے تھے۔ جب یہ حال ہو تو بھلا عشق کا کہاں گذارا۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں کے یہاں غمِ جاناں پر غم روزگار حاوی آتا دکھائی دیتا ہے۔ جب اپنی ہی استقامت مشتبہ ہو تو غم جاناں کی استقامت معلوم! غالب اپنے زمانے کی بہت بڑی شخصیت تھا۔ وہ اس جھٹکے کو جھیل گیا۔ اس تبدیلی کو اس نے اپنے ظریفانہ مزاج اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح سے ہم آہنگ کیا اور مضبوطی سے ان متزلزل بنیادوں پر اسے قابو حاصل ہو گیا۔ مگر مومن خان میں اتنی قوت نہ تھی چنانچہ عشق کافور ہو گیا۔ اور ہوس ہی ہوس وہ گئی اور یہ

ہے۔ان کے یہاں میرؔ اور غالبؔ کی فتادگی شکست پیہم اور ذہنی پیچیدگی نہیں

اور نہ ہی انہوں نے اپنے آئینے سے ہٹ کر کائنات کے آئینے میں چہرہ

دیکھنے کی کوشش کی۔اسی لئے نہ تو یہاں شدید داخلیت ملتی ہے اور نہ فکر کی

تہیں۔''

(مطالعہ مومنؔ: ساحل احمد مضمون نگار، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۶۸)

ضیا احمد بدایونی نے مومنؔ کے کلام میں تغزل کے علاوہ مکر شاعرانہ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جو موصوف کو دیگر شعراء میں ممتاز و منفرد مقام دلاتا ہے۔اس قبیل کے صرف دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

غیروں پر کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا

میری طرف بھی اے غمزہ غماز دیکھنا

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی

آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مومنؔ کی غزلوں میں تمام جملہ خصوصیات پر تفصیلی بحث میں حوالہ جات اور اشعار پیش کر کے ان خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس کو یہاں دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔صرف اس ضمن میں سرسری جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔صرف موصوف کی جملہ خصوصیات غزل کے حوالے سے ڈاکٹر مسیح الزماں کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کا مخصوص طرز ان کے انفرادی طرز کا اظہار ہے۔ محبت کے فطری

جذبے کو انہوں نے ابتذال سے دور رہ کر اس کامیابی سے پیش کیا ہے کہ

اگر ہمارے نقادوں نے، نازک خیال، ندرت اسلوب حسنِ ادا جیسے رسمی

عنوانات سے مومنؔ پر تنقید نہ کی ہوتی تو اردو غزل کے غیر فطری عشق کے

متعلق بہت سے لوگوں کی غلط فہمیاں نہ بڑھتیں۔ مومنؔ کے جذبات کا توازن ان کے احساسات کا خاص جُز ہے۔ انہوں نے عورت سے محبت کی ہے۔ اس کے حسن پر فریفتہ ہوئے ہیں۔ اس کے جسم کی کشش محسوس کی ہے۔ چاہت کے اس عالم میں نفسیات انسانی جن رنگا رنگ احساسات کا مرکز بنتا ہے۔ اس کی ترجمانی مومنؔ نے چابکدستی اور مہارت سے کی ہے۔ تجربے کی سچائی اور فن پر عبور نے ان کے تیور میں ایک تیکھا پن پیدا کر دیا ہے اور اسی انداز نے اردو غزل میں ان کو بلند مقام دلایا ہے۔"

(کلیات مومنؔ: ڈاکٹر مسیح الزماں، ص ۱۶/۲۵)

مومنؔ کی غزل گوئی تمام غزل گو شعراء میں ایک الگ شناخت کی عکاس بن جاتی ہے۔ جو معاصرین میں واقعیت پسند شاعر سے متعارف کراتی ہے اور اس نئی روش کے قد آور شاعر بن کر ابھرنے میں کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ اس نئے ڈگر پر وہ بالکل تنہا بھی نظر آتے ہیں۔ اس فکر و نظر کا حامل کوئی دوسرا شاعر بھی نظر نہیں آتا ہے۔ یہی ان کی اعلیٰ مرتبت کا ضامن بھی بنتا ہے۔ اور انہیں اردو غزل گو شعراء میں افتخار و معظم بناتا ہے۔

تیسرے باب میں مومنؔ کی غزلوں میں تشبیہہ، استعارات علم طب، نجوم، شطرنج، ریاضیات کے اصول اور علم موسیقی کے تعلق سے نہایت سنجیدگی سے جائزہ پیش کیا گیا ہے اور مومنؔ کے کلام میں تمام علوم وفنون کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ مومنؔ کا گھرانہ حکیم تھا۔ اس لئے علم طب انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ اور اس میں انہوں نے کمال بھی حاصل کیا تھا۔ اسی علم طب کی وجہ سے مومنؔ کی امۃ الفاطمہ عرف صاحب جی کے علاج کے دوران ان سے عشق ہو گیا تھا۔ جس کی تفصیل بھی چوتھے باب میں پیش کی گئی ہے۔ علم نجوم کی بھی انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی اور پورا مکمل زائچہ کو ذہن نشیں کر لیا تھا تا کہ بغیر زائچہ دیکھے ہی نجوم و رمل کی حرکت و رفتار کا حساب باتوں باتوں میں کر لیا کرتے تھے۔ وہ ریاضیات کے اصول میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ شطرنج کے تعلق سے تو ان کے کئی قصے لوگوں میں مشہور تھے۔ جن کا حوالہ اس باب میں درج ہوا ہے۔ وہ جب شطرنج

باخبر تھے۔اس لئے ان کے سارے جذبات وکوائف داخلی ہیں۔ یہ عشق وہی ہے جو عام طور سے اردو غزلوں میں ملتا ہے۔اس کے کرشمے بھی وہی ہیں، وصل، ہجر، اشک، جنوں، آہ وفغاں، انہیں کا مختلف پیرایہ میں مومنؔ کی غزلوں میں بھی بیان ہے۔اور ظاہر ہے کہ جذبات کچھ نئے نہیں تمام غزل گوشعراء انہیں مضامین کا سہارا لیتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ مومنؔ ان پر محض رسماً طبع آزمائی نہیں کرتے۔ ان کا دل ان کوائف سے آشنا تھا۔اس لئے ان کی غزلوں میں صرف قافیہ پیمائی نہیں حقیقت وواقعیت کا جلوہ ہے۔''

(اردو شاعری پر اِک نظر:کلیم الدین احمد ص ۱۴۴/۱۴۳)

مومنؔ کی غزل گوئی کے متعلق تمام ناقدین منقولہ بالا نکات پر متفق ہیں۔ مومنؔ نے اپنے محدود دائرے میں جو غزل گوئی کی ہے اس میں روایت سے انحراف بھی ہے مگر روایت کو یکسر متروک کرنے کا رجحان نہیں ہے بلکہ مومنؔ نے روایت کا پاس رکھتے ہوئے ایک الگ راہ نکالی ہے۔جس میں تغزلیت، نازک خیالی، داخلیت، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدگی کے ساتھ اپنی تبحر علمی کا زور بھی پیدا کیا ہے۔او رمخدوفات معنیٰ اپنے اشعار میں رقم کئے ہیں۔اس کے علاوہ اس عہد کی روش کے مطابق معاملہ بندی کے اشعار بھی لاجواب پیش کئے ہیں۔ مومنؔ کی غزلوں میں معاملہ بندی کے اشعار نہایت دلنشیں پیرایہ بیان میں رقم ہوئے ہیں۔اس سلسلے میں مومنؔ کی مکمل غزل ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' قابلِ ذکر ہے۔مخدوفات معنیٰ میں تونیاز فتح پوری نے مومنؔ کو غالبؔ پر فوقیت دی ہے۔اور دیگر شاعروں کے یہاں یہ امتیاز عنقا ہے۔ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کا ایک مخصوص انداز بیان جو غالبؔ کے ہاں کمتر اور دوسرے شعراء کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا۔ کسی واقعہ کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو ملانے کی خدمت ذہن سامع کو سپرد کردیتے ہیں۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ

ہوس بھی وقت کی تیز رفتار تبدیلیوں سے قدم نہ ملا سکنے کی وجہ سے کچھ اس

درجہ بتلا پن اختیار کر گئی۔''

(مطالعہ مومنؔ: ساحل احمد مضمون نگار، عطا محمد، ۱۴۹۔۱۵۰)

ان کے مزاج میں مباشرت اور ہوس پرستی بھی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے نام ونمود کا پاس بھی تھا۔ مومنؔ کی غزلیں تغزلیت کی مثال ہیں۔ ان کی غزلوں میں حقیقت کی ترجمانی نہایت سلیقے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نازک مزاجی سادگی اور پیچیدگی، محذوفات معنیٰ اور جمالیاتی حسن وغیرہ تمام اپنے فنی لوازمات کے ساتھ ہیں۔ مومنؔ غزل گوشاعروں میں اعلیٰ وارفع مقام رکھتے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی غزلیں محدود دائرہ میں نظر آتی ہیں۔ لیکن محدود دائرہ فکر میں جو وسعت و بلندی انہیں میسر ہے دوسرے کم شعراء اس درجہ تک پہنچ سکے ہیں۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کی رائے ملاحظہ فرمائیں :

''مومنؔ کی دنیا محدود ہے۔ غالبؔ وسوداؔ کی دنیا کی طرح وسیع وفراخ نہیں۔ اور وہ کبھی اس تنگ دنیا سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے۔ اس لئے ان کے اشعار میں مضامین کے لحاظ سے وہ تنوع نہیں جو سودا اور غالبؔ کے کلام کو میسر ہے۔ لیکن مومنؔ صاحب طرز ہیں۔ ان کا الگ اسلوب ہے اور اپنے مخصوص رنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ درست ہے وہ دردؔ اور غالبؔ کی طرح مسائل تصوف کو نظم نہیں کرتے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بلند فلسفیانہ خیالات سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا میدان شاعری تنگ تر ہو جاتا ہے۔ میرؔ کی طرح مومنؔ کی دنیا میں بھی عشق کی حکمرانی ہے۔ عشقیہ جذبات جو ان کے شعروں میں ملتے ہیں۔ وہ وہی ہیں جو ان کے دل پر گزرے ہیں۔ مصنوعی جذبات سے انہیں پرہیز ہے۔ جس عشق کا وہ ذکر کرتے ہیں۔ وہ عشق حقیقی نہیں عشق مجازی ہے۔ وہی عشق جس سے وہ

سننے والا نہایت آسانی کے ساتھ اس خلا کو پُر کر کے مفہوم تک پہنچ

جاتا ہے۔''

(مطالعہ مومنؔ: ساحل احمد، مضمون نگار، نیاز فتح پوری، ۳۳،۳۴)

نیاز فتح پوری کی نظر میں مومنؔ کی غزلوں کی یہ خوبی اس قدر متاثر کرتی ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے انہیں غالب پر فوقیت دے دیتے ہیں جو کسی صورت میں درست نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس طرح کا اختراعی ذہنی عمل بڑے فنکارانہ ہنر کا متقاضی ہوا ہے۔ اور غالبؔ کی طرح ان کی ذہنی پرواز بھی نئے نئے طریقے ایجاد کرتی ہے۔ اس قبیل کے چند مومنؔ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

بے جرم پائمال عدو کو کیا گیا
مجھ کو خیال بھی تیری سر کی قسم نہیں

مومنؔ کی غزلیں اپنی جملہ خصوصیات کی وجہ سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ اور مومنؔ غزل میں شہنشاہ تغزل کہے جاتے ہیں۔ اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر نیاز فتح پوری نے تمام متقدمین شعراء میں (صرف میرؔ کو چھوڑ کر) مومنؔ کے دیوان کو حاصل کرنے کی بات کہی ہے۔ لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی نے مومنؔ کو دوئم درجہ کا غزل گو شاعر قرار دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''شعراءِ اردو میں مومنؔ اپنے مواد کے اعتبار سے صف دوم کے شاعر ہیں۔
لیکن اپنے طرز غزل گوئی اور انداز بیان کی ندرت وانفرادیت کے لحاظ سے
ان کی آواز اردو شاعری میں ایک جاندار آواز ہے۔ ان کی شخصیت میں کچھ
ایسا بانکپن اور ان کے لہجے میں کچھ ایسا نوکیلا پن ہے جو انہیں سے مخصوص

کھیلتے تھے تو وقت کا اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ صبح سے شام اور شام سے صبح کیسے ہو جاتی انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ اس درمیان انہیں نہ کھانے کی فکر ہوتی نہ کوئی ضروری کام ہی یاد رہتا تھا۔ وہ اکثر ضروری کام شطرنج کھیلنے میں بھول جایا کرتے تھے۔ وہ شطرنج کھیلنے میں اس قدر ماہر ہو گئے تھے کہ حریف کو ہمیشہ شکست فاش بھی دیا کرتے تھے۔

علم موسیقی میں بھی وہ کمال ہنر رکھتے تھے۔ ان کا نام اس ہنر کے ماہرین شہر میں نہایت مقبول و معروف تھا۔ ان کی آواز بھی نہایت دل پذیر تھی۔ اکثر مشاعروں میں ترنم کے ساتھ غزل پڑھا کرتے تھے۔ جب وہ غزل پڑھتے تو پوری محفل میں خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ پورا مجموع ایک عالم محویت میں گم ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک درد تھا جو تمام لوگوں کو اپنے دائرہ اثر میں قید کر لیا کرتا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں :

درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی ....۔''

''شاعری کیا تھا، جادو تھا، تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے..............۔''

''ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو کرتے تھے۔...........۔''

(مومن خان مومن ایک مطالعہ، نیالیہ، پروفیسر نذیر احمد، ص ۱۷/۱۸)

مومن کی غزلوں میں تشبیہ کا استعمال کم ہوا ہے۔ تشبیہہ کی بہ نسبت استعارہ کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور استعارہ کی بہ نسبت کنایہ بدرجہ اتم استعمال ہوا ہے۔ اس طرح مومن کی غزلیں فکری اور فنی تمام خوبیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے غزلوں کی عصری معنویت بھی مسلم ہے۔ اس سلسلے میں عبادت بریلوی نے ان کی علم طب، علم نجوم، اور فن شطرنج پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ تمام ناقدین و محققین نے موصوف کے جملہ علوم وفنون کا ذکر کیا ہے اور ان علوم میں ان کی مہارت اور ذہانت کا لوہا مانا ہے۔

چوتھے باب میں مومنؔ کی مثنویوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں تمام ناقدین کی آراء کو نقل کر کے ان کی مثنویوں کی خوبیوں اور خرابیوں کو نشان زد کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مومنؔ کی تمام مثنویوں کا الگ الگ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور ان میں بیان ہوئے قصے اور کہانیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی مثنویاں مثنویوں کی روایت میں تجدیدی نقطہ نظر کی حامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی فنی کمیوں کو بروئے کار لاکر ان مثنویوں کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مومنؔ کی مثنویوں پر یہ الزام عاید ہوتا رہا ہے کہ ان کی مثنویوں میں عریانیت اور سطحیت ہے۔ جو انہیں عریانیت پسند شاعروں کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مخالفت اور حمایت دونوں طرح کے ناقدین کی آراء نقل کر کے توازن قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد ان کی مثنویوں میں حقیقت پسندی تغزل داخلیت اور زبان و بیان اور اسلوب نگارش پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے موصوف کی مثنویاں قدر و احترام کی حامل نظر آتی ہیں۔ گیان چند جین نے انہیں حقیقت پسند مثنوی نگار قرار دیا ہے۔ ان کی مثنویاں اخلاقی اعتبار سے کوئی درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ امداد امام اثر کے اس قول کا بھی تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس میں امداد امام اثر نے ان کی مثنویوں کو نسل آدم کے لئے بے کار قرار دیا تھا۔ لیکن مومنؔ کی مثنوی جہادیہ کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ اس لئے موصوف کی مثنوی جہادیہ کا بھی تجزیہ پیش کر کے توازن قائم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان تمام مباحث میں توازن و اعتدال قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مومنؔ کی مثنویاں فنی لوازمات کے دائرے سے آزاد نظر آتی ہیں۔ ان کی مثنویاں پلاٹ سازی، مرقع نگاری کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ کردار نگاری بھی اوسط درجہ کی ہے۔ منظر طرازی میں بھی کوئی اختصاص نظر نہیں آتا۔ جذبات نگاری میں مومنؔ کو مہارت حاصل ہے۔ تمام مثنویوں میں حزن و ملال اور رنج والم کا ایک موثر انداز و اسلوب نظر آتا ہے۔ مومنؔ کی مثنویوں کی دوسری خوبی اسلوب نگارش ہے۔ اس فن میں موصوف کو ماہرانہ دستگاہ حاصل ہے۔ ان کی قادرالکلامی لاجواب ہے۔ الفاظ کی نشست و برکاست اور روزمرہ کے الفاظ و محاورت نہایت سلیقے سے شامل کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے موصوف کا اسلوب بیان نہایت دلکش ہو گیا ہے۔

المختصر یہ کہ مومنؔ کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار بھی ہے۔ جس میں مومنؔ کا اپنا مخصوص انداز بھی

نمایاں ہے۔ ان کی غزل اور مثنوی دونوں شعری کائنات میں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات انہیں اردو ادب میں عزت احترام دلانے کی دلالت کرتے رہیں گے۔ مومنؔ کی شاعری اور اس کا ادب میں مقام متین کرتے ہوئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا ایک اختتامیہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مختصر یہ کہ مومنؔ کے رنگ کلام کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان کی تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جن کے ذریعہ سے ان کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ مومنؔ کے یہاں میرؔ کا سوز وگداز، غالبؔ کی ندرت خیال، جرأتؔ کی معاملہ بندی اور ذوقؔ کی سلاست بیان پائی جاتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب عناصر مومنؔ کی شاعری میں پائے جاتے ہیں لیکن ایک نئے انداز اور نئے تناسب کے ساتھ۔ ان کی شاعری میں اثر اور خلوص ہے لیکن میرؔ کی سی سپردگی اور فنائیت نہیں۔ ان کے یہاں معاملہ بندی ہے مگر سوقیانہ مذاق اور عریانیت سے پاک۔ ان کے یہاں سلاست بیان ہے۔ مگر پھیکے پن سے مبرا۔ ان کی شاعری میں خلوص محبت ہے۔ لیکن دو خصوصیتوں سے دبا ہوا، ایک طرف ان کی مذہبی شخصیت ان کو ساری متاع حیات پر قربان کر دینے سے باز رکھتی ہے۔ دوسری طرف اپنی ذہنی برتری کا احساس ان کو محبوب کے سامنے بھی اپنی شکست قبول کرنے سے روکتا ہے۔ یہ مذہبی جذبہ ان کی پوری زندگی اور پوری شاعری پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ حتیٰ کہ غزلوں میں بھی ہر قدم پر نمایاں ہے۔

ان تقاضوں اور بندشوں کے ردِعمل سے ایک ایسی شاعری وجود میں آتی ہے جو مومنؔ کو میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ یا کسی دوسرے شاعر سے نہ بڑھانا جائزہ

سمجھتے ہیں نہ ان کا مقلد محض ٹھہرانا۔ البتہ مومنؔ کی انفرادیت پر ایمان نہ لانا اور ان کے کلام کے اعلیٰ شاعرانہ جوہروں کا انکار کرنا کسی طرح متوازن تنقید اور خوش مذاقی کا ثبوت نہیں کہا جاسکتا ہے۔"

(مومنؔ شخصیت اور فن: پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص ۴۲۸)

کتابیات

Bibliography

نمبر شمار	کتب و رسائل	مصنف/مرتب	سنِ اشاعت
۱	کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید	طارق سعید	۱۹۹۱ء
۲	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۹۱ء
۳	آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	بشیر بدر	۱۹۸۱ء
۴	جدید اردو غزل کی روایت	غیر مطبوعہ (مقالہ)	
۵	نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۲۰۰۸ء
۶	اردو کے مشاہیر شعراء اور قومی یک جہتی	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۲۰۲۰ء
۷	سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' مظفر پور	مدیر: ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء
۸	اردو غزل کی نشو ونما	سیّد رفیق حسین	۱۹۵۵ء
۹	اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل	ڈاکٹر ممتاز الحق	۱۹۹۱ء
۱۰	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	وہاب اشرفی	۲۰۰۵ء
۱۱	تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	وہاب اشرفی	۲۰۰۵ء
۱۲	تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	وہاب اشرفی	۲۰۰۵ء
۱۳	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ اول)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء
۱۴	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ دوم)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء

۱۵	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ دوم)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء
۱۶	تاریخ ادب اردو (جلد اول حصہ دوم)	جمیل جالبی	۲۰۰۹ء
۱۷	مومن خان مومنؔ	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۸۵ء
۱۸	کلیات مومنؔ	ڈاکٹر مسیح الزماں	۱۹۷۱ء
۱۹	نگار (پاکستان ا) سہ ماہی	نیاز فتح پوری	۱۹۶۴ء
۲۰	مطالعہ مومنؔ	ساحل احمد	۱۹۸۵ء
۲۱	مومن خان مومنؔ: ایک مطالعہ	شاہد ماہلی	۲۰۰۸ء
۲۲	کلیات مومنؔ	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۵۵ء
۲۳	دیوانِ مومنؔ	حفیظ قتیل	۱۹۶۰ء
۲۴	اردو غزل	ڈاکٹر کامل قریشی	۱۹۸۷ء
۲۵	مقدمہ شعر و شاعری	ڈاکٹر وحید قریشی	۲۰۱۷ء
۲۶	جلوۂ خضر	صاحب گل رعنا	
۲۷	ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	
۲۸	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۲۰۰۴ء
۲۹	حیات مومنؔ	عرش گیاون	۱۹۲۸ء
۳۰	اورینٹل کالج میگزین (پاکستان)	کلب علی خاں	۱۹۵۹ء
۳۱	مومن خاں مومنؔ		
۳۲	حیات اور مطالعاتی ترجیحات	معید رشیدی	
۳۳	مومنؔ دہلوی	امیر حسن نورانی	۱۹۵۷ء
۳۴	حیات مومنؔ	ضمیر الدین احمد عرش گیاوی	

نمبر	کتاب	مصنف	سال
۳۵	مومن خان مومن		
۳۶	حیات وشاعری	پروفیسر نذیر احمد	۱۹۹۱ء
۳۷	مومن خان مومن: ایک مطالعہ	شاہد ماہلی	۲۰۰۸ء
۳۸	دیوان مومن مع شرح	ضیا احمد بدایونی	۱۹۶۲ء
۳۹	اردو مثنوی شمالی ہند میں	گیان چند جین	
۴۰	کاشف الحائق (حصہ دوم)	امداد امام اثر	
۴۱	دیوان مومن مع شرح	ضیا احمد بدایونی	۱۹۴۷ء
۴۲	دیوان مومن	ڈاکٹر انوار الحسن	۱۹۷۱ء
۴۳	دیوان مومن	تمکین کاظمی	۱۹۶۰ء
۴۴	دیوان مومن		۱۹۸۵ء
۴۵	انتخاب کلام مومن	نریش کمار شاد	
۴۶	انتخاب دیوان مومن	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۵۸ء
۴۷	کلیات مومن، ترقی ادب لاہور، حصہ اول	امتیاز علی تاج	۱۹۶۴ء
۴۸	کلیات مومن، ترقی ادب لاہور، حصہ دوم	امتیاز تاج	۱۹۶۴ء
۴۹	انشائے مومن	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۹۷۷ء
۵۰	انتخاب دواوین مومن	نسیم تسلیم	۱۹۷۳ء/۱۹۵۲ء
۵۱	انتخاب دیوان مومن	حامد حسن قادری	۱۹۵۷ء
۵۲	انتخاب کلام مومن	عبدالودود خان	۱۹۵۷ء
۵۳	انتخاب کلام مومن خان	سید حسن عسکری صاحب	۱۹۳۸ء
۵۴	انتخاب دیوان مومن	ظفر احمد صدیقی	۱۹۸۳ء

۵۵	میخانہ تغزل	پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی	۱۹۵۴ء
۵۶	مجموعہ قصائد مومنؔ	ضیاء احمد بدایونی	۱۹۲۵ء
۵۷	مومنؔ اور اس کی شاعری	ڈاکٹر نسرین اختر	۱۹۷۹ء
۵۸	مومنؔ حیات و شاعری	عبدالرحمٰن اصلاحی	۱۹۷۵ء/۱۹۶۰ء
۵۹	مومنؔ کے تہتسر نشتر	سرور مرزا پوری	
۶۰	منتخب غزلیں	اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنو	۱۹۹۹ء
۶۱	قصائد مومنؔ مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۱۹۶۰ء
۶۲	غالبؔ نامہ (مومنؔ نمبر)	مدیر: نذیر احمد	جولائی ۱۹۸۵ء
۶۳	ادب شناسی	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۲۰۱۵ء

Revised Synopsis for Ph.D. Degree

Faculty Of Humanities (URDU)

L.N. Mithila University, Kameshwar Nagar, Darbhanga

Name of Research Scholar : Md. Hanzalah

Name of Supervisor : Dr. Barkat Ali, HOD of Urdu,
M.L.S.M. College, Darbhanga

1. **Title of Research Work:**

Approved Title - " KHAN MOMIN KI GHAZALGOI "

As per the direction of Research Board Meeting on 25.2.2013 (Letter Attached)

2. **Statement of Research Problem:**

Momin Kahn Momin (1800-1852) was one of the prominent Urdu Poets of 19th century. He might, easily, be distinguished between his two great contemporaries like Ghalib and Zauq. It is an established fact that when Momin composed the under-noted couplet:

Tum Meray Pas Hotay Ho Gaya
Jab Koi Dusra Naheen Hota

his great contemporary poet, Mirza Ghalib whole heartedly, praised it and as a token of affection offered his 'Diwan' (Collection of Ghazals) in lieu of this couplet.

This shows the poetic calibre and craft of Moimin. As he was having mastery of Mathematics, Astrology, Music and Chess, his poetic art is complicated and multidimensional interms of meaning. Besides 'taghazzul', he adopted a new style of expression with smart-set of words, simili, metaphor and 'ibham' (ambiguity).

Although, ghezal writing in Urdu is about one thousand years old, Momin's separate identity is still intact.

To develop own idea, the 'Kuliyat' of Momin will be studied in the context of his poetic art.

Lastly, the opinions of prominent critics will have to be constructed with the out-come of study of the Kuliyat for projecting the findings on different levels of Momin's verse.

7. Work Design:

This research work may be distributed in the follwoing interlinked chapters besides introduction & Bibliography:

Chapter 1 : Special Features of Classical Ghazals

Chapter 2 : Momin's Ghazals as Analysed Until Now

Chapter 3 : Content and Topics of Momin's Ghazals

Chapter 4 : Role of Simili, Metaphor, Terms of Mathematics, Astrology, Music and Chess in Momins Ghazals

Chapter 5 : Momin's Masnavi-a study

Conclusion

Bibliography.

Ali
29.6.13
Supervisor
Associate Prof
H.O.D. Urdu
MLSM College.
Darbhanga.

Md. Hanzala
29.06.13
Research Scholar

To develop own idea, the 'Kuliyat' of Momin will be studied in the context of his poetic art.

Lastly, the opinions of prominent critics will have to be constructed with the out-come of study of the Kuliyat for projecting the findings on different levels of Momin's verse.

7. Work Design:

This research work may be distributed in the follwoing interlinked chapters besides introduction & Bibliography:

Chapter 1 : Special Features of Classical Ghazals

Chapter 2 : Momin's Ghazals as Analysed Until Now

Chapter 3 : Content and Topics of Momin's Ghazals

Chapter 4 : Role of Simili, Metaphor, Terms of Mathematics, Astrology, Music and Chess in Momins Ghazals

Chapter 5 : Momin's Masnavi-a study

Conclusion

Bibliography.

Ali
29.6.13
Supervisor
Associate Prof
H.O.D. Urdu.
MLSM College.
Darbhanga.

Md. Hanzala
29.06.13
Research Scholar

ترتیب

ISSN. 2582 - 3612

گوشۂ ریسرچ اسکالرس

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد حنظلہ

حکیم مومن خاں مومنؔ : ایک منفرد قصیدہ نگار شاعر

حکیم مومن خان مومنؔ (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۱ء) اردو ادب میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی بیشتر صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے انہوں نے غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، قطعات اور معمیات وغیرہ میں اپنی جولان طبع کا ظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے ان کے فارسی اشعار کی تعداد بھی کافی ہے۔ لیکن اردو ادب میں ان کی شہرت و مقبولیت غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں ہے کہ دیگر اصناف شعری کسی درجہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ انہوں نے تمام اصناف سخن میں ایک منفرد رنگ امتیاز قائم رکھا ہے جو انہیں تمام اصناف سخن میں ایک معتبر مقام دلاتا ہے خصوصاً غزل گوئی کے بعد ان کا سب سے بہترین شعری کارنامہ ان کی قصیدہ گوئی ہے۔ موصوف نے صرف نو قصیدے کہے ہیں۔ جن میں پانچ دینی قصائد ہیں جو چار خلفائے راشدین پر ہیں اور ایک حضرت حسنؓ کی شان میں ہے۔ دو غیر مذہبی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان والی ٹونک دوسرا راجا جیت سنگھ برادر مہاراجا پٹیالہ کی مدح میں ہے۔ ایک حمد یہ قصیدہ ہے ، ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔

مومن خان مومنؔ کی قصیدہ نگاری ندرت فکر اور اسلوب بیان کی وجہ سے قدر و احترام کی حامل ہے۔ مومن کے قصائد میں خصوصاً تشبیب منفرد رنگ و آہنگ لئے ہوئے ہے۔ مذہبیت، حسن پرستی اور ان کے اشتراک سے موصوف نے ایک الگ دنیا تعمیر کی ہے جس کی مثالیں دیگر شعراء کے قصائد میں نہیں ملتیں۔ مومنؔ کی تشبیب میں طعن وطنز اور بذلہ سنجی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مومن اپنی طنز کے نشتر سے ایسا کاری ضرب لگائے ہیں کہ انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ مومنؔ کے قصائد میں اجزائے ترکیبی کا اہتمام نہایت حسن و خوبی سے ہوا ہے۔ ان کے قصائد روایت کا احترام بھی کرتے ہیں مضمون آفرینی، ندرت خیال، اسلوب بیان اور اسلوب بیان میں شان وشکوہ وغیرہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ چونکہ زیادہ تر قصائد کا اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اخلاقی اعتبار سے ایثار و خلوص کے مرقع معلوم ہوتے ہیں مومن کے قصائد کے سلسلے پروفیسر ضیا احمد بدایونی اپنے خیالات یوں بیان کرتے ہیں :

"مومن سے پہلے جس قدر شعراء گذرے ہیں قصیدے ہیں (بہ استثنائے سودا) مومن کا کوئی ہم سر نہیں۔ اگر چہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے۔ تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہو سکتا۔"

(قصائد مومن (مقدمہ) پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ص۔ ظ)

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی رائے کو من وعن قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غالبؔ، انشاء وغیرہ شعراء کے قصائد مومن کے قصائد سے کئی اعتبار سے اعلیٰ ہیں۔ چونکہ اس مضمون میں تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے اس لئے سرسری طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومنؔ کے قصائد بھی لائق ستائش ہیں اور تغزلیت کے ساتھ اختراعی رنگ لئے ہوئے ہیں اس لئے قصیدہ نگاری کی روایت میں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مومنؔ کے قصائد کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومنؔ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمی اصلاحات اور صنائع بدائع کا ذخیرہ جمع کر دیا۔ اس سے مومن کی تبحر علمی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ چونکہ مومن ماہر طب، ماہر ریاضی و نجوم کے علاوہ قرآن و احادیث کا گہرا علم رکھتے تھے اس لئے ان کے اشعار میں تمام موضوعات سے تعلق رکھنے والے اشعار کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اسی وجہ کر ان کے قصائد میں پیچیدگی اور تکلف بھی پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ان کا دفاع کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشارات و تلمیحات اور علوم کی اصلاحات کے باعث مومن کے قصائد میں اغلاق پیدا ہو گیا۔ مگر اس میں ان کو خطاوار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چونکہ قصیدہ کبھی عوام کی چیز نہیں رہا بلکہ خواص تک محدود رہا ہے۔ اس لئے خواص کو پر پیچ اور کٹھن وادیوں کو طے کرنا ان علمی مصطلحات کو سمجھنا اور ان بعید تلمیحات پر عبور حاصل کرنا چنداں مشکل نہیں۔ پھر یہ مشکل پسندی، خیال بندی، الفاظ کا جوش، بیان کا خروش، یہ سب قصیدہ کی جان ہیں۔ جو لوگ مومنؔ کے کلام پر ان علمی اصطلاحات کے باعث اعتراض کرتے ہیں ان کو یہ اعتراض مومن کے بجائے خود قصیدہ پر کرنا چاہئے۔ قصیدہ دوسری اصناف سخن کے برعکس ایک مختلف مزاج لیکر شاہانہ ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ قصیدہ میں طمطراق شان وشکوہ اور اظہار علمیت نہ ہو تو وہ لباس قصیدہ کے جسم پر کبھی چست نہ ہوگا۔"

(مومن شخصیت اور فن مصنفہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص۔ ۲۱۶)

مندرجہ بالا مباحث اور حوالوں سے واضح ہے کہ مومن خان مومنؔ کی قصیدہ نگاری ایک امتیاز و

انفرادیت رکھتی ہے۔ انہیں بحیثیت قصیدہ نگار بھی ایک احسن مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ مومن کے قصیدہ میں بھی غزلوں کی سی تغزلیت، زبان میں سلاست و چاشنی، محاورات کی صفائی اور بے ساختگی ایک الگ تاثر مرتب کرتے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے قصائد سے تشبیب کے چند اشعار نمونتاً پیش کر دئے جائیں تاکہ قصیدہ کے سلسلے میں ہوئی گفتگو اپنی دلیل حاصل کر سکے۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس — کہ جیسے صبح شبِ ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح فرح انگیز کوکوئے قمری — کہ جیسے فوج مظفر کو شور و غلغل کوس
نوائے طوطیِ شکر فشاں کی لذت سے — سماع و رقص میں اہلِ مذاق جو طاؤس
غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط — بہار لالہ و گل سیمیائے عرض سموس
صفا سے وہ در و دیوار باغ کا عالم — کہ آشیانہ میں دشوار طائروں کو جلوس

ایک اور قصیدہ کی تشبیب ملاحظہ فرمائیں ۔

کوئی اس دور میں جئے کیونکر — ملک الموت ہے ہر ایک بشر
دار خواہوں کے شور سے دیکھو — چونکہ پڑتا ہے فتنۂ محشر
آئینہ نے بھی اس زمانے میں — تیغ کے سے نکالے ہیں جو ہر
آتشِ لعل سینۂ جاں سوز — آب نسیاں ہے ایک بد گوہر
جسکو دیکھو سو مایۂ بیدار — کیا ہوا گر نہیں ہے یٰسمیں زر

اب مدحیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

اے مسیح دم رواں پرور — زندگی بخش دینِ پیغمبرؐ
گرمی التفات سے تیری — خشک ہو عاصیوں کا دامن تر
ہے سراپا تو مہرۂ تر پاک — تجکو کیا نیس مار سے ہو ضرر
ہے ترے خار جیب کا قصہ — شرِ یانِ حسود کو نشتر
تو وہ سلطان کہ بار گنہ کا تیری — پشت کا شانہ ہے فلک منظر

اور اب آخری حصہ دعائیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

مومن اب کر دعا کہ سنتا ہے — تیری تقریر گوش دل سے اثر
جب تلک گردشِ سپہری ہے — انتسابِ حدوس نیکی و شر
تیرے احباب نیک بخت مدام — تیرے اعدا ہمیشہ قال اختر
جب تک اس تیرہ خاک داں میں ہے — کوئی گم کردہ رہ کوئی رہبر

تیرے حاصد ہوں غول صحرائی — تیرے پیرو ہو پیشوائے خضر
نیک خواہ اور خوبی دارین — بدسگال اب سے خوار تا محشر

قصائد مومن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو قصیدہ نگاری میں مومن کا مقام و مرتبہ بہت بلند نہیں لیکن بہت کم تر بھی نہیں ہے ۔ نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون میں قصیدہ نگار شاعروں کا سلسلہ سودا، ذوق، غالب، پھر مومن لکھا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ مومن کی قصیدہ نگاری ایک مقام و مرتبہ رکھتی ہے آخری میں نیاز فتح پوری کے جملے پر اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''بہر حال اس میں شک نہیں کہ فنی حیثیت سے مومن کے قصائد بھی کم اہمیت نہیں رکھتے اور اگر ہم قصائد کے تغزلانہ حصوں کو بھی سامنے رکھیں جہاں وہ بے اختیارانہ ایک عاشق دلباز کی حیثیت سے سامنے آگیا ہے تو یہ اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔''

(مومن نمبر ''نگار'' پاکستان دسمبر ۱۹۶۴ء ص۔ ۲۴۱)

Md. Hanzala
Research Scholar
Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga

ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی

مظفر پور

ساغرِ ادب

پیئر ریویوڈ اردو جرنل

مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 1, Issue : 03
Oct. to Dec. 2019

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Dr. Syed Alay Zafar

Printed, Published and Owned by **Kahkashan Yasmin**,
Printed at : Indian Arts offset, Basement of State Bank of India, Mahendru
Ashok Raj Path, Patna : 800 006 (Bihar) & **Published From** Husaina House,
Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura, P.O. Ramna, Muzaffarpur - 842002 (Bihar)
Editor : Dr. Syed Alay Zafar
Mob. : 94300 84261

ترتیب

گوشۂ ریسرچ اسکالرس

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ISSN :2582 -3612

محمد حنظلہ

مومن خان مومنؔ: غزل کا واقعیت پسند شاعر

مومن خان مومنؔ اردو ادب میں ایک بلند و منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ مومنؔ نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ دور کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ مومنؔ کا دور عہد زریں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے معاصرین شعراء کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ جو کم و بیش غالبؔ، ذوقؔ، آزردہؔ، شیفتہؔ، صہباؔئی، غیشؔ، عارفؔ، درخشاںؔ، علائیؔ، سالکؔ، بیتابؔ، برقؔ، میرؔ، شورؔ، آزادؔ، تسکینؔ، تشنہؔ، خزیںؔ، شہرتؔ، عزیزؔ، تمکینؔ، جوشؔ، بسملؔ، جعفریؔ، بیدلؔ، شوقؔ، داغؔ اور حشمت وغیرہ ہیں۔ مومنؔ کا موازنہ، غالبؔ، ذوقؔ، میرؔ اور سعدیؔ و حافظؔ وغیرہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ مومنؔ کو غالبؔ اور شیفتہؔ جیسے شاعروں سے بھی داد و تحسین حاصل ہوئی ہے۔ اردو ادب میں ایک بڑی جماعت مومنؔ کی شاعرانہ برتری کا اعتراف کرتی رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مومنؔ سے پہلے کی شاعری ایک الگ راہ پر گامزن تھی۔ لیکن مومنؔ نے اپنی شاعری میں خالص عشق و محبت کے تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاکر ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اس نئی راہ کے وہ تنہا مسافر نظر آتے ہیں۔ مومنؔ کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں ان کا اعتراف غالبؔ، شیفتہؔ، حالیؔ اور آزادؔ کے علاوہ ناقد و محقق مولوی عبدالحئی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مولوی عبدالسلام، نیاز فتح پوری، وقار احمد رضوی، نظیر صدیقی، سید امتیاز احمد اور عبدالباری آسی وغیرہ لوگوں نے بھی مومنؔ کو انیسویں صدی کا کامیاب شاعر کہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان یوں رقمطراز ہیں :

> "مومن خان مومنؔ نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کے حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی .... مومنؔ نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں، حسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنائے اور استعارے کے بادشاہ ہیں۔ اردو زبان کے اعلیٰ اور دل نشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔"
>
> (اردو غزل مصنفہ : ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص۔ ۹۹)

مومنؔ اپنی غزل گوئی کی وجہ سے آج تک اردو ادب میں زندہ و تابندہ ہیں۔ ان کی شاعری پر بے تحاشا اعتراضات بھی ہوئے ہیں حتیٰ کہ انہیں چُما چاٹی والا شاعر کہہ کر بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے ان کی شاعری کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا اور دھیرے دھیرے ان کے مداحوں کی بھی ایک بڑی جماعت سامنے آگئی جنہوں نے ان کے کلام کی قدر و قیمت تعین کرنے میں عقیدت مندانہ رویہ اختیار کیا اور طرفداری بھی کی اور اس میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے کہہ دیا کہ انہوں نے "غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کردیا" جو درست معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر مجز سہسوانی کا یہ کہنا کہ مومن نے جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا، کچھ حد تک درست ہے۔ یا پھر نیاز فتح پوری کا یہ دعویٰ کرنا کہ مومن کو اپنے دیگر ہم عصروں میں جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ان کا رنگ تغزل ہے جو غیر معقولانہ چیز سے پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام بیانات کسی حد تک تمام ناقدین نے قبول کئے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں نے جو اس سلسلے میں مبالغہ آرائی کی ہے وہ بے دلیل اور لغوی باتیں ہیں۔ مومنؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ظہیر احمد نے جو خیالات رقم کئے ہیں وہ نہایت سنجیدہ اور مدلل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں :

> "مومنؔ کی غزل کے اجزائے ترکیبی میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز بیان ہیں۔ باقی تمام خصوصیات ان میں سے کسی نہ کسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ مومن نے غزل کو محض تغزل تک محدود رکھا ہے، تصوف اخلاق، فلسفہ اور زندگی کے دوسرے مسائل کو غزل کے قریب نہیں آنے دیا۔ دائرہ کا محدود رکھنا مومنؔ کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ کمزوری اس لئے کہ زندگی کا کینوس بہت وسیع ہے اور عشق اس کا صرف ایک شعبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی وسیع دنیا کے سامنے مومن کی دنیا بہت محدود نظر آتی ہے۔ قوت اس لئے کہ روح تغزل کے جو نمونے اور تجربے مومن کے کلام میں نظر آتے ہیں وہ دوسرے شعراء کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔"
>
> (مومن خان مومنؔ مصنفہ : ظہیر احمد صدیقی، ص۔ ۴۱۔۴۲)

مومن خان مومنؔ اپنے عہد کے ان چند شاعروں میں ہیں جنہیں اردو ادب میں اپنے انفرادو امتیاز سے اعلیٰ مقام عطا ہوا ہے۔ مومنؔ کی غزل گوئی میں صداقت ہے۔ آپ بیتی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو پہلی مرتبہ واقعیت پسندی کا سبق پڑھایا ہے۔ انہوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر زندگی کی سچائیوں،

عشق کے نادر تجربات و مشاہدات کو برجستہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے غزل کے محبوب کو نسوانی پیکر عطا کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں موصوف کا محبوب کوئی خیالی پیکر نہیں ہے بلکہ ہماری طرح گوشت پوست والا انسان ہے بلکہ عورت ہے۔ اس نئی روش کے وہ بانی کہے جاتے ہیں اور اس نئے رویے نے اردو غزل کو اپنے محدود دائرہ سے نکلنے کی راہ ہموار کی ہے۔ یہی خوبی مومن کو اپنے تمام معاصرین شاعروں میں انفرادی و امتیازی شناخت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مومن کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا نہیں جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہو گا کسی کا

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیران ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

اور مومن کا یہ شہرۂ آفاق شعر۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی اے غمزۂ غماز دیکھنا

مومن خان مومن نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں غزلیں کہیں ہیں چھوٹی بحروں میں وہ نسبتاً زیادہ دلسوز اشعار کہتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے ان کے کلام میں مکر شاعرانہ کی نشاندہی کی ہے۔ مومن کے کلام میں اس عنصر کی ہر جگہ نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن طوالت کا خوف پیش نظر ہے۔ نیاز فتح پوری کا یہ جملہ بھی بہت مشہور ہے کہ "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنا میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ "مجھے کلیات مومن دو اور باقی سب اٹھا لو" اس جملے سے نیاز فتح پوری تمام شاعروں میں مومن کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اعتراف و اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ مومن کی غزل گوئی میں انفرادیت و امتیاز کا اعتراف مشہور و معروف ناقد کلیم الدین احمد نے بھی کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد کا ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے تا کہ مومن کی غزل گوئی میں امتیازات کا یقین ہو جائے اور بحیثیت غزل گو ان کے مقام و مرتبہ پر مہر توثیق ثبت ہو جائے۔ کلیم الدین احمد کے اقتباس پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

> "مومن کے عشق کی نوعیت ان کے اشعار میں کھلی ہوئی ہے۔ مومن کسی پردہ نشیں کے عشق میں مبتلا تھے۔ وصل و ہجر کی کشمکش، امید و بیم کی تصویر کشی ہر جگہ ہے۔ ان کے جذبات صادق ہیں۔ وہ واردات قلبی کا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے بیان میں پاکیزگی اور شیرینی ہے۔ کہیں ابتذال کا پتہ نہیں.........ان شعروں میں تاثیر ہے۔ یہ سنتے ہی دماغ پر اثر اور دل میں گھر کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت ہے پھر طرز ادا دلکش ہے۔ حسین خیالات و جذبات کو حسین لفظوں اور ترکیبوں میں ادا کیا گیا ہے۔ جذبات تو وہی ہیں جو سارے اردو شعراء میں ملتے ہیں لیکن ان کا بیان یہاں مومن کے مخصوص انداز میں ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا حسن بڑھ جاتا ہے اور دلکش اسلوب کے ساتھ ہر شعر ترنم سے بھی معمور ہے۔"
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر، مرتبہ : کلیم الدین احمد، ص۔ ۱۴۳۔۱۴۴)

Md. Hanzala
Research Scholar
Urdu Dept Lalit Narayan Mithila University
Darbhanga

Al-Mansoor Educational & Welfare Trust (Darbhanga)

One Day Research Scholar National Seminar

اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں اردو کے مسائل اور ان کا حل

Certificate

This Is To Certify That Mr. M.D. HANZALAH Of. Research Schola, L.N.M.U University Participated/ presented A Research Paper Entitled School, College aur University Mein Urdu ke Masael aur Hal In The National Seminar Held On 03 November 2018 at seminar hall, Millat College, Darbhanga

A. M. Tarzi	Mansoor Khushter	Ahsan
(Prof. A.M.Tarzi)	(Dr. Mansoor Khushter)	(Dr. Ahsan Alam)
Program President	Secretary Program	Convenor

One day National Seminar

on

18th June-2019

EKISWEEN SADI MEIN URDU KI ADABI SARGARMIYAN

(SUBA BIHAR KE HAWALE SE)

اکیسویں صدی میں اردو کی ادبی سرگرمیاں

(صوبہ بہار کے حوالے سے)

ORGANIZED BY: BAZM-E-FAIZ

Dept. of Urdu, L.N.M.U. Darbhanga

This is to Certify that Dr./Mr./Ms. MD. HANZALAH (Research Scholar L.N. Mithila University Darbhanga)

Participated in the seminar on the topic Qadeem Darbhanga me Urdu Ghazal Ekisween Sadi men

we wish to place on record our deep sense of appreciation for contribution to deliberations in the Seminar

Dr. Md. Aftab Ashraf *Convenor, HoD Urdu* *M.L.S.M. College Darbhanga*	*Prof. Nabi Ahmad* *Chief Guest* *Ex- HoD Urdu* *J.P. University, Chhapra*	*Dr. S.M. Rizwanullah* *Chairman* *HoD, P.G. Dept. of Urdu* *L.N.M.U. Darbhanga*